

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈاٹجسٹ
کراچی

ڈاٹ

نیا سال مبارک

جنوری 2013



نیاسال مبارک

عمران قریشی

لگام

16

نفسیاتی لوگ دوسروں کی باتیں نہ مان کر
زندہ درگزر ہو جاتے ہیں۔ ایک حقیقی کہانی

اقصی رباب

خودی کا قاتل

53

چاہت غلوں اور توکل کی ایک دلچسپ من
مونی داستان اہل دل کے لئے سوغات

ایس حبیب خان

خونی جوکر

85

کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ایک دل گرفتہ حقیقت
جسے پڑھنے والے دنگ نہ جائیں گے

ایس امتیاز احمد

جنات کا مہمان

37

اچھی کہانیوں کے حلاش باز ذوق لوگوں کے
لئے بہت ہی اچھی اور دلچسپ کہانی

اے وحید

رولو کا

58

دوہا قومی پراسرار قوتوں کا مالک تھا اس کی حیرت انگیز
اور جلدی کرشمہ ساریاں آپ کو تنگ کر دیں گی

محمد وارث آصف

آسیبی معمر

93

خوف و ہراس پھیلائی جسم و جاں پر کچلی
طاری کرتی ناقابل فراموش دلخراش کہانی

ساجدہ راجہ

انجام

45

ایک حیر انگیز دل گداز بہت کرتی حقیقی
کہانی جسے پڑھنے والے عیش کرائیں گے

شائستہ سحر

بھینک سزا

81

حس و طبع کے متلاشی لوگ اکثر عبرت کا
نشان بن جاتے ہیں۔ ایک سبق آموز کہانی

صفدر شاہین

روح بیتی

100

دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی رات کے
پہلے داخل میں ختم لینے والی ایک خوفناک کہانی

فرید شہزاد

بدروح پیکر

125

نفسانی خواہشات کے طغیانہ لگ کیا واقعی نشان
عبرت بن جاتے ہیں شہوت کہانی میں موجود ہے

شہاب شح

تابوت

159

ایک نادریدہ قوت کی عبرتناک داستان، جسے
پڑھنے والے خوشی سے عیش کرائیں گے

اسرارہ نوشین

ڈر

189

ذہن پر سکنت اور اچھے میں ڈالنی ہوئی
ناقابل یقین حیر انگیز اور حیرت انگیز کہانی

ایم اے راحت

سنہری تابوت

130

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے
اچھے میں ڈالنی حیرت انگیز اور حیرت انگیز کہانی

نظارت نصر

نقشہ

169

کلام الہی بہت زیادہ پر تاثیر ہوتی ہے جس
کا حقیقی مشاہدہ اس کہانی میں موجود ہے

ایم الیاس

بلیک ٹائیگر

192

تجسس اور سسٹمز سے بھرپور واقعات جو
پڑھنے والوں کو دلچسپ حیرت میں ڈال دیں گے

محمد عثمان علی

مغرور

153

کیا یہ حقیقت ہے کہ بلیک ٹائیگر پر صرف خدا
کی ذات پہنچانی ہے۔ ایک سبق آموز کہانی

علی کاشف آفاقی

برندرامورتی

176

کالی دنیا کی ناقابل یقین خونی ڈرامائی، دل کو
بہت کرتی لرزیدہ لرزیدہ حیرت انگیز کہانی

ادارہ

قوس قزح

218

قارئین کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قارئین
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....

عامر ملک

ذرا سی بات

225

لفظ لفظ سطر سطر دماغ کو ماؤف کرتی اور لرزا
بر اندام کرتی انوکھی اور حقیقی کہانی.....

شہزادہ چاند زیب عباسی

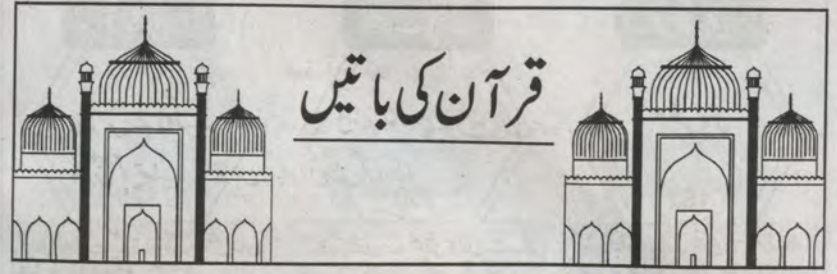
پہاڑی کے جن

232

خود غرضی کے لمبا دے میں لپٹی ہوئی ایک
انوکھی خواہش کا دردناک اور ہمایا تک انجام

خط و کتابت کپتہ: ماہنامہ ڈرڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیوار دو بازار کراچی: 32744391

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تاپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔



قرآن کی باتیں

☆ اے نبی کتنی ہی بستیاں ایسی گزر چکی ہیں، جو تمہاری اس بستی (یعنی مکہ) سے بہت زیادہ زور آور تھیں، جس نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا۔ (سورۃ فتح 48 آیت 13)

☆ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے کیا سلوک کیا اونچے ستونوں والے عباد اہم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟ اور شہود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟ اور خیموں اور میٹھوں والے فرعون کے ساتھ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ بے شک تمہارا رب تاک میں ہے۔ (سورۃ فجر 89 آیت 6 سے 14)

☆ اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کی نعمتوں کا کفران کرنے والی یعنی ناشکرا ہے۔ اگر تم اپنے پروردگار کی رحمت یعنی فراخ دستی کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہوان کی طرف توجہ نہ کر سکو تو ان سے نرمی سے بات کہہ دیا کرو اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سی بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کر لو کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں اور نہ بالکل کھول ہی دو کہ کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو کہ ملامت زدہ اور در ماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 26 سے 29)

☆ اور جب کوئی چیز ماپ کر دینے لگے تو پیانہ پورا بھرا کرو اور جب تول کر دو تو ترازو سیدھی رکھ کر تول کرو۔ یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 35)

☆ رات کی قسم جب (دن کو) چھپالے۔ اور دن کی قسم جب چمک اٹھے۔ اور اس (ذات) کی قسم جس نے نرا اور مادہ پیدا کئے۔ کہ تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔ (سورۃ لیل 92 آیت 1 سے 4)

☆ آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات (کی تاریکی) کی جب چھا جائے۔ (اے محمد) تمہارے رب نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ (سورۃ صٰحٰی 93 آیت 1 سے 3)

☆ انجیر کی قسم اور زیتون کی۔ اور طور سینین کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔ کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ (سورۃ تین 95 آیت 1 سے 4)

☆ ان سر پٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں پھر پتھروں پر نعل مار کر آگ نکالتے ہیں پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں۔ پھر اس میں گرد اٹھاتے ہیں پھر اس وقت (دشمن کی) فوج میں جا گھستے ہیں۔ کہ انسان اپنے رب کا احسان ناشناس (اور ناشکرا) ہے (سورۃ عادیات 100-1 سے 6)

☆ عصر کی قسم۔ کہ انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔ (سورۃ عصر 103 آیت 1 سے 3)

☆ اور اگر سفر پر ہو اور (دستاویز) لکھنے والا نڈل سکے تو کوئی چیز رہن باقبضہ رکھ کر قرض لے لو اور اگر کوئی کسی کو امین سمجھے یعنی رہن کے بغیر قرض دے دے تو امانت دار کو چاہئے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کر دے۔ اور اللہ سے جو اس کا رب ہے، ڈرے اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا جو اس کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 283)

☆ اور اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے۔ کہ اگر تم اس کے پاس (روپوں کا) ڈھیر امانت رکھ دو تو تم کو فوراً واپس دے دے اور کوئی اس طرح کا ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو تمہیں دے ہی نہیں، یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہ اللہ پر محض جھوٹ بولتے ہیں اور اس بات کو جانتے بھی ہیں۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 75)

☆ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے بیشک اللہ سنتا (اور) دیکھتا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 58)

☆ اے اہل ایمان! کفار کے مقابلے میں ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور مورچوں پر جتے رہو۔ اور اللہ سے ڈرو تا کہ مراد حاصل کرو۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 200)

☆ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔ یہی اہل جنت ہیں کہ ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔ (سورۃ احقاف 46 آیت 13 سے 14)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“، بشکریہ شیخ بک ایجنسی کراچی)

ایس حبیب خان کراچی سے، امید ہے کہ سب اللہ کے حکم سے خیریت سے ہوں گے، دسمبر 2012ء کا شمار گزری سال کو الوداع کہتے ہوئے اپنے اوراق میں قارئین کی دلچسپیوں کے تمام انداز سمونے ہوئے ملا۔ ٹائٹل کا کافی اچھا لگا۔ خطوط کی محفل میں تعریف و تنقید سے بھرپور خطوط پڑھے۔ کہانیوں میں افشاں رمضان کی ”حطوط“ لا جواب تحریر تھی، جس نے آخر تک اپنی گرفت میں جکڑے رکھا، ناصر محمود فرہادی ”سپارکٹ“ کا نسنی خیز تھی، احسان محری ”خواب“ بھی اچھی لگی، ”سادھی کا بھوت“ ایس امتیاز احمد کی ہمیشہ کی طرح شاندار تحریر تھی، ”محافظ“ بہت خوب صورت تحریر تھی، ”تاہوت کہانی“ میں تجسس آخری لائن تک برقرار تھا۔ ”موت کا راز“ معمول سے بہت کراٹھا انداز لئے بہترین تحریر تھی۔ کہانی کے علاوہ ڈراما نگشت اور اس کے پڑھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے ”نیا سال مبارک!“ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ارض اور اس کے رہنے والوں پر رحم کرے، اللہ تعالیٰ میرے ملک کو اندرونی و بیرونی دشمنوں سے بچائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، تمام راسخ اور ڈر کے پڑھنے والوں کی اللہ تعالیٰ ہر جائز حاجت پوری کرے اور ڈراما نگشت کو مزید کامیابیاں عطا کرے۔ (آمین)

☆ ایس صاحب: دل کی گہرائی اور قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف اور ڈر سے واسطہ تمام قارئین کے لئے دعائے کلمات کے لئے بہت شکر ہے، آپ کو بھی نیا عید یوم سال مبارک ہو، اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم، امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، اس ماہ دسمبر کا ڈراما نگشت، 23 نومبر کو ملا۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا، کہانیوں میں تینوں قسط و آخریوں نے زبردست مقابلہ کیا۔ میرا خط شامل اشاعت تھا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی اور اپنے کالج کی فرینڈز کو بھی دکھایا۔ کالج میں، میں نے ڈراما نگشت و ڈراما نگشت کو فرینڈز سے وعدہ لیا کہ وہ ضرور ڈراما نگشت کریں اور باقاعدگی سے ڈراما فرینڈز میں لگی۔ اس ماہ ڈراما نگشت طور پر زبردست تھا۔ اس خط کے سمر اپنی کہانی دیوئی بھیج رہی ہو۔ دن رات کی محنت کے لکھی ہے اور موضوع کے لحاظ سے ڈراما نگشت موضوع چنا ہے۔ پلیز اگر کہانی معیاری اور اچھی لگے تو ضرور قریبی شمارے میں جگہ دے کر منظر فرمائیے گا۔

☆ بلقیس صاحبہ: قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف خط لکھنے کے ساتھ ہی کہانی بھیجے کے لئے دیری دیری شکریں۔ کہانی ابھی پریمی نہیں، اچھی ہوئی تو آئندہ شمارے میں شامل اشاعت ہوگی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی تجویز میرا خط ارسال کر کے شکر کا موقع دیں گی۔

فائزہ رحمن سالار انک سے، السلام علیکم، کافی عرصہ سے ہم ڈراما نگشت کے قارئین میں سے ہیں، لیکن کچھ لکھنے کی جرات پہلی بار کی ہے، میں بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں، اگر آپ نے حوصلہ افزائی کی تو آئندہ بھی لکھتی رہوں گی۔ اکتوبر کے شمارے میں چھپنے والی کہانی ”بھول بھلیاں“ ایک اچھی تحریر تھی اس کہانی میں راسخ کی محنت نظر آ رہی تھی، رولو کا دن و آج جاری ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ڈراما نگشت دن دینی رات آٹھ گئی ترقی کرے۔ ہماری طرف سے ڈراما نگشت افشاں اور تمام قارئین کو سلام۔

☆ فائزہ صاحبہ: ڈراما نگشت میں موٹ و دیکھ، چلنے حوصلہ افزائی ہوگی اور قوی امید ہے کہ آپ حسب وعدہ آئندہ بھی خط میں اپنی رائے کا اظہار برائے ڈراما نگشت کرتی رہیں گی۔

شگفتہ حسین کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں کہ ڈراما نگشت افشاں بخیر و عافیت ہوگا اور ڈراما نگشت کے سارے پڑھنے والے اور لکھنے والے اچھی خیریت سے ہوں گے دسمبر کا ٹائٹل دیکھ کر ڈراما نگشت کا توفیق کا توفیق کہنا، لا جواب بے مثال، ارے ہاں..... ایک بات تو میں بھول بی گئی۔ تمام لوگوں کو نیا سال بہت مبارک ہو۔ اور اللہ سے دعا ہے کہ یہ نیا سال ہمارے ملک اور ہمارے لئے بہت سی خوشیاں لے کر آئے اور آخر میں ڈراما نگشت کے لئے دھڑلے دعا کریں۔ اللہ حافظ۔

☆ شگفتہ صاحبہ: آپ کو بھی نیا عید یوم سال مبارک ہو، خلوص بھر خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

کائنات بلوچ کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں کہ ڈراما نگشت افشاں خیریت سے ہوگا، سب سے پہلو تو میری طرف سے ڈراما نگشت افشاں، راسخ اور تمام پڑھنے والوں کو Happy New Year اس ماہ کا ٹائٹل پہلے کی نسبت اچھا تھا۔ سب سے پہلے

قرآنی باتیں پڑھیں جنہیں پڑھ کر دل کو سکون ملا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اندازہ ہوا اور خطوط میں اسارہ نوٹیں کا خط پڑھا جس میں سب کے لئے دعائیں تھیں بہت خوشی ہوئی کہ آج بھی اسارہ نوٹیں جیسے لوگوں کو دوسروں کو خوش دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلو تو میں نے اپنی پسندیدہ کہانی ”سنہری تاہوت“ پر بھی جو کہ اچھی لگی۔ بقیہ کہانیوں میں مجھے افسانہ رباب کی ”موت کے رنگ“ اور صبار رمضان کی ”محافظ“ بہت بہت پسند آئیں، میں افسانہ رباب اور صبار رمضان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں میں نے انہیں دیکھا تو انہیں ہے پر مجھے ان سے ایک اچھی طرح کا لگاؤ ہو گیا ہے۔ اب باتیں بہت ہو گئیں۔ اگلے ماہ ملاقات ہوگی آخر میں سب کے لئے دھڑلے دعا کریں۔ اللہ حافظ۔

☆ کائنات صاحبہ: آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو، اچھے دل کے مالک لوگ ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھتے ہیں اور دوسروں کی خیر خواہی میں رہتے ہیں۔ لکھنے اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی خط ارسال کریں گی اس کے لئے شکر یہ قبول کیجئے۔

عائشہ ارما پشاور سے، السلام علیکم، دسمبر کا ڈراما نگشت 20 تاریخ کو سکال سے خرید، دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کہانیوں میں سنہری تاہوت اور بلیک ٹانگہ ہمیشہ کی طرح ٹھیک لگیں۔ رولو کا بھی اچھی تھی۔ ”محافظ“ صبار رمضان کی واقعی سوچنے پر مجبور کرنے والی تھی۔ ”خونی روح“ شہزادہ چاند زیب کی بہت زبردست تھی۔ مجھے زبانی جیسی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ سادہ راجا، افشاں رمضان، افسانہ رباب، شربیل تصور کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ناصر محمود فرہادی، عصمت پروین، عامر ملک، صفدر شاہین، ایس امتیاز احمد، عبدالحمید ساگر، راجندر سنگھ بیدی، احسان محری اور عدنان علی کی بھی بہت پسند آئیں۔ تمام کہانیوں کو پڑھ کر بہت حیرت آئی۔ ایک طویل عرصہ سے میں بار کہانیوں کی تلاش میں تھی اور مجھے وہ ڈراما نگشت میں مل گئیں۔ ”ہار“ میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے اور حوصلہ افزائی کی امید بھی ہے۔ خیر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈراما نگشت کو دن دینی اور رات آٹھ گئی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

☆ عائشہ صاحبہ: ڈراما نگشت میں خوش آمدید، قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی پابندی سے خط لکھنے کے لئے دھڑلے شکر یہ قبول کیجئے، آپ کی بہن کا بھی شکریہ کہ انہیں بھی ڈراما نگشت پسنائی ہے۔ Thanks۔

زاهدہ عطا محمد کراچی سے، امید کرتی ہوں کہ ڈراما نگشت افشاں بخیر و عافیت سے ہوگا۔ میری طرف سے تمام قارئین کو نیا سال بہت مبارک ہوں۔ اللہ تعالیٰ افشاں سیت تمام ڈراما نگشت والوں کو خوش و خرم رکھے۔ اس ماہ کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ قسط وار کہانیوں میں سب سے پہلے ”سنہری تاہوت“ پر بھی اس مرتبہ کی قسط کچھ خاص نہیں تھی اور بقیہ کہانیوں میں جو مجھے پسند آئیں رولو کا، موت کے رنگ، خونی روح، حطوط، ہولناک رات، محافظ، لا حاصل تنہا اور خواب بہت ہی زبردست کہانیاں تھیں اور میں نے بھی ایک غزل لکھی جو بھیج رہی ہوں اگر اشاعت کے قابل ہوئی تو اسے تھوڑی سی جگہ دے دیتا۔ آخر میں ڈراما نگشت کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ زاهدہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکر ہے، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ آپ کو اور آپ کے تمام قلبی رشتوں کو بھی نیا سال مبارک ہو۔

فاریہ تبسم ٹھیک موزون تصور سے، ڈراما نگشت تمام قارئین کو میری طرف سے بہت بہت سلام اور نئے سال 2013ء کی بے شمار خوشیاں مبارک ہو، دسمبر کا شمارے ملا و راسخ شاندار اور زبردست تھا۔ قرآن کی باتیں ایمان افروز تھیں۔ خطوط میں اسارہ نوٹیں کا بہت بہت شکر ہے یاد رکھئے، اس کے بعد دیگر دوستوں کے خط پڑھے نئے دوستوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ غلام نبی نوری، بلقیس خان، کائنات بلوچ، سادہ راجا، زاهدہ عطا محمد، آستہ صاحبہ اور اسلم جاوید کا خط دیکھ کر اچھا لگا۔ اپنی دوستوں افشاں رمضان، افسانہ رباب اور انوری رمضان کا خط دیکھ کر دکھ ہوا، پلیز کم بیک آؤ، کہانیاں تمام ہی زبردست تھیں۔

☆ فاریہ صاحبہ: تحریر پر الگ الگ کاغذ پر ارسال کیا کریں، اس وجہ سے آپ کی غزل شائع ہونے سے روک دی گئی، امید ہے آئندہ خیال رکھیں گی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خط بھیج کر شکر یہ کا موقع ضرور دیں گی۔

صدف حسین کراچی سے، امید کرتی ہوں کہ ڈراما نگشت افشاں خیریت سے ہوگا۔ ایک ماہ کی غیر حاضری کے لئے V.sorry اس کی وجہ یہ رہی کہ ڈراما نگشت لیٹ ملا، جلدی پڑھ نہ سکی، کہانیوں پر تبصرہ بھی رہ گیا۔ اسی لئے خط بھی نہ لکھ سکی، اس ماہ کا ٹائٹل بہت Attractive تھا، پورے اشغال پر نظر صرف ڈراما نگشت پر ہی آکر ٹھہر گئیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ”خونی روح“ بہت زبردست تھی، راسخ کو میری طرف سے مبارکباد، سادھی کا بھوت، محافظ، موت کا راز، تاہوت کہانی، احسان فراموش، یہ کہانیاں مجھے

اچھی لکھیں، اشعار کی محفل میں غلام نبی نوری، محمود الحسن، پروفیسر واجد گیلانی، احسان رحمدل شرف الدین کی شاعری مجھے اچھی لگی۔ آخر میں ڈر کے لئے ڈھیروں دعائیں۔

☆ صدف صاحبہ: سوری کے ابداع امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ سے پابندی وقت کا ضرور خیال رکھیں گی، اور دلی تجزیہ کے ساتھ خط لکھنا بھولیں گی نہیں۔

محسن علی: جٹ ساہیوال سے، امید کرتا ہوں ڈرڈا بجٹ کا پورا اسٹاف باخیریت ہوگا۔ ڈرڈا بجٹ میں اس ماہ اپنا خط دیکھ کر بہت خوش ہوئی، سب کو دکھایا، دل کر رہا تھا کہ تمام رسالہ اس ماہ کا خود ہی خرید لوں، لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ اس لئے چند رسالے خرید لئے اور اپنے دوستوں کو دینے تاکہ پڑھیں، میں نے آپ سے ایک سوال کیا تھا کہ اگر میں اپنی کہانی ارسال کروں تو کیا اس کو آپ شامل اشاعت کریں گے یا نہیں مگر آپ نے جواب نہیں دیا۔ پہلے کوئی بات نہیں مگر میں ایک کہانی جو میری خود نوشت ہے ارسال کر رہا ہوں، اس کی اصلاح آپ کے ذمے دراصل میرا امتحان 23 فروری کو ہے۔ کامیابی کی دعا کے لئے درخواست ہے۔ کسی بھی رسالے میں میری پہلی کہانی اور پہلا خط ہے، امید ہے شائع کر کے حوصلہ افزائی کریں گے۔ اب بات کرتے ہیں ماہ دسمبر 2012ء کے شمارے کی تو سب سے بیٹے رولو کا، سیکڑ موت کا راز، تھر ڈیٹھافقی باقی رسالہ بھی اچھا تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ڈرکون رات چوٹی ترقی عطا فرمائے اور اس طرح ہمیشہ شاد باد رہے۔

☆ محسن صاحب: ڈرڈا بجٹ میں خوش آمدید، آپ اپنی کہانی بعد شوق ارسال کریں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ آئندہ ماہ بھی خط کا انتظار ہے گا۔

راجہ باسط مظہر: حامد تھٹکی سے، السلام علیکم، امید کرتا ہوں ہر بار کی طرح اس بار بھی ڈرکا پورا اسٹاف خیر وعافیت سے ہوگا۔ پچھلے ماہ نومبر کا شمارہ کچھ مصروفیات میں اضافے کی وجہ سے نہ پڑھ سکا۔ اور پھر میرے فائنل امتحانات شروع ہو گئے جو کہ ماہ دسمبر کی 5 تاریخ کو ختم ہوئے جن کی وجہ سے میں اپنا پندرہ شمارہ ڈرڈا بجٹ پڑھنے سے محروم ہو گیا۔ اس بار وقت کی کمی کی وجہ سے ایک عدد کہانی شعر، غزل، پیچیز رہا ہوں، امید کرتا ہوں شائع کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے اور آخر میں ڈرکی پوری ٹیم کو ڈھیروں دعائیں۔

☆ باسط صاحب: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیابی عطا کرے اور خوشیوں سے نوازے، کہانی اچھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ آئندہ ماہ بھی خط کا انتظار ہے گا۔

ایس امتیاز احمد: کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، ماہ دسمبر 2012ء کا شمارہ سامنے ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لا جواب رہا۔ آرٹیکل لگانے کا شکریہ۔ آپ کے پاس مزید تحریریں موجود ہیں۔ ”پلیز ترقی اشاعت میں جگہ دیں آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ”ڈرڈا بجٹ“ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دوپورہ کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆ امتیاز صاحب: کہانی شامل اشاعت ہے، آپ کی دیگر تحریریں بھی موصول ہو چکی ہیں جو کہ آئندہ شمارے میں جلوہ گر ہوں گی، خلوص نامہ کاشت سے انتظار ہے۔

سید عبادت علی: ذریہ اسماعیل خان سے، پہلی مرتبہ ڈرڈا بجٹ کی محفل میں شریک محفل ہوں، امید ہے کہ آپ ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ 2012ء کے شروع میں ڈرکا مطالعہ شروع کیا اور بہت اچھا لگا۔ ”سنہری تابوت“ نے دل موہ لیا باقی تمام کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں، خواب، موت کے رنگ، گمشدہ مسافر، خون آشام بھی بہترین کہانیاں تھیں، پہلے بھی آپ کو ایک خط ارسال کیا لیکن شائع نہیں کیا اور کیا میں بھی کہانیاں لکھ سکتا ہوں۔ مجھے شاعری سے بہت لگاؤ ہے کیا میں اپنی شاعری ارسال کر سکتا ہوں۔

☆ عبادت صاحب: ڈرڈا بجٹ میں خوش آمدید، اس سے پہلے آپ کا خط موصول نہیں ہوا، آپ اپنی کہانی اور شاعری بعد شوق ارسال کر سکتے ہیں۔ امید ہے آئندہ ماہ آپ اپنی تحریریں ضرور بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

محمد وارث آصف: وال بھڑال سے، السلام علیکم! ڈرڈا بجٹ سے میرا لگاؤ 2008ء سے ہے۔ میری پہلی کہانی اگست 2011ء میں پراسرار دیوتا کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے لکھنے کا بہت کم ٹائم ملا۔ مگر پھر بھی ٹائم نکال کر اب میں دوبارہ آپ کی خدمت میں دو عدد کہانیاں بنام ”عشق زادے اور اسبی معرہ“ کے نام سے لے کر حاضر ہوں۔ مذکورہ کہانیاں میری کافی محنت کا

شر ہیں، امید ہے کہ جلد از جلد شائع کر کے شکریہ کا موقع دوبارہ بھی عنایت کریں گے۔ کہانیوں میں شاید کئی غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ اب ان غلطیوں کی اصلاح کرنا ادارے کا قن بننا ہے۔ امید ہے کہ ادارہ نوازش کرے گا۔ امید ہے کہ آپ لوگ ویلکم کریں گے۔ مزید ادارے کی ترقی کے لئے دن رات دعا گو ہوں۔

☆ وارث صاحب: ڈرڈا بجٹ میں خوش آمدید، کہانی شامل اشاعت ہے، خوش ہو جائیے، اب قوی امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی وقت نکال کر ڈرڈا بجٹ میں اپنی تحریریں ضرور ارسال کرتے رہیں گے۔ شکریہ۔

عثمان غنی: پشاور سے، السلام علیکم، ڈرڈا بجٹ نومبر کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا، ٹائٹل بہت شاندار تھا۔ اس ماہ رولو کا اچھی رہی۔ بلیک ٹانگیر زبردست انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ سنہری تابوت، زبردست موڑ پر آگئی ہے۔ خونی روح، شہزادہ چاند زیب کی کہانی نے ابتدائی صفحات کی کہانی کا قن ادا کر دیا۔ سپر مارکیٹ، ناصر محمود فرہادی کہانی بہت خوب صورت رہی۔ لا حاصل تنہا، ساجدہ راجا زبردست سادگی کا بھوت، ایس امتیاز احمد کی اسٹوری بہت انٹرٹیننگ تھی، ہولناک رات کی کہانی اچھی اور معیاری رہی۔ تابوت کہانی، عامر ملک کی خوب صورتی سے لکھی ہوئی کہانی تھی۔ احسان فراموش، بس گزارے لائق تھی۔ موت کا راز کی سمجھ نہیں آئی، حوطہ افشار رمضان کی مصرعے کا تاریخی کہانی متاثر کن رہی۔ خواب احسان محرز زبردست، یہ بھی مصرعے کی زبردست کہانی تھی۔ حافظ صبا رمضان کی کہانی نے واقعی اللہ تعالیٰ کی یاد دلا دی۔ عبرت انگیز عدنان علی کی کہانی اثر عبرت رہی۔ گمشدہ مسافر میر و فخر کے لحاظ سے زبردست اور خوب صورت کہانی تھی، دبیر کا شمارہ ہر لحاظ سے زبردست، فضا سلک اور خوب صورت تھا۔

☆ عثمان صاحب: لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، امید ہے آپ کی کہانی اگلے ماہ شائع ہو، اور قوی امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خط ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

قدیر انا: راولپنڈی سے، دبیر کا ڈرڈا بجٹ دیکھ کر خوشی ہوئی، تمام تحریریں زبردست ہیں، ایک عدد غزل ارسال ہے۔ اگر معیاری ہو تو اگلی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں۔ ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ قدیر صاحب: خط کے ساتھ غزل بھیجے گا شکریہ، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کاشت سے انتظار ہے گا۔

احسان سحر: میانوالی سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں ڈرکا تمام اسٹاف اور اس کے چاہنے والے خیریت سے ہوں گے۔ سال کا آخری تھوڑے جلد ہی مل گیا ٹائٹل اچھا لگا، سب سے پہلے بات کی جائے قرآن مجید کی باتیں پہلے ہی پڑھتا ہوں اور سن کر روشن کرتا ہوں پھر خطوط میں گئے سب اچھے لگے۔ اشارت میں سب سے پہلے ڈرڈا اور ڈر کے تمام ممبرز کو نئے سال کی مبارکباد..... پہلی اسٹوری کا آغاز ہوا خونی روح اچھی تحریر تھی پلاٹ بھی اچھا اور لفظوں کا چناؤ بھی مناسب تھا..... لا حاصل تنہا اچھی لگی۔ رولو کا اور روشنی کا اختتام اور غنی ڈگر پر گامزن ویلڈن، ہولناک رات، موت کا راز، گزارہ رہی، ایس امتیاز احمد صاحب آپ کا پی متاثر کرتے ہیں ہر ماہ اس ماہ بھی آپ بیٹھ رہے۔ حوطہ مصر کے حوالے سے اچھی کاوش تھی۔ سنہری تابوت میں راحت صاحب واقعات کو صحیح طرح واضح نہیں کر رہے۔ حافظ اس ماہ کی بیٹ تحریر رہی دوسروں کی مدد کا درس دیتی ہے چاہے وہ خیر ہو یا فقیر لگڈ..... بلیک ٹانگیر کو ایسے ہی ربو کی طرح کیچنے جا رہے ہیں اور اپنے ڈر کے ہٹ چکی ہے۔

☆ احسان صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانیوں پر تبصرہ کے لئے شکریہ اور آپ کی ہار کہانی کاشت سے انتظار ہے، امید ہے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

منیر احمد: ساخو میاں چنوں سے، امید ہے کہ سارا اسٹاف خیریت سے ہوگا، اس ماہ کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل پہلے کی طرح لا جواب ہے۔ قرآن کی باتیں بھی بہت اچھی تھیں۔ تاریخی کہانی نہ دیکھ کر افسوس ہوا۔ امید ہے کہ آپ ہماری دلی تسکین کے لئے ضرور سوچیں گے۔ بقیہ کہانیاں پہلے کی طرح بیٹھ ہیں۔ رولو کا حسب توقع نمبروں۔ ٹانگیر کی نئی قسط کاشت سے انتظار ہے۔ خطوط کی محفل میں غیر حاضری ہوئی۔ جس کے لئے معذرت۔ آئندہ کوشش ہوگی کہ وقت سے پہلے خطوط کی محفل میں حاضری دے دیا کروں اور لازماً توس و قترح میں سب دوستوں کی شاعری اچھی تھی۔ جن کے کلام زیادہ پسند آئے۔ حکیم خان حکیم، ایس امتیاز احمد، سنیل ماین مل، نوری رمضان اور انتخاب میں راجہ باسط مظہر، فاریہ تبسم کے کلام اچھے تھے، جن دوستوں نے یاد رکھا اور میر کی شاعری پسند کی ان کا بے حد شکریہ، آصف شہزاد الد آبادی، بشیر احمد پرویز جنڈا نوالہ، ظفر اقبال کا بھی مشکور جو ہر بار مجھے یاد رکھتے ہیں۔ جن

دوستوں نے یاد نہیں کیا ان کا بھی شکریہ۔ میری نئی شاعری حاضر ہے۔ امید ہے کہ شائع کر کے شکر یہ کا موقع دیں گے۔ اگلے شمارے میں پھر ملاقات ہوگی۔

☆☆ منیر صاحب: ڈرڈا انجسٹ کو یاد کرنے پر شکریہ، امید ہے اب حسب وعدہ ہر ماہ ضرور خطوط کی محفل میں شامل ہوتے رہیں گے۔ اس کے لئے شکریہ۔

محمد مشتاق ساغر: نکاح صاحب سے، السلام علیکم، سلام الفت کے بعد ہم تو خیریت سے ہیں اور آپ کی خیریت کے متنبی ہیں اور ہم دعا گو ہیں کہ ڈر کے تمام اسٹاف اور قارئین کرام خیریت سے ہوں گے، ہماری طرف سے تمام اہل دل بہن بھائیوں کو دلی سلام قبول ہو اور پورے ڈر کے اسٹاف کو بھتیجی بھرا سلام قبول ہو، بڑی لمبی غیر حاضری کے بعد ڈر کے خطوط کی محفل میں حاضر خدمت ہوں ہمارا رابطہ صرف خطوط سے نہیں تھا ویسے تو ڈر ہماری جان ہے، 2000ء سے لے کر اب تک کوئی ایسا شمارہ نہیں جوس کیا ہو ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو کامیابی عطا فرمائے۔ ہر سال کی طرح اس نئے سال کو یکم جنوری 2013ء کو مجھے ذیل خوشی ملے گی کیونکہ میری اور میری بیٹی کی سالگرہ ایک ہی دن ہے۔ یہ دن اب میرے لئے خوشیوں سے بھرا ہوتا ہے جس طرح ہم لوگ خوش ہیں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان پاکستانی کو خوشی عطا کرے اور ہمارے ملک پاکستان میں آرام و سکون عطا فرمائے۔ میری تمام مسلمان بہن بھائیوں سے اپیل ہے کہ اگر پاکستان ہے تو ہم ہیں اگر ہم زندہ ہیں تو پاکستان زندہ ہے پاکستان ہماری آن ہے، پاکستان ہماری شان ہے، اب شمارے پر ایک نظر دیکر 2012ء کا تازہ شمارہ ملا، پڑھا بڑی خوشی ہوئی، ٹائٹل بڑا جان دار لگا، تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ ہماری دعا ہے تمام راسٹر حضرات اور قارئین کرام اسی طرح ڈر کے لئے محنت کرتے رہیں جس طرح ہر آدمی اپنے گھر کو جاتا ہے۔

☆☆ مشتاق صاحب: ڈرڈا انجسٹ میں ایک مرتبہ پھر خوش آمدید، امید ہے آپ آئندہ ڈر سے غیر حاضر نہیں رہیں گے اور ہر ماہ خط ارسال کر کے شکر یہ کا موقع ضرور دیں گے۔

محمد علی چغتائی: بہادر پور سے، السلام علیکم ڈرڈا انجسٹ میں یہ میرا پہلا خط ہے اور ڈر بھی لگ رہا ہے کہ پتہ نہیں جگہ ملے گی بھی یا نہیں۔ میں فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں اور بچپن ہی سے ہار اسٹور بڑا کا شوق ہوں، پہلے میں اپنا شوق عام ایسٹوری بکس پڑھ کر پورا کیا کرتا تھا۔ مگر ایک دن جب میں اکیڈمی سے واپسی پر بکسٹال پر ہار کہانی خریدنے کے لئے گیا تو ڈرڈا انجسٹ کے شمارے پر نظر پڑی تو سرورق دیکھتے ہی خرید لیا اور ایک ہی دن میں پورے کا پورا پڑھ لیا۔ بہت زبردست اسٹوری تھیں۔ مارچ سے لے کر اب تک خط لکھ رہا ہوں مگر پوسٹ نہ کر سکا کہ شاید میرا خط شائع نہ ہو لیکن اب رہا نہیں گیا اور لکھ دیا کمال ہمت سے پوسٹ بھی کر دیا میں بیروڈی بھی کرتا ہوں اور انشاء اللہ اپنے خط میں اگلی دفعہ کسی غزل کی بیروڈی بھی بھجوا دوں گا بشرطیکہ میرا یہ خط شائع ہوا تب دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو اور اس کے تمام اسٹاف کو خیریت سے رکھے اور ترقی دے۔ آمین۔

☆☆ محمد علی صاحب: ڈرڈا انجسٹ میں ویکم۔ آپ اپنی تحریر جلد از جلد ارسال کر دیں۔ آپ کی مہربانی اب آپ کو ڈرڈا انجسٹ اچھا لگتا ہے، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

محمد رضوان قیوم: راولپنڈی سے، میں خیریت سے ہوں، امید کرتا ہوں کہ ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا، دیگر احوال یہ ہے کہ جیسا کہ آپ سے ٹیلی فون پر میں نے اپنے لکھے نئے ناولت سدردہ کا ذکر کیا تھا۔ لیکن آپ کی خدمت میں آج ارسال کر رہا ہوں، یہ بڑا دلچسپ مافوق الفطرت موڈ کی اچھی نئی طویل کہانی ہے۔ اسے میں نے 3 ماہ میں بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ اسے قارئین لازماً پسند کریں گے۔ یہ ایک نئی آپ جتنی پڑھیں طویل کہانی ہے۔

☆☆ رضوان صاحب: ناول بھیجے گا شکریہ، آپ کی چھوٹی کہانی آئندہ ماہ ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ امید ہے ناول بھی اچھا ہی ہوگا۔ آئندہ ماہ تیسرے کا انتظار رہے گا۔

بشیر احمد بھٹی: فوجی پستی بہادر پور سے، دسمبر 2012ء سال کا آخری شمارہ خریدا، بہت اچھا لگا، اب تو ڈر صرف باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی خوب گھر گیا ہے۔ خطوط کے آخر میں آپ نے ایک مختصر اشتہار میں لکھا ہے کہ کہانی بھیجئے والے اپنا موبائل فون نمبر ضرور ارسال کریں تاکہ ان سے رابطہ رہے۔ یعنی کہانی کی اشاعت یا ناقابل اشاعت کی اطلاع فوری دے دی جائے یہ ایک اچھی بات ہے۔ اس طرح کہانی کے مصنف کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی کہانی آنے والے شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ آپ سے یہ معلوم

کرتا ہے کہ اگر کسی مصنف کے پاس اپنا موبائل فون نہ ہو تو کیا وہ اپنے کسی دوست کا نمبر کہانی کے مسودے کے ہمراہ ارسال کر سکتا ہے۔ دوست کے توسط سے اسے اطلاع مل سکتی ہے۔ رولو کا اب کتابی صورت میں چھپ چکی ہے۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے۔ جن قارئین نے سابقہ قسطیں نہیں پڑھیں وہ پڑھ سکتے ہیں۔ ایک عدولطفہ پیش خدمت ہے۔ اسے نئے سال کے پہلے شمارے میں شائع کر دیں۔ نیا سال آپ کو اور تمام اہل وطن کو مبارک ہو۔ خدا حافظ۔

☆☆ بشیر صاحب: آپ اور آپ کے تمام قلمی رشتوں کو نیا سال مبارک ہو، اگر کسی کے پاس موبائل نہ ہو تو وہ کسی کا بھی نمبر دے سکتا ہے، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

غلام نبی فوری: کھڈیاں خاص سے، السلام علیکم، امید ہے کہ ڈر کے تمام قارئین، راسٹر اور اسٹاف بخیریت ہوں گے، دسمبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق شاندار تھا۔ اس کے بعد قرآن کی باتیں پڑھیں دل کو خوش ہوئی، اسارہ نوٹیں آپ کا تیسرا بہت اچھا تھا آپ کے لئے بھی بہت سی دعائیں، سفیان ساغر ویکم، ملک ساجد بشیر اور یقیس خان آپ کو بھی ڈر کی فیملی میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ڈاکٹر واجد گینگوی کو سلام، دیگر نئے دوستوں کی آمد پر بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں، تمام دوستوں اور دیگر اسٹاف کو نئے سال کی بے شمار خوشیاں مبارک ہوں، کہانیوں میں رولو کا قسط نمبر 91، بیسٹ آف دسمبر ہی، اس کے بعد سنہری تابوت ٹھیک تھی، بلیک ٹانگہ ایک لا جواب کہانی ہے۔ دوسری کہانیوں میں حوطہ، ہولناک رات، خون آشام، موت کے رنگ، محافظہ، عبرت انگیز، خواب، موت کا راز، لا حاصل تمنا اور تابوت کہانی زبردست تھیں۔ سب کی غزلیں بھی ٹھیک تھیں۔

☆☆ غلام نبی صاحب: قلمی لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ، امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجتا بھولیں گے نہیں۔

محمد اسلم جاوید فیصل: آباد سے، ماہ دسمبر 2012ء کا تازہ ڈرڈا انجسٹ جس کا مطالعہ کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی ایسا دلنشین پڑ چکا ہے پڑی مبارکباد قبول کریں یہ ایک معیاری پرچہ ہے جس کا ہمیں بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے جو کہ قارئین میں بے حد مقبول ہے سرورق بہت ہی خوب صورت تھا خطوط میں یاد آوری کا شکریہ، غزلیں شائع کرنے پر میں بے حد ممکن ہوں آپ جس غلوں اور محبت سے مجھے یاد فرماتے ہیں میں آپ کا بے حد مشکور ہوں، امید کرتا ہوں کہ نئے والے نئے سال میں آپ کا اور میرا تعلق پہلے سے زیادہ ہوگا۔ بشرط آپ کا میرے ساتھ تعاون رہے۔ ماہ دسمبر کی ہر تحریر لا جواب تھی جس سے میں بے حد متاثر ہوا، غزلیں بھی بہت خوب تھیں، آئندہ شمارہ ماہ جنوری 2013ء کا ہوگا جس کا ہمیں بڑی بے تابی سے انتظار ہے۔ اس جاتے ہوئے سال میں ہم نے کیا کیا کچھ بھی نہیں ہر لحاظ سے یہ ایک بہترین سال تھا۔ ہر نظر پریشان ہر دل اداس تھا۔ آنے والا سال 2013ء امید ہے کہ بہتر ثابت ہوگا۔ آخر میں شب و روز دعا گو ہوں ڈرڈا انجسٹ کی ترقی کے لئے۔

☆☆ اسلم صاحب: خط لکھنے اور قلمی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف اور اہل وطن کے لئے دل میں نرم گوشہ کے لئے شکریہ، اللہ آپ کی زبان قبول کرے اور 2013ء ہم لوگوں کے لئے خوشیوں کا سال ثابت ہو۔

ربحان خان: میرانشاہ سے، ڈرڈا انجسٹ سے منسلک تمام قارئین اور اسٹاف کو میرا سلام۔ میں ایک سینئر راسٹر ہوں، میں خوفناک ڈرڈا کی سلسلے دار کہانیاں لکھتا ہوں۔ میری بہت سی کہانیاں کئی ڈرڈا انجسٹوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے ہمیشہ سے ایک ایسے ڈرڈا انجسٹ کی تلاش تھی۔ جو کسی کی بھی محنت کو ضائع نہ کرے اور میری یہ تلاش ڈرڈا انجسٹ پر ختم ہوئی، اس لئے میں ڈرڈا انجسٹ کے ایڈیٹر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر یہ خط آپ تک پہنچ جائے تو میرا یہ خط ضرور شائع کریں تاکہ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ میرا خط ڈرڈا انجسٹ میں پہنچ چکا ہے، تو اس کے بعد میں اپنی کہانی آپ کو ارسال کر دوں گا، پہلے میں خط اس لئے بھیج رہا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ میری محنت ضائع ہو جائے اور کہانی آپ تک پہنچ نہ پائے، مگر جیسے ہی میرا خط شائع ہوگا۔ مجھے پتہ چل جائے گا کہ میرا خط آپ تک پہنچ چکا ہے۔ تو میں اپنی کہانی بھی روانہ کر دوں گا۔

☆☆ ربیان صاحب: ڈرڈا انجسٹ میں موصوت ویکم، چلے آپ کا خط ہم تک پہنچا اور شائع بھی ہو گیا، آپ پہلے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں اس کے بعد جھڑپ وار کہانی کے لئے قلم اٹھائے گا۔ امید ہے آپ اس بات پر غور فرمائیں گے۔

☆☆☆

نوجوان کو اپنے دماغ میں غصے کی شدت سے آتش فشاں پھٹتا ہوا محسوس ہوا کہ ایک معمولی روح نے اسے ایک بے وقوف بچے کی طرح اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا تھا، اور پھر ایک دلخراش منظر رونما ہوا۔

نفسیاتی لوگ دوسروں کی باتیں نہ مان کر زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ ایک حقیقی کہانی

ہیرو کا نام حیدر عالم..... جسے عرف عام میں اس کے ساتھی جونی کے نام سے پکارتے تھے۔ فلموں کے بہت سے ہیرو سے خوب صورت اور دلنوں سے زیادہ سفاک اور عیاش فطرت تھا۔ لیکن سوچنا سمجھنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ صرف عمل کرنا جانتا تھا۔ سوچنے کا کام ہیروئن یعنی سونیا کے سپرد تھا۔ سونیا حسین و جمیل لاکھوں ہیروئنوں سے خوب صورت اور چالاک و عیار ہونے کے علاوہ مفاد پرست بھی تھی۔ جونی اور سونیا، ہاشم صاحب کی بہت بڑی پرزہ جات کی فرم میں کام کرتے تھے۔ جونی کی پوسٹ اکاؤنٹنٹ کی تھی جبکہ سونیا، ہاشم صاحب کی سیکریٹری کے طور پر کام کرتی تھی۔ کام کے دوران دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوئے اور پھر انہوں نے نہایت خفیہ طریقے سے شادی کر لی۔ سونیا کے دماغ میں نہایت منافع بخش منصوبہ موجود تھا۔ منصوبے کا نہایت اہم کردار یعنی ہاشم صاحب جو کہ پرزہ جات پر شتمل فرم کے ایم ڈی تھے۔ انہوں نے حیرت انگیز طور پر ڈیڑھ کروڑ روپے کی خطیر بیمہ پالیسی خرید کر انشورنس کمپنی والوں کو بھی حیران کر دیا تھا۔ پالیسی کو نہایت خفیہ رکھا گیا تھا۔ ہاشم صاحب کی کمپنی میں سوائے سونیا کے او

ر کسی کو بھی پالیسی کے متعلق علم نہیں تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہاشم صاحب کی بیوی جوانی میں ہی وفات پا چکی تھیں۔ اس لئے بچے بھی نہیں تھے۔ نہ جانے انہوں نے اتنی بڑی بیمہ پالیسی خریدنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ ڈیڑھ کروڑ کی پالیسی کے متعلق سن کر سونیا کے کان کھڑے ہو گئے اور اس کے دماغ میں نہایت اہم منصوبے نے جنم لیا۔ سونیا نے تمام منصوبہ جونی کو بتایا اور پھر منصوبے کے مطابق ہاشم صاحب کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیے۔ حیرت انگیز طور پر ہاشم صاحب نے سونیا کی پیش رفت کا اقرار میں جواب دیا۔ اور دونوں نہایت دھوم دھام کے ساتھ شادی کر لی۔

شادی کے ایک سال بعد ہاشم صاحب کی موت واقع ہو گئی۔ ان کی گاڑی کا گیس سلنڈر پھٹ گیا تھا۔ اور لاش جل کر کوئلہ بن گئی۔ سر دیوں کے دن تھے۔ ہاشم صاحب نے گاڑی کے خشنے اوپر کئے ہوئے تھے۔ جونی نے سی این جی گیس کے سلنڈر کے وال کو کھول دیا تھا۔ ہاشم صاحب چین اسموگر تھے۔ ایک سگریٹ ابھی مکمل ختم نہیں ہونے پاتا تھا کہ وہ دوسرا سگالیتے تھے۔ بند گاڑی میں گیس کے بھر جانے کے بعد جب انہوں نے سگریٹ

سگنانے کی کوشش کی۔ تب گاڑی کا سلنڈر دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ اور ہاشم صاحب کی موت واقع ہو گئی۔ ایک بات جو جونی کو کھٹک رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ یہ حادثہ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر رونما ہوا۔ یعنی اس دن واقعہ سے پہلے ہاشم صاحب نے سگریٹ سگنانے میں دیر کی۔ ایسا ممکن نہیں تھا۔ لیکن ایسا ہوا؟ بہر حال قانونی طور پر پالیسی کی رقم ان کی بیوی کو ملنی چاہئے تھی۔ پالیسی کی خطیر رقم کو مد نظر رکھتے ہوئے انشورنس کمپنی والوں کے جاسوس نے لاش کے متعلق سوئیا سے پوچھ گچھ کا آغاز کیا۔ تحقیق مکمل ہوئی۔ لیکن انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ سارے کام معمول کے مطابق تھے۔ حتیٰ کہ بیمہ پالیسی کی رقم دینے سے پہلے جاسوس نے لاش کا ڈی این اے کروانے کی بھی ہدایات دیں۔ لاش کے ڈی این اے، ٹیسٹ کی رپورٹ ملنے کے فوراً بعد اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ لاش واقعی ہاشم صاحب کی ہے۔ جاسوس نے تحقیق کردہ فائل پراو کے کے دستخط کر دیئے۔ یوں مختصر تحریری کارروائیوں کے بعد ڈیڑھ کروڑ کی رقم سوئیا کو مل گئی۔ اس نے رقم کو اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کروانے کے بجائے بڑے نوٹوں میں منتقل کرنے کے بعد سیاہ رنگ کے ایک واٹر پروف بیک میں ڈالنے کے بعد گھر کے سیف میں منتقل کر دیا، وہ انشورنس کمپنی کے جاسوس سے اب بھی خوفزدہ تھی۔ اور جلد از جلد ہاشم صاحب کے مکان کو بیچ کر دور دراز کے کسی علاقے میں منتقل ہو جانا چاہتی تھی۔

خوفزدہ ہونے کی کچھ وجوہ پر اسرار واقعات بھی تھے۔ جو ہاشم صاحب کی موت کے بعد رونما ہونے لگے تھے۔ مثلاً سوئیا کو اکثر اوقات ہاشم صاحب کی روح گھر کے ارد گرد گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ڈرائنگ روم میں اسی برائڈ کے سگریٹ کے بجھے ہوئے گلوے بڑے ہوتے تھے۔ جو ہاشم صاحب پیتے تھے۔ چند ایسی اور نشانیاں جو ہاشم صاحب کی موجودگی کا اظہار کرتی تھیں ان کی بدولت سوئیا نے گھر میں اکیلے رہنا مناسب نہیں جانا اور نہ چاہنے کے باوجود بھی جونی

کور ہاشم گاہ پر بلا لیا۔

مختصر منصوبہ بندی..... تھوڑی سی پوچھ گچھ..... اور ڈیڑھ کروڑ کی رقم کا باآسانی مل جانا..... کیا ایسا ہونا ممکن تھا۔ بالکل بھی نہیں..... لیکن بات کچھ اور سی۔ اس منصوبہ بندی کے پیچھے ایک اور منصوبہ بھی کارفرما تھا۔ ہاشم صاحب کی پرزہ جات کی کمپنی دیوالیہ ہو چکی تھی۔ انہیں کمپنی کے استحکام کے لئے گھڑی رقم کی ضرورت تھی۔ دیوالیہ کمپنی کے بل بوتے پر کوئی بھی بینک یا ادارہ قرضہ دینے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ تب ہاشم صاحب نے اپنے تینا زاد بھائی ایم ایم حشمت کی مالی سہارا لیا۔ حشمت صاحب..... ایم ایم گروپ آف کمپنی کے مالک تھے۔ مالی بحران کی بدولت ان کی کمپنی میں بھی کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ دونوں بھائیوں نے صلاح و مشورے کے بعد جو منصوبہ بندی کی۔ وہ کچھ یوں تھی۔ ہاشم صاحب کی نگاہوں میں سوئیا کا عقدا پرست و جود کافی دنوں سے کھٹک رہا تھا۔ انہوں نے خاص طور پر سوئیا کے ہمراہ ڈیڑھ کروڑ کی پالیسی خریدنے کے لئے انشورنس کمپنی والوں کو اپنے آفس میں مدعو کیا۔ پالیسی خریدنے کے بعد جب سوئیا نے ہاشم صاحب کی جانب راغب ہونے کی کوشش کی۔ تب یہ جانتے ہوئے بھی کہ سوئیا خفیہ طور پر جونی کے ساتھ شادی کر چکی ہے۔ اسے ثبوت جواب دیا۔ پھر اس کے ساتھ شادی بھی کر لی۔ شادی کے فوراً بعد جونی کے فلیٹ میں رد و بدل کر کے ایسے آلات نصب کر دیئے گئے جس کے ذریعے فلیٹ میں موجود ایک ایک آواز کو ریکارڈ کیا جانے لگا۔ اور وہ منصوبہ بندی جو ہاشم صاحب کو مل کرنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ اس کے متعلق ہاشم صاحب اور حشمت صاحب کو آگاہی حاصل ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصے کے بعد جب جونی نے گاڑی کے گیس کے سلنڈر کے وال کو کھول کر قتل کرنے کے منصوبے کی ابتداء کی۔ تب ہاشم صاحب نے گاڑی میں بیٹھنے کے فوراً بعد گھر کے قریب واقع گیراج کا رخ کیا۔ گیراج کا مالک ان کا جاننے والا تھا۔ بلکہ منصوبے کا ایک اہم رکن بھی تھا۔ ہاشم صاحب نے گاڑی گیراج کے

نوکر کے حوالے کی اور اسے شہر سے باہر لے جا کر بریکیں چیک کرنے کے لئے کہا۔ نوکر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ تب ہاشم صاحب نے سگریٹوں سے بھری ہوئی ڈبی اسے تمھارے ہونے کہا۔ لاگت ڈرائیو کے دوران تمھارے کام آئے گی۔ اس کے بعد انگوٹھی اور ہار اپنے گلے سے اتار کر اس کے ہاتھ اور گلے میں پہنا دیئے۔ اس نے پریشان نگاہوں سے ہاشم صاحب کی جانب دیکھا۔ تب وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”جب ڈرائیو کے بعد اپنے مالک کے پاس جاؤ۔ تب ہار اور انگوٹھی اسے دے دینا۔ اس وقت تک تم ہی پہنے رکھو۔“

شام تک گاڑی کے حادثے کی خبر شام کے اخباروں میں لگنے لگی۔ اور ہاشم صاحب منظر عام سے روپوش ہوتے چلے گئے۔ اس حادثے کے اگلے دن ہاشم صاحب نے گیراج کے مالک کو بھی قتل کر دیا۔ ظاہری طور پر وہ مر چکے تھے۔ اس لئے اگر وہ قتل بھی کر لیتے۔ تب انہیں گرفتار کرنا ممکن نہیں تھا۔ بہر حال ان کے منصوبے کا نہایت اہم پہلو یہ تھا کہ ظاہری موت سے پہلے ہاشم صاحب نے بیمہ پالیسی کی تمام رقم ایم ایم حشمت صاحب کے نام کر دی تھی۔ یعنی ان کی موت کے بعد رقم بیوی کے ذریعہ حشمت صاحب کو مل جاتی۔ انہوں نے حلفیہ بیان تحریر کیا۔ حج صاحب کے دستخط اور مہر لگانے کے بعد ان کے پاس الٹنا رکھوا دیا تا کہ رقم ملنے کے فوراً بعد قانونی کارروائی کر کے رقم حاصل کر لی جائے۔ یہ وہ منصوبہ تھا۔ جو ڈیڑھ کروڑ کی رقم کے لئے سرگرم عمل رہا۔ اس وقت رقم سوئیا کے پاس تھی۔ حشمت صاحب نے پولیس کے ہمراہ ہاشم صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ گھر کے پاس پہنچنے کے بعد انہوں نے پولیس والوں کو باہر رہنے کا حکم دیا اور خود دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو گئے۔ ان کے پاس گھر کی دوسری چابی موجود تھی۔ جو انہیں ہاشم صاحب کے توسط سے دستیاب ہوئی تھی۔

دوسری جانب سوئیا کے بلانے پر جب جونی نے ہاشم صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ تب باہر کھڑے پولیس کو

دیکھنے کے بعد اپنا چہرہ رومال میں چھپا لیا۔ وہ وقت سے پہلے اپنے اور سوئیا کے تعلقات کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے سوچا شاید کہ سوئیا نے جان کر اس کے لئے کھلا چھوڑ دیا ہوگا۔ اس لئے پرواہ کئے بغیر اندر گھستا چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز پس مردوں کی تھیں۔ ان میں ہاشم صاحب کی آواز نمایاں تھی۔ جونی کو اپنے جسم کے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ہاشم صاحب کی جلی ہوئی لاش دستیاب ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی لاش کا ڈی این اے ٹیسٹ بھی کیا گیا تھا۔ جس کی رپورٹ کے مطابق لاش ہاشم صاحب کی ہی تھی۔ پھر بھلا کمرے میں کون موجود ہو سکتا تھا؟ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بھاگ جانا مناسب جانا۔ لیکن ابھی وہ بھاگنے کے لئے پرتول ہی رہا تھا کہ اسے ہاشم صاحب کی کرخت آواز سنائی دی۔

”بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ خاموشی کے ساتھ اندر آ جاؤ۔“ جونی نے پریشان نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ لیکن وہاں کسی کو بھی موجود نہیں پایا۔ اس لئے مجبوراً کمرے میں قدم رکھ دیا۔ کمرے کے درمیان میں ہاشم صاحب اور حشمت صاحب موجود تھے۔ ان کے درمیان میں میز پر بیمہ پالیسی کی رقم سے بھرا بیک رکھا ہوا تھا۔ لیکن سوئیا کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ جونی نے ہکلاتے ہوئے ہاشم صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ ہاشم صاحب تو مر چکے ہیں۔“ ہاشم صاحب نے تہقہ لگایا۔ پھر یکھت نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئے۔ جونی نے تعجبی نگاہوں سے حشمت صاحب کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات ثبت تھے۔

”میں نے اسے رقم کے حصول کے لئے قتل کر دیا ہے۔“ وہ پریشان لہجے میں بولے۔ ”لیکن اس کی روح میرا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ منصوبہ تم دونوں میاں بیوی تیار کر چکے تھے۔ اسے عملی صورت میں

نے دے دی۔ حالانکہ اسے تم دونوں کے منصوبے کے ایک ایک پہلو کے متعلق خبر تھی۔ اور اس نے منصوبے میں رد و بدل بھی کر دی تھی۔ لیکن میں نے تم حاصل کرنے کے لئے اسے بے ہوش کیا اور شہر سے باہر لے جا کر گاڑی میں ڈال کر گاڑی کو آگ لگا دی۔ موت کے دوسرے دن ہی اس کی روح نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ میں سونیا کو قتل کر دوں۔ وہ سونیا سے نفرت کرتا ہے۔ وجہ اس کی بے وفائی ہے۔ میں نے جب انکار کرنے کی کوشش کی تب اس نے پولیس کو سب کچھ بتانے کی دھمکی دی۔ میں نے مجبور ہو کر سونیا کو قتل کر دیا۔ اس کی لاش اوپر کمرے میں موجود ہے۔“

جون کو اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی بیوی کو قتل کر دیا گیا ہے اور اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ حشمت صاحب بولے چلے جا رہے تھے۔

”ہاشم صاحب کی روح کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ تمہیں سونیا کا قاتل قرار دے کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ لاش گھر میں موجود ہے۔ صرف بے ہوش کر کے تمہیں سونیا کی لاش کے قریب ڈالنا باقی ہے۔ بے ہوشی کے بعد اگر تمہارے ہاتھوں کے نشان اس چاقو پر ثبت کر دیے جائیں۔ جن کے ذریعے اس کا قتل ہوا ہے۔ تب پولیس تمہیں ہی قاتل گردانے گی۔“ انہوں نے بات ختم کرنے سے پہلے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور موہاں باہر نکال کر پولیس والوں کو کس کال دینے لگے۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ریوولور بھی موجود تھا۔ جون کو اچانک ہی اپنے پیچھے سونیا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”جون تم کا بیک اٹھاؤ اور مکان کے پیچھے موجود کھڑکیوں کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرو۔“ جون کو لیکھت ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آنا پڑا۔ اس نے دھکا دے کر حشمت صاحب کو صوفوں کی جانب دھکیلا اور میز پر رکھے ہوئے بیک کو اٹھا کر کمرے کی دوسری جانب موجود کھڑکیوں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اتنی دیر میں حشمت صاحب بھی

سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوولور کو سیدھا کیا اور بے دریغ فائر کر دیا۔ کمرہ ریوولور کے دھماکے سے گونج اٹھا۔ لیکن نشانہ چوک گیا۔ گولی جون کے سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی کھڑکی کے شیشے کو توڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ جون نے چھلانگ لگائی اور کھڑکی سے باہر کودتا چلا گیا۔ اس نے زمین پر قدم رکھتے ہی اندھا دھند گھر سے کچھ دور نظر آتی مختصر روشنیوں کی جانب بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہاں ایک مختصر ریلوے اسٹیشن موجود ہے۔

موسم خوشگوار تھا اور چاند کی چاندنی کی بدولت ماحول روشن تھا۔ اسے اسٹیشن کی عمارت تک پہنچنے میں تقریباً دس پندرہ منٹ لگے۔ اسٹیشن کی پٹریوں پر ٹرین کھڑی تھی۔ لیکن روائگی میں کچھ وقت باقی تھا۔ جون ٹکٹ لئے بغیر پچھلی جانب موجود اکائی کے ڈبے میں چڑھ گیا۔ رٹن نا ہونے کے برابر تھا۔ اس نے ٹوائٹ کے پاس موجود اکیلی سیٹ کو منتخب کیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے اسٹیشن کا دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ٹرین نے روائگی کی ولس دی اور پلیٹ فارم سے آگے نکلے گی۔ بھی چار پولیس والے اسٹیشن کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے متلاشی نگاہوں سے اسٹیشن کے مختصر پلیٹ فارم کا جائزہ لیا۔ پھر نہایت بھرتی کے ساتھ پلیٹ فارم چھوڑتی ہوئی ٹرین کے آخری ڈبے میں چڑھ گئے۔

اب کچھ تعارف پولیس کے چاروں اہلکاروں کا بھی ہو جائے۔ انسپکٹر کا نام ناصر تھا جبکہ اس کے ماتحتوں کے نام توقیر، جبار اور شاہد تھے۔ انسپکٹر ناصر کا موہاں فون کے ذریعے حشمت صاحب کے ساتھ رابطہ قائم تھا۔ اور وہ وقتاً فوقتاً انہیں رپورٹ دے رہے تھے۔ حشمت صاحب کے انفارم کرنے پر جب انسپکٹر ناصر نے ہاشم صاحب کے گھر کے پچھواڑے کا رخ کیا۔ تب اس نے جون کو اسٹیشن کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انسپکٹر اور اس کے ماتحت جون کا پیچھا کرتے ہوئے اسٹیشن کی عمارت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور آخری ڈبے میں چڑھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں جون کی تصویر موجود تھی۔ اور

وہ تمام ڈبوں میں اسے تلاش کرنے لگے۔ ٹرین میں مسافر کم تھے۔ اس لئے انہیں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن تمام ڈبوں میں تلاش کرنے کے باوجود وہ جون کو تلاش نہیں کر پائے۔ انسپکٹر ناصر نے اپنے ماتحتوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم تینوں نے ٹرین کا کونا کونا چھان مارا ہے؟“ ماتحتوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تب پھر بھلا وہ کہاں جا سکتا ہے؟ یقیناً تم تینوں نے کونا سے کام لیا ہوگا۔ ورنہ بھلا وہ چلتی ہوئی ٹرین میں سے کہاں جا سکتا ہے۔“ اچانک انسپکٹر ناصر کے دماغ میں کچھ خیال آیا اور اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم تینوں نے ٹرین کے ٹوائٹ بھی چیک کئے ہیں؟“ اس دفعہ انہوں نے انکار میں سر ہلادیا۔ انسپکٹر ناصر نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ پھر بولا۔

”وہ یقیناً ٹوائٹ میں ہی چھپا ہوگا۔ تلاش کا کام انجن کے پاس والے ڈبے سے دوبارہ شروع کرو۔ اس مرتبہ ٹرین کے ٹی کی کبھی ہمراہ لے جانا۔“ تینوں ماتحتوں نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹی کے ہمراہ دوبارہ کام شروع کر دیا۔ دوبارہ تلاش کرتے ہوئے وہ آخری ڈبے تک آ پہنچے۔ لیکن جون کو تلاش نہیں کر پائے۔ اب صرف آخری ڈبے کا کچھ حصہ باقی بچا تھا۔ اس بات کے سو فیصد چانسز موجود تھے کہ جون آخری ڈبے میں ہی کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ انسپکٹر ناصر نے اپنے ماتحتوں اور ٹی کے ہمراہ آخری ڈبے میں قدم رکھ دیا۔

جون آخری ڈبے میں ہی موجود تھا۔ اور وہ انسپکٹر ناصر کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جانب آتا بخوبی دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹرین کے ڈبوں میں موجود مسافروں کے علاوہ ٹوائٹ بھی کھول کر چیک کر رہے تھے۔ اب جون کے لئے ٹوائٹ میں چھپنا بھی ناممکن تھا۔ ٹرین مکمل رفتار کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ وہ جو ہے دان میں پھنس چکا تھا۔ اسے شدت سے سونیا یاد آنے لگی۔ وہ ایسے موقع پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی تدبیر سوچنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ ابھی اس کے دماغ کی سوچ مکمل

بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسے اپنے پیچھے سونیا کی مدھر آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکار رہی تھی۔ جون نے بڑبڑا کر پیچھے کی جانب دیکھا۔ وہ سانسے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ جون نے کچھ پوچھنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا۔ لیکن سونیا نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر بولی۔

”تمہارے پاس وقت کم ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ تمہاری تلاش میں آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ ٹرین سے فرار کا صرف ایک ہی راستہ میرے دماغ میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ فوراً ٹرین کو روکنے کے لئے زنجیر کو کھینچ دو۔ جیسے ہی ٹرین رکے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرو۔“ جون نے اثبات میں سر ہلایا اور زنجیر کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ اس کے قریب ہی موجود تھی۔ جون نے آگے بڑھ کر کھینچنے کے ساتھ زنجیر کو کھینچ دیا۔ یکدم ٹرین کی رفتار میں کمی واقع ہونے لگی۔ جون نے ممنونانہ نگاہوں سے سونیا کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم ہوا پر مشتمل روح ہو۔ یا پھر گوشت پوست سے مزین انسان۔ اگر روح ہو تو پھر یہاں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں عالم ارواح میں ہونا چاہیے۔“ سونیا نے افسردہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”عالم ارواح میں وہ روحیں جا پاتی ہیں۔ جن کی موت قدرتی طریقے سے واقع ہوئی ہو۔ حادثاتی موت والی روحیں اور خاص کردہ روحیں جن کے ساتھ ظلم ہوا ہو۔ وہ دنیا میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ شاید انتقام کے لئے۔“ ہاشم صاحب کی روح نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے حشمت صاحب کا مہارالیا۔ ہوا پر مشتمل روح کسی بھی ٹھوس اجسام کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس لئے میں ہاشم صاحب اور حشمت صاحب کو مقصد میں ناکام کرنے کے لئے تمہیں استعمال کر رہی ہوں۔“ گاڑی کی رفتار بالکل سست ہونے لگی تھی۔ جون نے باہر نگاہ دوڑائی۔ دور دور تک سیاہ اندھیرے اور دیرانگی کا عالم تھا۔

دوسری جانب جب انسپکٹر ناصر نے ٹرین کو روکے ہوئے محسوس کیا۔ تب اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر

دیکھنے کی کوشش کی۔ اسٹیشن کا دور دور تک نام و نشان موجود نہیں تھا۔ اس نے ٹی ٹی کو گاڑی روکنے کی وجہ معلوم کرنے کے لئے انجن ڈرائیور کی جانب بھجوا لی۔ ٹی ٹی نے جیب میں سے موبائل باہر نکالا اور انجن ڈرائیور سے رابطہ ملنے کے بعد جب وجہ معلوم کی تب انجن ڈرائیور نے بتایا کہ ”ٹرین کے مسافروں میں سے کسی نے زنجیر کو کھینچ کر ایمر جنسی بریکوں کو کھینچ دیا ہے۔“ انسپکٹر ناصر نے فوراً چلائے ہوئے ٹی ٹی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ڈرائیور کو اچھی طرح بتا دو کہ اس کے بعد اگر کوئی زنجیر کھینچ کر ٹرین کو روکنے کی کوشش کرے۔ تب ٹرین کو رکتا نہیں چاہئے۔ یہ میرا یعنی انسپکٹر ناصر کا حکم ہے۔“ ٹی ٹی نے حکم لفظ بہ لفظ ڈرائیور کے کان تک پہنچانے کے بعد موبائل کو بند کر دیا۔ انسپکٹر ناصر نے اپنے ماتحتوں کی جانب دیکھتے ہوئے پرتکلف لہجے میں ہدایت دیں۔

”ٹرین کے رکتے ہی تم تینوں نے ٹی ٹی کے ہمراہ ٹرین کو دونوں جانب سے کور کرنا ہے۔ مجرم نے زنجیر صرف اس لئے کھینچی ہے تاکہ وہ ٹرین سے اتر کر فرار ہو سکے۔ یقیناً وہ ٹرین کے آخری ڈبے میں ہی موجود ہے۔ کیونکہ پچھلے ڈبوں کی تلاشی ہم لے چکے ہیں۔ وہاں اس کا وجود موجود نہیں تھا۔ لیکن جب اس نے ہمیں آخری ڈبے کی جانب جاتے ہوئے دیکھا اور فرار کے تمام راستوں کو مفقود پایا۔ تب آخری کوشش کے طور پر زنجیر کو کھینچ دیا۔ تاکہ گاڑی کے رکتے ہی وہ فرار ہونے کی کوشش کرے۔ ہمیں اسے اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔ اس لئے گاڑی کے رکتے ہی آخری ڈبے کو دونوں جانب سے گھیرے میں لینے کے علاوہ اور باقی ڈبوں پر بھی نظر رکھنے کی کوشش کرنی ہے۔“ اس کے ماتحتوں نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کے رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی جھلکے کے ساتھ رک گئی۔ انسپکٹر ناصر اور اس کے ماتحتوں کے علاوہ ٹی ٹی نے بھی نیچے اتر کر آخری ڈبے کو دونوں جانب سے گھیر لیا۔ ان کی نگاہیں انجن کے آخر تک گردش کر رہی تھیں تاکہ کوئی بھی

مسافران کی نگاہوں سے بچ کر نیچے نہ اترنے پائے۔ ایک دو مسافروں نے ہوا خوری کے لئے نیچے اترنے کی کوشش کی۔ لیکن ٹی ٹی نے انہیں سیٹی بجا کر گاڑی میں واپس چڑھنے کا حکم دیا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے ٹی ٹی کی جانب دیکھتے ہوئے واپس ٹرین پر چڑھ گئے۔ چاروں جانب دیرانہ تھا اور ویرانے میں گھپ اندھیرا طاری تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہیں دے رہا تھا۔ انسپکٹر ناصر اور اس کے اہلکار بعد ٹی ٹی سانس روکے اس انتظار میں ٹرین سے نیچے کھڑے تھے کہ شاید مجرم نیچے اترنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور انجن نے روانگی کی وسل دے دی۔ ٹی ٹی نے جوابی سیٹی بجائی اور ٹرین نے حرکت شروع کر دی۔ انسپکٹر ناصر نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ پھر پھرتی کے ساتھ ڈبے پر چڑھتا چلا گیا۔ ٹرین نے رفتار پکڑنی شروع کر دی۔

جونی آخری ڈبے کی کھڑکی کے پاس کھڑا حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس نے انسپکٹر اور اس کے ماتحتوں کو ٹرین سے نیچے اتر کر مسرور چہ بند ہوتے ہوئے بخوبی دیکھ لیا تھا۔ اب ٹرین سے نیچے اترنا ناممکن نہیں رہا تھا۔ سونیا کی روح اس کے ہمراہ موجود تھی۔ اس نے بھی نیچے اترنے سے منع کیا۔ اور حالات کے مطابق اگلا قدم سوچ سمجھ کر اٹھانے کی نصیحت کی۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد ٹرین نے روانگی کی وسل دی۔ تب جونی نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور پھرتی کے ساتھ بھاگتا ہوا درمیانی ڈبے میں داخل ہو گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے پر اس نے پولیس کے چاروں اہلکاروں کو ٹی ٹی سمیت ٹرین کے آخری ڈبے میں کھستے ہوئے دیکھا۔ ٹرین نے رفتار پکڑنی شروع کی۔ جونی ڈبے کے دروازے کے پاس کھڑا تیزی سے گزرتی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

آخری ڈبے کے دروازے میں پولیس کا سپاہی بھی دروازے کے پاس کھڑا باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی چلی جارہی تھی۔ پھر اچانک ہی دور سے ایک بوی نہر کے بند دکھائی دینے لگے۔ اس کے کناروں پر بٹیاں روشن تھیں۔ جونی کو اپنے پیچھے سونیا کی

سرکشی سنائی دی۔ ”یہ تمہارے لئے بہترین موقع ہے۔ تم تیرا بخوبی جانتے ہو۔ آکھیں بند کر کے نہر میں چھلانگ لگا دو۔ انہوں نے دوبارہ ڈبوں کی چینک شروع کر دی۔ تب تمہارے پاس فرار کے لئے مزید راستہ موجود نہیں ہوگا۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے میں تیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ نہر کا بندزد یک آتا چلا جا رہا تھا۔ ٹرین کے دروازے میں کھڑا ہوا پولیس کا سپاہی اب بھی ٹرین کے ڈبوں کے دروازے اور کھڑکیوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ یکدم نہر زد یک آگئی۔ نہر کا پاٹ کافی چوڑا تھا اور نہر پانی سے مکمل طور پر لبریز تھی۔ جونی نے اللہ کا نام لیا اور ڈبے کے دروازے سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ٹرین کی رفتار طوفانی انداز اختیار کر چکی تھی۔ تیز ہوا کے زبردست ریلے نے اسے مخالف سمت دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن جونی نے سمت کا تعین کر کے چھلانگ لگائی تھی۔ اس لئے اس نے جسم کی سمت پر مکمل قابو رکھا۔ اور دھماکے کے ساتھ ٹھنڈے رخ پانی کے درمیان میں جا گرا۔ اس کے جسم کو زبردست جھکا لگا۔ اور اس کا جسم پانی کے اندر ڈوبتا چلا گیا۔ اچھال کی قوت نے اسے فوراً ہی باہر کی جانب اگل دیا۔ جونی نے لمبا سانس لیا۔ اور نہر کے کنارے کی جانب تیز نا شروع کر دیا۔ اس کی کمر پر موجود بیگ اگرچہ واٹر پروف تھا۔ لیکن پھر بھی جونی کی کوشش یہی تھی کہ بیک پانی کے اندر نہ جانے پائے۔ اسے کنارے تک پہنچنے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ نہر کا کنارہ ریتلا تھا۔ وہ کنارے کے قریب ریت پر اوندھا گر گیا۔ اور لمبے سانس لے کر انرجی کو بحال کرنے لگا۔ سونیا کی روح اس کے پاس کھڑی تعریفی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

جونی کو ڈبے سے نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے پولیس کے اہلکار نے بخوبی دیکھ لیا۔ اس نے فوراً سے پیٹر انسپکٹر ناصر کو جونی کے فرار کے متعلق بتا دیا۔ انسپکٹر ناصر نے ہڑبڑا کر سپاہی کی جانب دیکھا۔ پھر اسے زنجیر کھینچنے کا حکم دیا۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر زنجیر کو جھکنے کے ساتھ کھینچا۔ یکلخت ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ انسپکٹر

ناصر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹرین کے دروازے کے پاس آکھڑا ہوا۔ ٹرین اس وقت گئے کے کھیت کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اور اس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ کم ہوتی چلی جارہی تھی۔ پھر نہ جانے ایسا کیا ہوا کہ ٹرین نے جھکا لے کر رفتار کو دوبارہ بڑھانا شروع کر دیا۔ انسپکٹر ناصر نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے ماتحتوں کی جانب دیکھا۔ پھر چلائے ہوئے ٹی ٹی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”ٹرین رک کیوں نہیں رہی۔ زنجیر کھینچنے کے باوجود اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ ڈرائیور پاگل تو نہیں ہو گیا۔“ ٹی ٹی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”جناب وہ تو آپ کے حکم پر عمل کر رہا ہے۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ کہ زنجیر کھینچنے پر بھی ٹرین کو دوبارہ نہیں رکتا چاہئے۔“ انسپکٹر ناصر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر بال ہوتے ہوئے بولا۔

”اس گدھے کے نیچے کو فون کر کے کہو کہ ٹرین کو فوراً روکے۔ نہ جانے مجرم کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔“ ٹی ٹی نے فوراً بھاگ کر موبائل کو جیب سے باہر نکالا اور انجن ڈرائیور کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ملنے پر اس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ ساتھ میں انسپکٹر ناصر سے مختصر بات چیت بھی کرادی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور پھر وہ جھکا کھا کر رک گئی۔ لیکن اتنی دیر میں ٹرین کافی سے زیادہ فاصلہ طے کر چکی تھی۔ بہر حال گاڑی کے رکتے ہی انسپکٹر ناصر اور اس کے ساتھیوں نے گاڑی سے نیچے چھلانگ لگائی اور نہر کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگتے ہوئے انسپکٹر ناصر نے ماتحت سے پوچھا۔

”کیا یہاں سے سڑک قریب ہے؟“ سپاہی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہاتھ سے سیدھے ہاتھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اس جانب کچھ فاصلے پر سڑک ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

انسپکٹر ناصر بولا۔ ”نہر میں چھلانگ لگانے کے

بعد اس نے یقیناً سڑک کا رخ کرنا ہے۔ یہاں ارد گرد آبادی موجود نہیں ہے۔ وہ لفٹ کے ذریعے قریبی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ نہر کی جانب جانا فضول ہے۔ اس لئے ہمیں سڑک کا رخ کرنا چاہئے۔“ پھر کچھ سوچ کر وہ بولا۔

”لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہر کے بند سے نکلنے کی بدولت اس کی موت واقع ہو چکی ہو۔ اگر ایسا ہوا۔ تب ہمارا سڑک کی جانب جانا فضول ثابت ہوگا۔ میرے خیال میں زیادہ بہتر یہ رہے گا کہ ہم میں سے دو سڑک کی جانب جائیں اور دو نہر کی جانب..... میں اور تو قیر سڑک کی طرف جاتے ہیں جبکہ تم دونوں نہر کی صورت حال معلوم کرنے کے بعد موبائل پر ہمیں انفارم کرو۔“ دونوں سپاہیوں نے اثبات میں سر ہلایا اور نہر کی جانب چل دیے۔

سڑک وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ پندرہ منٹ تیز قدموں کے ساتھ چلنے کے بعد وہ دونوں سڑک پر پہنچ گئے۔ اب ان دونوں نے دوبارہ نہر کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ پندرہ منٹ نہیں گزرے تھے کہ انہیں اپنے مخالف جانب سے ایک گھوڑا گاڑی آتی دکھائی دی۔ انہوں نے حیرت بھری نگاہوں سے پیچھے مڑ کر گھوڑا گاڑی کی جانب دیکھا۔ جو رات کے اس پھر سڑک پر خراماں خراماں رواں دواں تھی۔ اس کے علاوہ وہ سڑک مکمل طور پر سنسان تھی۔ جب گھوڑا گاڑی قریب آئی۔ تب انسپکٹر ناصر نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کوچوان نے باگیں کھینچ لیں اور گھوڑا گاڑی سڑک کے درمیان رک گئی۔ انسپکٹر ناصر نے جونی کا حلیہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اس کی بابت پوچھا۔ تب کوچوان نے زور سے رات کے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”صاحب ابھی کچھ دیر پہلے میں اس نو جوان کو یہاں سے اٹھا کر قریبی آسب زدہ کھنڈرات تک چھوڑ کر آیا ہوں۔ پانی سے شرابور وہ نو جوان قریبی نہر میں نہا کر باہر نکلا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے مناسب جواب نہیں دیا۔“ انسپکٹر ناصر نے بات کو درمیان میں کاٹ کر اسے

خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر تانگے میں بیٹھتے ہوئے اسے کھنڈرات کی جانب چلنے کا حکم دیا۔ کوچوان نے اثبات میں سر ہلایا اور تانگے کو موڑنے کے بعد دوبارہ کھنڈرات کی جانب چل دیا۔ تانگے میں خاموشی طاری تھی۔ صرف گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سے ماحول گونج رہا تھا۔ کوچوان نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

”حضور..... وہ کھنڈرات آسب زدہ ہے۔ کتنی مرتبہ لوگوں نے وہاں چڑیل کو سفید کپڑوں میں ملبوس پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے نو جوان کو کھنڈرات میں جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن وہ خدا کا پکا نکلا۔ تانگے سے اتر کر کھنڈرات کے اندر چلا گیا۔“ انسپکٹر ناصر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم نے بھی اس چڑیل کو کھنڈرات میں منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یا پھر یونہی لوگوں کی سی ان بی باتوں کو آگے بڑھانے میں مدد دے رہے ہو۔“

کوچوان پر جوش لیجے میں بولا۔ ”حضور میں قسم کھا کر بتاتا ہوں۔ کہ میں نے پچھلے ہفتے کی رات کو کھنڈرات کے پاس اسے سفید کپڑوں میں ملبوس گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سرخ ہونٹوں سے سفید دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔“

انسپکٹر ناصر نے زوردار تہقہہ لگاتے ہوئے طنز یہ لیجے میں پوچھا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ جو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ کپڑے کاشن کے تھے یا پھر مکمل کے تھے۔ اس کے علاوہ کیا تم نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کپڑے کس درزی سے سلوائے ہیں۔“

کوچوان شرمندہ لیجے میں بولا۔ ”جناب میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں نے واقعی اسے دیکھا تھا۔ وہ نہایت بد صورت تھی۔“ انسپکٹر ناصر نے اس دفعہ کوئی جواب نہیں دیا۔ اور لا پرواہی سے باہر موجود کھیتوں کی جانب دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد گھوڑا گاڑی کھنڈرات تک پہنچ گئی۔ کھنڈرات کیا تھے۔ بس مٹی اور پتھروں کا ڈھیر تھا۔ چند مختصر دیواروں کی بدولت شاید اسے کھنڈرات کا نام دے دیا گیا تھا۔ لیکن جو بھی تھا۔ چاندنی رات میں

پتھروں کا وہ ڈھیر بہت خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ نہ جانے انسپکٹر ناصر کو کیوں اپنے جسم میں سرد لرہ دوڑتی محسوس ہوئی اور اس کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ اس نے حلق میں بیدار ہوتے ہوئے تھوک کو نگلا۔ پھر اپنے سانسھی تو قیر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”میرے خیال میں بزم خطرناک ہے۔ اس لئے ہم تینوں کو کھنڈرات کی جانب اکٹھے جانا چاہئے۔ میرے پیچھے آؤ۔“ تو قیر اور کوچوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر انسپکٹر کے پیچھے کھنڈرات کی جانب چل دیے۔ کھنڈرات میں جھینگروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

کوچوان سرگوشی کے عالم میں بولا۔ ”حضور میں نے سنا ہے کہ جھینگروں میں چمکاؤروں کی روح حلول کر جاتی ہے اس لئے بیدار توں کو شور مچاتے ہیں۔“ انسپکٹر سچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔ ”تم روحوں کے علاوہ بھی کسی موضوع پر بات کر سکتے ہو..... یا نہیں..... بھائی میرے رات کو جو بھی جاندار تجل خوار ہوتا ہے..... اس میں یقیناً چمکاؤروں کی روح بھی ہوتی ہے۔ پولیس کا حکم اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تم بھی یقیناً رات کو مزوری کرتے رہے۔ تب میرے بھائی ہم سب کا جو روحوں پر مشتمل ہوا..... تا.....“

کوچوان نے اثبات میں سر ہلایا اور سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”جناب پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ رات ڈھائی بجے والی ٹرین سے مجھے اچھی گھڑی سواری مل جاتی ہے۔ اس لئے رات کے اس پھر اسٹیشن کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔“

اچانک ماحول گھوڑے کے ہنہانے کی آواز سے گونج اٹھا۔ تینوں نے ہڑبوا کر سڑک کی جانب دیکھا۔ جونی کوچوان کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھوں میں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لگام ڈھیلی چھوڑی اور گھوڑے نے ہنہانے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ کوچوان کا پیشاب خطا ہو گیا۔ اور وہ ہٹکاتے ہوئے بولا۔

”سفید کپڑوں میں ملبوس چڑیل انسان کے

روپ میں میرا تانگہ لے کر فرار ہو رہی ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ انسپکٹر ناصر نے اسے ڈانٹ کر چپ کرادیا اور تو قیر کے ہمراہ تانگے کے پیچھے سڑک کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

جونی نے تانگے پر بیٹھتے ہی گھوڑے کی لگام کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ گھوڑے نے ہنہانے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ اسے اپنے پیچھے پولیس والوں کے پیچھے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن جونی نے پرواہ نہیں کی اور سنسان سڑک پر گھوڑا اٹھا جاتا گیا۔ سونیا کی روح اس کے ہمراہ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی اچھی گھوڑا گاڑی چلا سکتے ہو۔“

”دنیا میں کوئی بھی کام مشکل نہیں۔“ جونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بس ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا تم اب تمام زندگی یوں ہی میرے ہمراہ در بدر پھرتی رہو گی۔“

”نہیں“ سونیا بولی۔ ”لیکن تم سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہتا۔“

وہیے اگر حقیقت جانتا چاہتے ہو۔ تو بات صرف اتنی سی ہے کہ انتقام کے بغیر میں اس دنیا سے واپس جانے کو تیار نہیں ہوں۔“

جونی نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔ ”لیکن ہاشم صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ تم بھلا کس سے انتقام کی بات کر رہی ہو۔ اگر تمہارے انتقام کا ہدف حشمت صاحب ہیں تو ہوا پر مشتمل روح ہونے کی بدولت تم بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتی ہو۔“

سونیا سرد آہ بھر کر بولی۔ ”میرے انتقام کا ہدف ہاشم صاحب ہی ہیں اور تم یقین جانو کہ اگر میں تمہارے ہمراہ نہیں ہوتی۔ تب اب تک تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے حسرت بھری نگاہوں سے دنیا کی آزاد فضاؤں کے متعلق سوچ رہے ہوتے۔ جس طرح میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اسی طرح ہاشم صاحب حشمت صاحب کے

بمراہ ہیں۔ وہ ہوا پر مشتمل روح ہونے کے بعد تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھنے پر قادر ہیں۔ لیکن میری وجہ سے انہیں مقصد میں ناکامی ہو رہی ہے۔ جب تک میں تمہارے ساتھ موجود ہوں۔ تم ہاشم صاحب کی روح کی دسترس سے دور ہو۔ ہاشم صاحب حشمت صاحب کو کھٹکتی کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اگر میں نہ ہوتی۔ تب وہ تمہاری ہر حرکت کی خبر حشمت صاحب کو دے دیتا۔ یوں تم پر کئے پرنے کی مانند ان دونوں کے ارد گرد پھڑپھڑاتے رہتے اور وہ تمہیں با آسانی گرفتار کر لیتے۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور آہستہ ہوتے ہوئے کھوٹے کو چابک رسید کر دیا۔ کھوٹا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

”اب تمہارا آگے کا کیا پروگرام ہے؟“ سونیانے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”کچھ خالص نہیں..... میرے پاس توقع سے زیادہ رقم موجود ہے۔ میں اچھی زندگی بسر کر سکتا ہوں۔“

”لیکن اس رقم کو فوراً استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“ سونیانے بات درمیان میں کاٹنے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے۔ پولیس والوں نے نوٹوں کے نمبر چیک کرنے کے بعد تلاش کرنے کے لئے لسٹوں کی صورت میں پولیس والوں کو بھجوا دیے ہوں۔ ایسی صورت میں تمہاری تلاش میں یہ نمبر مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

”واقعی تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔“

میرے خیال میں..... میں کچھ عرصہ اپنی ذاتی رقم سے گزارا کر سکتا ہوں۔ پالیسی کی رقم استعمال کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔“ دور بہت دور چند روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا گاؤں تھا۔ جوتیزی کے ساتھ قریب آتا چلا جا رہا تھا۔ جونی نے تانگے کی باگیں کھینچ کر اسے روک دیا۔ پھر نیچے اترتے ہوئے بولا۔

”پولیس والوں کو میری موجودگی کے متعلق بتانے میں یہ تانگہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اسے گاؤں سے دور چھوڑ کر ہم گاؤں جائیں گے۔“ سونیانے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں یہ خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ تم تانگے کو سڑک سے ہٹا کر ان پہاڑوں کے درمیان لے جاؤ اور ویرانے میں کھڑا کرنے کے بعد کھوٹے کو تانگے سے آزاد کرنے کے بعد کھلا چھوڑ دو۔ یہ خود ہی اپنے مالک کو تلاش کرتا ہوا گھر چلا جائے گا۔ اگر سڑک پر تانگہ گاڑی کو چھوڑ دو گے۔ تب پولیس والے ارد گرد کے تمام گاؤں میں تمہاری تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیں گے اور تمہیں دوبارہ در بدر ہونا پڑے گا۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور تانگے میں بیٹھ کر اسے سڑک سے اتارنے کے بعد کچھ دور واقع پہاڑی ٹیلے کی جانب چل دیا۔ صبح صادق کے آٹھ غمودار ہونے لگے تھے اور سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ پہاڑی ٹیلوں کے درمیان درہ نما طویل سلسلہ تھا۔ جونی نے درے کے درمیان تانگے کو روکا اور کھوٹے کو آزاد کرنے کے بعد چابک مار کر اسے سڑک کی جانب بھگا دیا۔ پھر خود سونیا کی روح کے ہمراہ سڑک سے کافی دور واقع گاؤں کی جانب چل دیا۔ تھکاوٹ کی بدولت اسے اپنا جسم ٹوٹا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے کسی آرام دہ بستر کی اشد ضرورت تھی۔

گاؤں کے قریب اور سڑک سے ہٹ کر پہاڑی ٹیلے کو صاف کر کے ایک خوب صورت اور جدید ہوٹل تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کا نام ”ماؤنٹ ہوٹل“ تھا۔ کمرہ حاصل کرنے کے بعد جونی نے جب کمرے میں قدم رکھا۔ تب اسے ہر لحاظ سے آرام دہ اور پرسکون پایا۔ جونی نے رقم کے تحیلے کو احتیاط کے ساتھ بیڈ کے نیچے چھپایا۔ پھر کمرے کے دروازے کو لاک کرنے کے بعد غسل کرنے کے لئے ہاتھ روم کی جانب چل دیا۔ اچھی طرح فریش ہونے کے بعد وہ بستر پر آ لیٹا۔ سونیا کی روح آرام دہ کرسی پر بیٹھی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جونی کچھ دیر میں گہری نیند سو گیا۔ وہ پرہے کے ڈیڑھ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ سونیا ویسے ہی آرام دہ کرسی پر بیٹھی۔ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”تم سوئی نہیں.....“ جونی نے لاشعوری طور پر پوچھا۔ سونیا نے سر دہا بھرتے ہوئے جواب دیا۔

”میں ایک روح ہوں۔ احساسات سے عاری..... دکھ درد..... خوشی غم سے مستثنیٰ..... ایک ایسی روح جس کا مقصد صرف اپنے محبوب کی حفاظت کرنا ہے۔ وہ بھلا کیونکر سو سکتی ہے۔“ جونی نے ترحم انگیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ پھر کھانے کے لئے نیچے چل کر اس کی جانب چل دیا۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اس نے منیجر کو مختصر کھانے کا آرڈر دیا اور حال احوال کے لئے منیجر سے کسی تازہ ترین خبر کے متعلق دریافت کیا۔ منیجر کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ پھر وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

”کوئی خاص خبر تو نہیں ہے۔ لیکن پچھلے دنوں بہت افسوسناک واقعہ پیش آیا تھا۔ ہوٹل کے پچھواڑے میں کچھ دور ایک پہاڑی گاؤں جعفر آباد واقع ہے۔ وہاں ایک معصوم اور بھولی بھالی لڑکی جہرنا اپنے باپ کے ہمراہ رہتی ہے۔ دونوں باپ بٹی گئے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش گاؤں والوں کی بھیڑ بکریاں چرانا ہے۔ یہ یقیناً کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ لڑکی بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے قریبی جنگل میں گئی۔ راستے میں اس کی ملاقات گاؤں کی ایک عورت زربینہ سے ہوئی۔ وہ عورت پانی بھرنے کے لئے چشمے کی جانب جانا چاہتی تھی۔ لیکن دودھ پیتے بچے کی موجودگی میں پہاڑ سے نیچے جانا دشوار تھا۔ اس نے بچے کو لڑکی کے حوالے کیا اور خود پانی بھرنے کے لئے پہاڑ سے نیچے کی جانب چل دی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جب وہ پانی بھر کر واپس آئی۔ تب اس نے جہرنا کو زمین پر گرے ہوئے پایا۔ وہ بے ہوش تھی۔ زربینہ کے بچے کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ جہرنا کے چہرے پر خاص طور پر ہونٹوں پر تازہ خون کے نشانات موجود تھے۔ اس کے ہاتھ بھی خون سے رنگے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ کپڑوں پر بھی خون کے دھبے موجود تھے۔ عورت نے گھبراہٹ کے عالم میں چیختے ہوئے جہرنا کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ہوش میں نہیں آ سکی۔ تب عورت نے گاؤں کا رخ کیا۔ اور گاؤں والوں کو اپنے ہمراہ لے کر واپس پہاڑ پر چلی آئی۔

جہرنا کو ہوش میں لانے کے لئے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ جب وہ ہوش میں آ گئی۔ تب اس سے بچے کے متعلق دریافت کیا گیا۔ اس نے لاعلمی کے عالم میں انکار میں سر ہلایا۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ان پہاڑوں پر جتنے بھی قبائل آباد ہیں۔ وہ سب آزاد قبائل ہیں۔ اس لئے یہاں ان کے اپنے طور طریقے اور قانون کے اصول اپنائے جاتے ہیں۔ اس لئے لڑکی کو پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے گاؤں کے بچوں کے سامنے کیا گیا۔ لڑکی چونکہ لوگی بہری تھی۔ اس لئے ترحم کے لئے ایسے آدمی کا انتخاب کیا گیا جو گوشت کھانے کے متعلق بخوبی آگاہی رکھتا تھا۔ سوال و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ترجمہ کرنے والے آدمی نے بتایا کہ لڑکی بچے کی عدم موجودگی کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کے منہ اور ہاتھوں پر خون کیسے لگا۔

مختصر سوالات کے جوابات اور تھوڑی سی تحقیق کے بعد بچوں نے فیصلہ سنا دیا۔ ان کے خیال کے مطابق لڑکی آدم خور بن چکی ہے اس لئے سزا کے طور پر اسے سنگسار کر کے ختم کر دینا چاہئے۔ ورنہ اس کا وجود تمام گاؤں والوں کے علاوہ ہر زندہ نفس کے لئے مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ ابھی فیصلے پر عملدرآمد نہیں ہو پایا تھا کہ حیرت انگیز طور پر گاؤں کا کھیا آگے بڑھا۔ اور اس نے بچوں سے درخواست کی کہ۔ ”لڑکی کو ختم کر دینا نہایت ظالمانہ عمل ہوگا۔ اس کے بجائے اگر لڑکی کو پاگل خانے میں بھجوا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ لڑکی کی دماغی حالت درست نہیں ہے۔ پاگل خانے میں یقیناً بہتر ہو جائے گی۔“

گاؤں کے زیادہ تر افراد کی ہمدردیاں لڑکی کے ساتھ تھیں۔ اس لئے انہوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور بچوں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے بعد فیصلہ کھیا کہ حق میں دے دیا۔ آج وہ پر لڑکی کو پاگل خانے منتقل کر دیا جائے گا۔“ منیجر اچانک خاموش ہو گیا۔ جونی کو ان باتوں میں کچھ خاصی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اتنا جانا چاہتا تھا کہ گزشتہ رات یا پھر

آج کے دن پولیس تو ہوٹل میں پوچھ گچھ کرنے نہیں آئی تھی۔ لیکن اس نے پولیس کے متعلق نہیں بتایا۔ جونی نے چندتا مساف بھرے جملوں میں افسوس کا اظہار کیا۔ پھر اپنی میز پر آ بیٹھا۔ سونیا وہاں موجود تھی۔ لیکن ہوٹل والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ جونی نے اسے جھرتا کے متعلق بتایا۔ تب سونیا نے مکمل دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مکمل انہماک کے ساتھ کیس کے متعلق سنا۔ پھر ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ”مجھے لڑکی بے گناہ دکھائی دیتی ہے۔ میں معاملے کی تفتیش کر کے کچھ دیر میں واپس آتی ہوں۔ تم جب تک کھانا کھاؤ۔“

”میری بات سنو۔۔۔؟“ جونی بولا۔ ”پولیس میری تلاش میں ہے۔ اس لئے میں جلد از جلد یہاں سے آگے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ تم ان فضول چکروں میں کیوں الجھنا چاہتی ہو۔“

سونیا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں پانچ منٹ میں واپس آتی ہوں۔“ وہ اچانک ہی نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔ ویٹر نے کھانا لگانا شروع کیا اور جونی نے خاموشی کے ساتھ کھانا کھانا شروع کر دیا۔ ابھی پانچ منٹ مکمل نہیں گزر پائے تھے کہ سونیا دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر فکر انگیز تاثرات تھے۔

جونی نے پوچھا۔ ”خیر تو ہے۔ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ لڑکی تو خیر خیریت سے ہے نا۔۔۔۔؟“

سونیا نے انکار میں سر ہلایا۔ ”اس کا مستقبل خطرے میں ہے۔ میں مکمل معلومات کر کے آئی ہوں۔ اسے سازش کی دلدل میں دھکیلنے والا گاؤں کا کھیا ہے۔ پہلے اس نے لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن گاؤں والوں کے بروقت آ جانے پر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد اس نے قانونی طور پر لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی کوشش کی۔ تب لڑکی کے باپ نے صاف انکار کر دیا۔ کھیا کی انا لڑکی کے حسن کے آگے چمکنا چور ہو گئی۔ اسے حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن کچھ بھی کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ تب اسے یہ

تدبیر سوچھی اور اس نے موقع واردات پر پہنچ کر لڑکی کو بے ہوش کیا۔ اور بچے کو چھپانے کے بعد لڑکی کے چہرے اور ہاتھوں پر خون لگا دیا۔ گاؤں کے سادہ لوح انسان اتنی عقل نہیں رکھتے تھے کہ بچے کا گوشت کھانے کے بعد بھلا لڑکی بے ہوش کیوں ہو گئی۔ انہوں نے اپنی عقل کے مطابق لڑکی کے خلاف کیس کا آغاز کیا۔ اور اسے سزا سنائی۔ تب کھیا نے عقلداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہلاک کرنے کے بجائے پاگل خانے بھجوانے کا مشورہ دیا۔ گاؤں والوں نے مشورہ قبول کیا۔ اور سزا میں تخفیف کرنے کے بعد کھیا سے درخواست کی کہ وہی لڑکی کو شہر لے جا کر پاگل خانے میں داخل کر دے۔“ سونیا بولی۔

”کھیا کا منصوبہ حسب منشا کامیابی کی جانب گامزن تھا۔ وہ لڑکی کے وجود کا حصول چاہتا تھا۔ جو اسے ملنے والا تھا۔ لڑکی کو پاگل خانے بھجوانے کے بجائے وہ اسے شہر میں موجود اپنے مکان میں رکھنا چاہتا ہے۔ دوپہر کے چار بجے وہ لڑکی کو اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھا کر شہر لے جائے گا۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔ اس مخصوص لڑکی کو انسان کی صورت میں موجود اس بیٹھریے سے بچانے کی کوشش کرو۔ ورنہ اس کے ساتھ ہونے والے انسانیت سوز سلوک کے بعد تمام انسانیت چلا اٹھے گی۔“

جونی پریشان لہجے میں بولا۔ ”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ پولیس مجھے کتے کی مانند ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ لڑکی کے ساتھ پولیس والوں سے کہاں تک بھاگ سکوں گا۔“

سونیا بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”اس لڑکی کا وجود تمہارے لئے بہتری کا باعث بن سکتا ہے۔ پولیس یہ جانتی ہے کہ تم اکیلے رقم لے کر فرار ہوئے ہو۔ وہ ایسے آدمی کو تلاش کر رہے ہیں جو اکیلا ہے۔ لیکن جس کے ہمراہ جوان لڑکی موجود ہو۔ وہ اسے یقیناً نظر انداز کر دیں گے۔ اس لئے میرے خیال کے مطابق لڑکی کا ساتھ تمہیں فائدہ دے گا۔ آگے جو تمہیں منظور۔۔۔۔؟“ سونیا خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جونی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔ ایسا بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ حشمت صاحب کا رویہ اور میرے پاس موجود ہے۔ اور میرے خیال میں لڑکی کو ان بھیڑیوں کے چنگل سے نکالنے کے بعد ہم دونوں وہیں سے آگے روانہ ہو جائیں گے۔“ سونیا نے مطمئن انداز میں اقرار میں سر ہلادیا۔

چار بجے کے قریب دونوں پہاڑوں کے پاس سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پیچھے بیٹھے تھے۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لیکن آوارہ بادل کے سفید نکلے بھی ہوا کے دوش پر گھومتے پھر رہے تھے۔ نرم گرم دھوپ جسم کو بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ سوا چار بجے کے قریب ماحول گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج اٹھا۔ سڑک سسناں پڑی ہوئی تھی۔ یہاں ٹریفک ٹا ہونے کے برابر تھا۔ پھر بھی احتیاطاً جونی نے سونیا کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ اگر دور تک آتی ہوئی کوئی گاڑی دکھائی دے تو وہ اسے انعام کر دے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور گھوڑا گاڑی سڑک کے موڑ کے پاس سے نمودار ہو کر ان دونوں کی جانب آنے لگی۔ اگلی سیٹ پر کوچوان کے علاوہ کھیا کا ایک آدمی راقط تھا۔ بیٹھا تھا جبکہ چمکیلی سیٹ پر کھیا کے ہمراہ اٹھارہ سے بیس سالہ لڑکی بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن نفوس غیر واضح تھے۔ جونی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور یو لور کو باہر نکال لیا۔ پھر اسے چیک کرنے کے بعد اٹھ کر پکڑے جھاڑیوں میں سڑک کی جانب چل دیا۔ گھوڑا گاڑی قریب آ چکی تھی۔ جونی سڑک کے درمیان میں ہاتھ اونچے کر کے کھڑا ہو گیا۔ کوچوان نے تانگے کی باگیں پھینچیں اور گھوڑا انہناتے ہوئے سڑک کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ کوچوان کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے استفہامی نگاہوں سے جونی کی جانب دیکھا۔ لیکن جونی نے اسے سیکر نظر انداز کر دیا اور پیچھے بیٹھے ہوئے کھیا کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ کی سواری کو روکنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ میرا تعلق پولیس کے خفیہ محکمے سے ہے اور ہمیں یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ آج شام یہاں سے بہت بڑی مقدار میں ہیر و دن اسمگل

کر کے لے جانی جائے گی۔ تکلیف دہی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ لیکن مختصر چیکنگ کے بعد آپ آگے جاسکتے ہیں۔“ کھیا کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھرے۔ لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی کے ساتھ تانگے سے نیچے اتر آیا۔ لڑکی مکمل طور پر چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جونی نے جیب میں موجود یو لور کو پھرتی کے ساتھ باہر نکالا اور کھیا کے ماتھے پر رکھتے ہوئے بولا۔

”اب ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ میں بات دوبارہ کہنے کا عادی نہیں ہوں۔ اپنے آدمی سے کھور اقل میرے حوالے کر دے۔ ورنہ تمہاری گھوڑی کو چمکیلی کر دوں گا۔“ اتنی دیر میں کوچوان اور راقط تھامے ہوئے آدمی نیچے اتر آئے۔ کھیا نے سر کے اشارے سے اپنے آدمی کو راقط جونی کے حوالے کرنے کا حکم دیا اور اس نے خاموشی کے ساتھ راقط جونی کو تھمادی۔ جونی نے کھیا اور اس کے ساتھی کے جسم کی تلاش کی۔ وہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ شاید وہ حقیقی طور پر جونی کو پولیس کا آدمی گردان چکے تھے۔ پھر جونی نے انہیں منہ دوسری جانب پھیر کر دس قدم دور جانے کا اشارہ کیا۔ اس مرتبہ بھی دونوں نے بلاچوں و چرا حکم کی تعمیل کرتے ہوئے منہ سڑک کے مخالف جانب پھیرا اور سڑک سے نیچے اتر کر دس قدم آگے چلنے لگے۔

جونی نے پھرتی کے ساتھ تانگے پر چڑھ کر کوچوان کی سیٹ سنبھالی اور باگ ڈھیلی چھوڑ دی۔ گھوڑے نے سڑک پر موڑ کاٹنے کے لئے چکر کاٹا۔ پھر شہر کے مخالف جانب بھاگنے لگا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر کھیا اور اس کے ساتھیوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لیکن اسلحہ پاس نہ ہونے کی بدولت کچھ بھی نہیں کر پائے۔ کچھ ہی دیر میں گھوڑا گاڑی موڑ مڑنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہوئی چلی گئی۔

پہاڑی موڑ کے مڑتے ہی جونی نے گھوڑے کو چابک لگایا اور گھوڑا سر پٹ بھاگنے لگا۔ پیچھے بیٹھی گھوڑی لڑکی میں حرکت کے آثار بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چھری کی صورت بن چکی ہو۔ سونیا

کی روح اگلی سیٹ پر براجمان تھی۔ جونی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”بہت آسانی سے ہمیں مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔“ سونیانے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔

”کھیا کے دل میں چرچا تھا۔ وہ اس بات سے باخبر تھا کہ وہ کوئی اچھا کام نہیں کھڑا ہے۔ علاوہ ازیں تم نے پولیس کے متعلق کہہ کر اس کی کھکھی بند کر ڈالی۔ اور چونکہ ہم دونوں اچھائی کے راستے پر چل رہے تھے۔ ہماری نیت صاف تھی۔ اس لئے خدا کا ساتھ بھی ہمارے ساتھ تھا۔“ جونی اقرار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”واقعی تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے تمام زندگی برے کام کے ہیں۔ مجھے یادیں کہ میں نے کبھی کوئی اچھا کام بھی کیا ہو؟ اور آج ایسا کرتے ہوئے مجھے عجیب قسم کا اطمینان محسوس ہوا ہے۔ لیکن اب اس لڑکی کا ہم کیا کریں۔ اسے ہمراہ لے کر بھٹکانا ممکن نہیں ہے۔“

سونیا بولی۔ ”کسی اچھے اور بڑے شہر پہنچنے کے بعد کسی دارالامان میں پہنچا دیں گے۔ اسے لاوارث چھوڑ دینا بہتر نہیں ہوگا۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور آہستہ ہوتے ہوئے گھوڑے کو دوبارہ چابک رسید کر دیا۔ گھوڑے کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔ پہاڑی علاقے کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ پہاڑ نہایت سرسبز و شاداب تھے۔ جن پر چڑھ کے درختوں کا گھنا جنگل آباد تھا۔ آسمان پر بادل گھرتے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا۔ وہ تینوں بارش کے چھینٹوں سے محفوظ تھے۔ لیکن ارد گرد دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ ہونے کی بدولت اب جونی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ انہیں سڑک کرتے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ گھوڑا ابھی تھکن سے چور ہونے کی بدولت خراماں خراماں چل رہا تھا۔ جونی نے خاموش بیٹھی ہوئی سونیا کی جانب دیکھا۔ پھر جھنجھلا کر بولا۔

”تم بھلا کیسی روح ہو۔ ہم دونوں کے لئے کسی مناسب رہائش گاہ کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی ہو۔ ہم سرد بادور باران کی بدولت آؤ کر مر جائیں گے۔ کیا تمہیں

اچھا لگے گا۔“ سونیانے مسکراتے ہوئے جونی کی جانب دیکھا اور بولی۔

”یہاں سے کچھ دور سڑک سے ہٹ کر پہاڑی ٹیلوں سے پرے ایک خوب صوب وادی کے درمیان تائی ماں کا لکڑی کا مکان واقع ہے۔ وہ گرمیوں کے سیزن میں اوپر کا پورشن کرائے پر دیتی ہے۔ یہی اس کی گزربس کا ذریعہ ہے۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا۔

انہوں نے پہلے کی طرح گھوڑے کو تانگے سے علیحدہ کر کے آزاد چھوڑ دیا اور تانگے کو گھنے درختوں کے جھنڈ کے درمیان چھپانے کے بعد طوفانی انداز میں برسی بارش کے درمیان پہاڑ کے دوسری جانب وادی کی طرف چل دیئے۔ لگاتار بارش کی بدولت چٹانیں مٹی سے بنی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن جونی اور لڑکی کسی نہ کسی طرح انہیں بھلانے لگے۔ سونیانے ہمراہ اوپر چڑھتے چلے گئے۔ چوٹی پر پہنچنے پر سورج غروب ہو گیا اور چاروں جانب اندھیرے کی سیاہ چادر تنی چلی گئی۔ بارش اب بھی متواتر برس رہی تھی۔ جونی اور لڑکی کے کپڑے پانی کی بدولت شرابور ہو رہے تھے۔ اور شدید سردی کی وجہ سے ان دونوں کے دانت بج رہے تھے۔ قدم اٹھانا مشکل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن رکنا موت کے مترادف تھا۔ تم پر مزید ستم یہ کہ گھپ اندھیرے کی بدولت کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذرا سی غفلت کی بدولت وہ کسی گہری کھائی میں گر سکتے تھے۔ پہاڑ سے نیچے وسیع و عریض میدان کے درمیان انہیں ٹٹمائی ہوئی چند روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ ان دونوں کے قدم تیز ہونے لگے۔ پہاڑ سے نیچے اترنے کے بعد انہوں نے خود کو گھٹیلے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹٹمائی ہوئی روشنی لائین کی تھی۔ اور لکڑی کے دو منزلہ گھر سے باہر آ رہی تھی۔

میدان میں درختوں کی بہتات تھی۔ اندھیرے کی بدولت یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ درخت کون سے پھلوں کے تھے۔ مکان کے ارد گرد چار دیواری موجود نہیں تھی۔ لکڑی کے برآمدے کے آگے کمروں کے دو دروازے دکھائی دیتے تھے۔ برآمدے میں چند گیلے اور

لکڑی کی دو کرسیاں موجود تھیں۔ جونی نے آگے بڑھ کر دروازے کو کھٹکھٹایا اور انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ ایک ضعیف عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں لائین موجود تھی۔ چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ ہال اور بیٹنوں سفید تھیں اور کمرے کی بدولت جھکی ہوئی تھی۔ جونی اور لڑکی کی جانب بخوردیٹے ہوئے وہ بولی۔

”کیوں دروازہ کھٹکھٹایا.....؟“

”ہمیں کمرہ چاہئے۔“ جونی ساجت بھرے لہجے میں بولا۔ سڑک کے پاس ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ کسی نے ہمیں بتایا کہ آپ کمرہ کرائے پر دیتی ہیں۔ اس لئے پہاڑ کو عبور کر کے یہاں تک چلے آئے۔“

بوڑھی عورت نے ترحم بھری نگاہوں سے ان دونوں کے بارش کے پانی سے شرابور جسموں کی جانب دیکھا۔ پھر ایک جانب ہٹتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ جونی اور لڑکی نے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ کمرہ گیس کے ہیٹر کی بدولت گرم تھا۔ وہاں آرائش کا مزید سامان موجود نہیں تھا۔ سوائے گیس کے ہیٹر کے سامنے لگے ہوئے نرم نرم بستر کے..... گیس کے ہیٹر کے ساتھ لوہے کا نیلے رنگ کا سلنڈر منسلک تھا۔ ایک سائینڈ سے ہیٹریاں چھت کی جانب جا رہی تھیں۔ مکان مختصر لیکن صاف سترا تھا۔ بوڑھی عورت نے دونوں کو گیس کے ہیٹر کے پاس بیٹھنے کے لئے کہا اور خود کمرے کے دوسری جانب موجود باورچی خانے کی جانب چل دی۔ کچھ دیر میں ہی وہ چائے بنا کر لے آئی۔ انہوں نے چائے پی۔ پھر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اوپر موجود کمرے کی جانب چل دیئے۔ اوپر کے کمرے میں مکمل فرنیچر موجود تھا۔ بیڈ..... آرام دہ کرسی۔ الماری..... سامنے والی دیوار میں بہت بڑی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ جس کے آگے پھولدار پردے لگے ہوئے تھے۔

بوڑھی عورت نے انہیں کمرے میں چھوڑنے کے بعد دوسرے دن نیچے آنے کی نصیحت کی۔ پھر خاموشی کے ساتھ باہر چلی گئی۔ وہ دونوں دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔

اس لئے بستر پر گرتے ہی سو گئے۔ تھکن کی بدولت نیند خوب آئی۔ صبح سات بجے کے قریب جونی کی آنکھ جھٹکے کے ساتھ کھل گئی۔ گونگی لڑکی بستر میں موجود نہیں تھی۔

سونیا کی روح نہ جانے کہاں تھی۔ کھڑکی کے پردوں سے چھن کر سورج کی روشنی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ جونی نے انگڑائی لی۔ پھر لحاف کو ہٹا کر بستر سے نیچے اتر آیا۔ گزشتہ رات کی بھرپور نیند کی بدولت وہ اپنے جسم میں خوشگوار قسم کی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر جھٹکے کے ساتھ پردوں کو ہٹا دیا اور کھڑکی کے پت کھول دیئے۔ سامنے جو منظر موجود تھا۔ وہ شاید تصوراتی دنیا میں موجود جنت کا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت کے عالم میں پھٹتی چلی گئیں۔

گزشتہ رات کی طرح موسلا دھار بارش کی بدولت دھلا ہوا وسیع میدان جس میں پھلوں سے لدے ہوئے درخت موجود تھے۔ ایک پہاڑی جھرنادریاں میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ جس کے پانی سفید دودھ کی طرح صاف و شفاف تھے۔ پچھلی صوب اور گہرا نیلا آسمان..... گھاس کے درمیان میں کہیں کہیں سرخ نیلے پیلے پھولوں کے دستے یوں کھلے ہوئے تھے جیسے گھاس کے وسیع و عریض خیل میں جان بوجھ کر انہیں رکھ چھوڑا گیا ہو۔ اس خوب صورت جنت میں رنگ برنگی خوب صورت تیلیوں کی بہتات تھی۔ جونی سانس روکے اس خوب صورت منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ حیرت کے مارے اس کا منہ کھلا ہوا تھا کہ اچانک اسے اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کی خفیف آواز سنائی دی اور وہ چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ لڑکی جس کا نام شاید جھرناتھا۔ اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ بیڈ کی جانب چلی آ رہی تھی۔ اس کے کچھے دار سیاہ رنگ کے بال کھل کر چہرے پر بکھر رہے تھے۔ ناک ستوال اور ہونٹ سیب کی کاشوں کی مانند پیلے تھے۔ رنگ گندی تھا۔ اور مجموعی طور پر وہ خوب صورت ہونے کے علاوہ کچھ کچھ بھی تھی۔ جسم کے نشیب و فراز تباہی عبادینے والے تھے جبکہ شریقی آنکھیں رنگ برنگی تیلیوں کی مانند پھڑک رہی تھیں۔ جونی کو اپنے

Dar Digest **32** January 2013



جنات کا مہمان

ایس اتیار احمد - کراچی

رات کا گھنٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا، نوجوان کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک باریش بزرگ اس کی چارپائی کے قریب کھڑے تھے انہوں نے نوجوان کا ہاتھ پکڑا تو نوجوان پر ایک عجیب سحر طاری ہو گیا۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی باذوق لوگوں کے لئے بہت ہی اچھی اور دلچسپ کہانی

شاہد! پر جن کا سایہ ہو گیا..... شاہد کے سر پر جن آنے لگا..... لوہاری گیٹ سے شانی مسجد تک چاروں طرف اسی بات کا چرچا تھا۔ خصوصاً عورتوں اور بچوں کے لئے یہ خبر بہت زیادہ اہم تھی..... گھر کے کام و خندوں کے بعد جہاں دیکھو دو چار خاتون بیٹھی ہوئی اسی تذکرے میں مصروف رہتیں۔

شاہد! مسجد میں اپنے والد صاحب سے قرآن شریف حفظ کرتا تھا..... قرأت بھی اس کی بہت عمدہ لڑکا تھا..... اس کے والد شانی مسجد میں ملازم تھے، یہ مسجد اس قدر وسیع ہے کہ ایک وقت میں ہزاروں آدمی یہاں نماز ادا کر سکتے ہیں اس کے ایک جانب قلعہ اور دوسری طرف یادگار اور مغربی سمت بازار سن اور جنوب کی طرف ایک میدان پڑتا اور پھر سڑک ملتی ہے۔

شاہد! مسجد میں اپنے والد صاحب سے قرآن شریف حفظ کرتا تھا..... قرأت بھی اس کی بہت عمدہ

سے پہلے کوٹ کو اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بات کو یکسر فراموش کر گیا کہ نچلے کمرے میں گیس کا سلنڈر مکمل طور پر کھلا ہوا تھا۔ ابھی وہ کوٹ اتار بھی نہیں پایا تھا کہ بھک کی آواز کے ساتھ کمرے میں آگ پھیلی چلی گئی اور کمرہ جونی کی دردناک چیخوں سے گونجنے لگا۔ ان چیخوں کے درمیان کبھی کبھی سونیا کی روح کی آواز بھی نمودار ہوتی تھی۔ وہ چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اگر میں تمہیں زندہ چھوڑ دیتی۔ تب تم کسی اور لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے مجھ سے بے وفائی کرتے۔ جو کہ میری برداشت سے باہر ہوتا۔ اور مجھے اس راستے سے ہٹانے کے لئے دوبارہ دماغ استعمال کرنا پڑتا۔ ایک دفعہ پھر تمہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا پڑتا..... سو میں نے قصہ ہی ختم کر دیا۔ اب تم بھی جلد از جلد روح بن جاؤ گے۔ میرے ہم پلہ..... جس کے لئے بے وفائی کرنا ممکن نہیں ہوگا..... اور تم ہمیشہ کے لئے میرے بن جاؤ گے۔ صرف اور صرف میرے.....“

تمام رات آگ بھڑکتی رہی۔ اور صبح کے قریب وہاں سلگتے ہوئے انگاروں کے علاوہ اور کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ تائی ماں اور جھونا وہاں سے کچھ دور اپنے ایک رشتہ دار کے گھر موجود تھیں۔ ان دونوں کے بچنے کا سبب اس توڑ پھوڑ کی آواز تھی۔ جو اچانک ہی اوپر کے کمرے سے آنے لگی تھی۔ اور جن کا سبب جونی کا غصہ تھا۔ نینا سے بیدار ہوتے ہی تائی ماں کے حاس ناک نے فوراً گیس کی بوتل کو محسوس کیا۔ انہوں نے پھرتی کے ساتھ لڑکی اٹھایا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

صبح جب وادی والوں نے جلے ہوئے کھنڈر مکان کا رخ کیا۔ تب وہاں جونی کی جلی ہوئی لاش کے علاوہ جلا ہوا وہ بیگ بھی برآمد ہوا جس میں جلی ہوئی وہ توڑ موچھی جس کی بدولت تین انسانوں نے جان گنوا دی۔ لیکن رقم کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔

راستے سے ہٹا دو۔ تم نے ایسا ہی کیا۔ اب ہم دونوں کے درمیان کوئی بھی نہیں ہے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کے محبوب ہیں۔“

جونی کو اپنے دماغ میں غصے کی شدت سے آتش فشاں پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک معمولی روح نے اسے بے وقوف بچے کی مانند اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ اور وہ کسی بے بس کھلونے کی مانند اس کے ہاتھوں میں گردش کرتا رہا۔ اسے اپنے جسم کا فشار خون آسمان کی بلند یوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوا۔

جونی نے چیختے ہوئے کمرے کے سامان کو ادھر ادھر پھینکنا شروع کر دیا۔ سونیا کی روح استہرا نیہ انداز میں قہقہہ لگنے لگی۔ ان قہقہوں نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ اور جونی مکمل طور پر پاگل ہوتا چلا گیا۔ سوچنے سمجھنے کی حس مفقود ہو گئی۔ اس نے پاگل ہانسی کی مانند کمرے کے سامان کو درہم برہم کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بیڈ کو اٹھتے ہوئے وہ اس بات کو مکمل طور پر فراموش کر گیا کہ اس کے اوپر موم تیلوں کا اسٹینڈ بھی رکھا ہوا تھا۔ موم بتیاں نیچے موجود لکڑی کے سامان پر گر گئیں اور لکڑی کے سامان کے علاوہ کپڑوں نے بھی آگ پکڑ لی۔ لیکن غصے کی شدت کی بدولت جونی کی آنکھوں پر پٹی بندھ چکی تھی۔ اس لئے اس نے توجہ دینے کے بجائے توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ دیر میں ہی آگ نے شدت اختیار کر لی۔ جونی کو ہوش اس وقت آیا جب آگ نے اس کے کپڑوں کو بھی لپیٹ میں لینے کی کوشش کی۔

جونی نے حیرت بھری نگاہوں سے کمرے میں تیزی کے ساتھ پھیلی ہوئی آگ کی جانب دیکھا۔ پھر بدحواس قدموں کے ساتھ اپنے جسم پر پھیلی ہوئی آگ کو بجھاتا ہوا نیچے ہال کمرے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے سامنے کی جانب کپڑوں پر لگی ہوئی آگ کو ہاتھوں کی مدد سے بجھا لیا۔ لیکن کمرے پر لگی ہوئی آگ کو بجھا نہیں پایا۔ بوکھلائے ہوئے قدموں کے ساتھ اس نے سیڑھیاں پھیلا لگی اور نیچے والے کمرے میں قدم رکھنے

تھی..... اس کے والد گھر زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے عموماً مسجد ہی میں رہتے البتہ ہفتہ، 15 دن میں گھر آ کر ضروریات گھر کی پوری کر دیا کرتے تھے۔ شاہد ان کو روزانہ کھانا دینے جاتا اور رات میں کبھی گھر واپس آ جاتا کبھی والد صاحب کے پاس ہی رہ جاتا۔

شاہد! پر جن کا اثر کیسے ہو گیا؟

یہ کسی کو معلوم نہ تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو گھر والے اس بات کو پھیلانا نہیں چاہتے تھے یا پھر کچھ اور بات تھی جس کی وجہ سے اگر کوئی اس سے ملنے گھر جاتا تو انہیں ملنے نہیں دیا جاتا۔ والد کے لئے کھانا لے کر اب بھی جاتا تھا لیکن اب یادگار سے ہو کر جانے کے بجائے قلعہ اور میدان سے ہوتا ہوا شانی مسجد پہنچا۔

اس واقعہ کے بعد شاہد اکثر راستے میں مجھ سے ملتا تھا۔ وہ چونکہ میرا دوست تھا، اس لئے حسب معمول میں نے پرانی بے تکلفی سے اس سے پتا کرنا چاہا لیکن اب اس کا یہ حال تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر کترانے لگا اور مجھے دیکھ کر راستہ بدل دیتا۔ آتنا، سامنا ہونے کی صورت میں بھی آنکھیں نیچی کئے رہتا۔ اور بے تعلقی سے گزرنے کی کوشش کرتا۔ مجھے اس کے اس رویہ پر بڑی حیرت تھی کئی دن تک سوچنے کے بعد میں نے اصلیت کا پتہ لگانے کا ارادہ کیا۔ تاکہ معلوم ہو کر وجہ کیا ہے؟

ادھر میں اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مجھے شاہد سے تنہائی میں ملنے کا موقع ملے، ادھر شاہد کے گھر میں ایک دھما چوڑکی بچی ہوئی تھی، گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود عورتوں نے اس کے پاس پہنچنا شروع کر دیا۔ جس کو دیکھو کوئی نہ کوئی حاجت لئے اس کے پاس پہنچتی رہتی لیکن شاہد کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی عورت گھر میں داخل ہوئی اس نے کہنا شروع کیا۔

”ارے یہ کون غیر عورت گھر میں داخل ہوئی ہے۔ اسے روکو۔ اسے روکو۔“

اور پھر عورت کے داخل ہونے سے قبل ہی دوڑ کر کمرے میں چھپ جاتا۔ باہر بلایا جاتا تو وہ یہی جواب دیتا۔ ”میں غیر عورتوں کے سامنے کیسے آؤں؟“

آخر بڑے اصرار کے بعد وہ باہر آتا اور آنے سے قبل وہ اپنے سر پر کوئی چادر یا دو پٹہ ڈال لیتا اور جب عورتوں میں آ کر بیٹھتا تو اس کی حالت ایسی ہوتی جیسے کوئی شرمیلی دلہن گھونگٹ کے عورتوں میں بیٹھی ہو۔

اس کے بعد پھر سوالات کا سلسلہ شروع ہوتا۔ عورتیں جو کچھ پوچھتیں وہ گردن جھکائے بہت ہی آہستہ سے جواب دیتا۔ لیکن جب سوالوں کی بھرمار ہوتی تو وہ آہستگی سے جواب دیتے ہوئے کہتا۔

”آپ لوگ کیوں پریشان کر رہی ہیں؟ دو بارہ میرے پاس آنے کی کوشش نہ کریں۔ غیر مردوں کے سامنے عورتوں کو نہیں آنا چاہئے۔“

اس کے اس جواب کا یہ مطلب ہوتا کہ اب مجلس درخواست کر دی جائے۔

آنے والی عورتوں کو کیا ملتا اور کیا نہیں؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن دیکھا یہ گیا کہ آنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوتی۔ بعض عقیدت مند عورتیں مٹھائی یا دوسرے تحفے لے کر آتیں لیکن نہ تو شاہد ہی اور نہ گھر والے وہ لائے ہوئے تحفے قبول کرتے اور بڑے اخلاق اور معذرت کے ساتھ ان کو واپس کر دیتے۔

پھر رفتہ رفتہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ان عورتوں کے گروہ ہو گئے۔ ان میں ایک مداحوں اور دوسرا مخالفوں کا تھا۔ مداح عورتیں شاہد سے متعلق ہر ملنے جلنے والی سے نئے نئے قصے بیان کرتیں۔ ان کے اس قصہ گوئی میں کچھ ملاوٹی حاشیہ آرائی بھی ہوتی جس سے مخالف گروپ کی عورتوں کو بات کرنے کا موقع ملتا اور وہ کسی نہ کسی طرح مداح عورتوں کو نیچا دکھانے کی تاک میں رہنے لگیں۔

چنانچہ اب مجلس میں سوالات اور معمولات کے ساتھ ساتھ استقامتی سوالات کا بھی اضافہ ہو گیا تھا اس کے علاوہ مخالف گروپ کی عورتوں نے پروپیگنڈہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اور اب وہ سب سے یہی کہتیں۔

”اے ہم تو جب جائیں کہ جو کچھ ہم کہیں وہ

ہمیں منگا کر دے۔“

اور پھر محفل فرمائشوں کا اکھاڑہ بن گئی۔ ایک عورت بولی۔

”ہمیں تو اسی وقت موگرے ”بیلے“ کے پھول چاہئے۔“

یہ آوازیں کر شاہد نے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر فضا میں بلند کیا۔ ہاتھ کی مٹھی بند کی اور اسے دو، تین مرتبہ گردش دے کر نیچے کر کے مٹھی کھولی تو اس میں تازہ، تازہ موگرے کی گلیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی تو ڈکرائی گئی ہیں۔ ایک روز!

ایک عورت نے لاپرواہی کی فرمائش کی۔ وہ بھی اسی طرح پوری ہوئی لیکن مخالف گروپ اب بھی مطمئن نہ تھا۔ اس لئے ایک عورت نے تازہ تازہ گلاب جامنوں کی فرمائش کی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ اس قسم کی فرمائش کے متعلق پہلے سے طے کر کے آئی تھی، اس نے سوچا ہوگا کہ بند مٹھی میں مٹھائی کا آنا مشکل ہے مگر گلاب جامنوں کی فرمائش سن کر شاہد نے فضا میں ہاتھ گھمایا اور پھر اس خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے آپ کے پاس گلاب جامن ہیں۔“ شاہد کی بات سن کر وہ خاتون بہت زیادہ پریشان ہوئیں پہلے تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پر اپنے جسم کے آس پاس دیکھنے لگیں یکا یک ان کا ہاتھ فرش پر پھیلے ہوئے دوپٹے پر پڑا۔ خاتون ایک دم گھبرا کر اچھل پڑیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے سانپ پکڑ لیا ہو، اس اچھل کود میں ان کے دوپٹے کا پلو ہٹا تو سب کی نظروں کے سامنے ایک بانس کی بنی ہوئی جھوٹی سی ٹوکری کے اندر کاغذ میں لپیٹی ہوئی گلاب جامنیں موجود تھیں۔ یہ دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔ دوسری عورتیں یہ کرشمہ دیکھ رہی تھیں اب سب حیرانگی کے عالم میں تھیں کہ شاہد نے آہستہ سے ہاتھ اٹھا تے ہوئے کہا۔

”میں جتنا توں کا سردار ہوں۔ میں خود کسی

کو پریشان کرنا پسند نہیں کرتا، اسی لئے آپ لوگ بھی آئندہ مجھے پریشان کرنے کی کوشش نہ کریں، میں تو اس لڑکے کے پاس صرف قرآن شریف سننے آتا ہوں۔“

اس واقعہ کے بعد پھر کسی عورت نے سوال کرنے کی ہمت نہیں کی۔ لیکن ایک دو روز بعد ایک دوسرا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک روز ایک صاحب نے اپنی لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ ”جہاں لڑکی کی بات چیت چل رہی ہے کیا وہ جگہ مناسب ہے؟“

شاہد! ان کا سوال سن کر بڑی دیر تک سر جھکائے ہوئے بیٹھا رہا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے سر تھوڑا اونچا کرتے ہوئے کہا۔

”جس جگہ لڑکی کی بات چل رہی ہے وہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ لڑکے کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔“

اور ہوا بھی یہی ان صاحب نے شاہد کا جواب سن کر جب اچھی طرح انکوائری حاصل کیں تو یہ چلا کہ یہ بات صحیح ہے۔

اسی طرح! ایک محترمہ کا 14، 15 سالہ لڑکا ایک ہفتے سے غائب تھا۔ پولیس میں بھی رپورٹ لکھوائی تھی اور لاہور سے باہر رہنے والے عزیزوں کو خط اور فیکس کئے گئے۔ لیکن ہر جگہ سے نفی میں جواب ملا ماں باپ پریشان تھے۔

ماں نے جب اپنے لڑکے کے متعلق شاہد سے سوال کیا تو وہ پہلے بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور پھر آہستہ آہستہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

”آج شام تک لڑکا واپس آ جائے گا۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ اسی دن شام کو ان کے صاحبزادے صاحب تشریف لے آئے۔ ہوا یہ تھا کہ وہ ماں باپ کے لاڈ لے تھے، ایک دن ماں باپ نے کسی بات پر ڈانٹا۔ وہ اس چیز کو برداشت نہ کر سکے اور گھر سے نکل گئے اور پھر خود ہی گھر آ گئے۔

لیکن! مجھے تو ان چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی

کباڑی

وہ دونوں رستوران میں بے فکری سے چائے پینے میں مصروف تھیں کہ عمر رسیدہ عورت نے آگے جھک کر اپنی جواں سال ساتھی سے سرگوشی کی..... سامنے والی میز پر بیٹھا ہوا آدمی بار بار میری طرف دیکھ رہا ہے..... جواں سال لڑکی نے مرکز اس آدمی پر ایک نگاہ ڈالی اور بے نیازی سے بولی..... میں اسے جانتی ہوں کباڑی ہے..... ہر جگہ پرانے اور نا کارہ مال کی تلاش میں رہتا ہے۔ (شرف الدین جیلانی - ٹنڈوالہ یار)

بلکہ اسے قلعہ کہنا مناسب ہوگا..... صدر دروازے کے باہر سفید، سفید دھواں اٹھ رہا تھا، کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دھواں کہاں سے اٹھ رہا تھا اس لئے کہ آگ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ لیکن دھواں زمین کے مساموں سے نکل رہا تھا اور پھر بل کھا کر ایک جانب ہو جاتا، یہ دھواں صرف ایک جگہ سے نکل رہا تھا جگہ جگہ یہی حالت تھی، بزرگ نے قریب پہنچنے کے بعد ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر فوراً ہی دھوؤں میں زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ دیکھتے، دیکھتے دھوؤں کے بجائے کچھ لوگ انسانوں کے روپ میں کھڑے ہوئے نظر آئے بزرگ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا

”یہ دروازے کے پھرے دار ہیں۔“

سب! نے جھک کر سلام کیا۔ بزرگ سلام کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، جب ہم دروازے کے پاس پہنچے تو بہت بڑا دروازہ خود بخود کھل گیا! لیکن کھولنے والے کون تھے؟ یہ نہیں معلوم اس لئے کہ کوئی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا جب ہم صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک بہت بڑی عمارت تھی، لیکن اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے سامنے ایک کشادہ باغ تھا، وہ باغ کیا تھا جنت کا گمان ہوتا تھا، رنگ رنگ پھول کھلے ہوئے تھے، ہبز

اس لئے کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا بلکہ اس برجی کے نیچے اسکول کا باغ تھا۔ پھر یہ دروازہ کہاں سے آیا گیا؟ جو کچھ بھی تھا..... بہر حال یہ بات میں خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

جب! ہم دونوں دروازے کے پاس پہنچے تو میں نے دیکھا کہ نیچے جانے کے لئے بڑی خوبصورت سنگ مرمر کی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ میرے لئے یہ ایک نئی چیز تھی اس لئے کہ پوری شاہی مسجد سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اس میں کہیں بھی سنگ مرمر استعمال نہیں کیا گیا۔ لیکن اس دروازے میں سیڑھیاں سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر میری سمجھ میں یہ مطلب آیا کہ شاید دروازے تک مسجد کی حد ہے اور سیڑھیوں کے بعد کچھ اور ہے.....

ہم دونوں! دروازے میں داخل ہو کر سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے لیکن جتنے زیادہ نیچے اترتے جاتے تھے اتنی ہی زیادہ روشنی ہوتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ جب سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے دن نکل آیا ہو۔ معلوم نہیں یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔ میں نے اوپر نگاہ کی تو آسمان یا چاند، سورج کسی قسم کی چیز نہ تھی۔ لیکن میری نظروں کے سامنے ایک پورا شہر تھا۔ اونچے نیچے کئی، کئی منزلیں مکانات بنے ہوئے تھے۔ سڑکیں کشادہ تھیں۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغ تھے۔ کافی چہل، پہل تھی، لوگ چل پھر رہے تھے۔ ان چلتے پھرنے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی..... بچے، بوڑھے اور جوان سب ہی تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر سفید لباس پہنتے ہوئے تھے۔

ہم دونوں! چلتے رہے..... بزرگ اب بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ راستے میں شخص ان کو سلام کر رہا ہے اور پھر ان کے گزرنے تک ایک جانب ہٹ کر ادب کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ چلتے، چلتے آخر کار ہم ایک مکان کے سامنے رکے..... مکان بہت بڑا معلوم ہوتا تھا، مکان کیا تھا،

میں نے ان بزرگ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن خوف کی وجہ سے باہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں ضرور دیکھ رہا تھا.....

”تم اپنے دل سے خوف دو کرو..... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آؤ! میرے ساتھ چلو۔“ بزرگ نے کہا۔

میرے لئے ان کا کہنا ماننے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، اس لئے کچھ سوچے سمجھے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔

ان کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے مسجد کے صحن میں دیکھا، اس وقت چاندنی نکلی ہوئی تھی، ہر چیز واضح اور صاف نظر آ رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ کچھ فاصلے پر ان بزرگ کی طرح کچھ اور لوگ بھی آ جا رہے تھے۔ لیکن کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے، یہ میں بالکل نہ سمجھ سکا.....

”آؤ! میرے ساتھ۔“ بزرگ میرا ہاتھ تھامے ہوئے آگے بڑھتے رہے، ابھی تک میں یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں جا رہا ہوں؟ میری تو اس وقت ایسی حالت تھی جیسے مجھے پتہ ناگزیر کر دیا گیا ہو۔

اب بزرگ اور میں دونوں ساتھ، ساتھ مسجد کے صحن میں چل رہے تھے، ہمارا رخ موتیا تالاب کی جانب تھا جب پورا صحن پار کر کے آخری دالان کے قریب پہنچے تو ہمارا رخ اسلامیہ ہائی اسکول کی جانب ہو گیا، میرا ہاتھ اب بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔

مسجد کی چھوٹی برجی کے پاس پہنچ کر وہ بزرگ ایک لمحے کے لئے ٹھہرے، انہوں نے کچھ دیر تک برجی کی بنیادوں کو دیکھا پھر ہاتھ سے ایک لکیر بناتے ہوئے اشارہ کیا۔

ایک! ایک! میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لئے غبار چھا گیا جس کی وجہ سے میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے غبار صاف ہونے کے بعد سامنے ایک دروازہ تھا، اس دروازے کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔

نہ تھی..... میں تو اصلیت معلوم کرنا چاہتا تھا..... اس لئے..... میں شاید سے تنہائی میں ملنے کی فکر میں رہا..... ایک روز وہ مجھے میدان میں جاتے ہوئے ملا..... میں اسے بڑے تالاب کے کنارے لے گیا۔ اس لئے کہ اس قسم کی باتوں کے لئے تنہائی کی ضرورت تھی.....

چنانچہ! پر بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پورا واقعہ سنانے کو کہا..... پہلے تو وہ انکار کرتا رہا، آخر بڑی مشکل سے راضی ہوتے ہوئے بولا۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ میں شاہی مسجد میں ابو سے قرأت سکھ رہا ہوں۔ کبھی میں گھر واپس آ جاتا ہوں اور کبھی رات میں وہیں رہ جاتا ہوں.....“

یہ اب سے کئی مہینے پہلے کی بات ہے ایک رات میں مسجد کے باہر لان میں سو رہا تھا..... والد کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لئے وہ حجرے میں تھے..... سوتے میں اچانک ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اٹھا کر بیٹھا دیا ہو، پہلے تو نیند کے خمار میں بات سمجھ میں نہ آئی لیکن پھر فوراً ایک عجیب قسم کا احساس ہوا جیسے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا تو مجھے اپنے سر ہانے ایک بزرگ کو کھڑے ہوئے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ”یہ کون صاحب ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟“

اس سے پہلے میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا..... حلیہ بھی عجیب تھا..... سفید اجلا لباس پہنتے ہوئے تھے، داڑھی بھی سفید تھی چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور تھا اور وہ میرے سر ہانے خاموشی کے ساتھ کھڑے تھے۔

اس حلیہ میں ایک اجنبی کو آدمی رات کے وقت اپنے سر ہانے اس طرح کھڑے ہوئے دیکھ کر مجھے ڈر کی وجہ سے پسینہ آ گیا۔ اس قدر خوف زدہ تھا کہ بھاگنے کا خیال کیا تو ٹانگوں میں طاقت نہ تھی..... چپخنی کی کوشش کی تو آواز نہ نکل سکی۔ مجھے اس طرح پریشان ہوتا دیکھ کر ان بزرگ نے دلاسا دیتے ہوئے شانے پر پٹکی دی۔

”گھبراؤ نہیں بیٹے! ڈرنے کی ضرورت نہیں؟“ انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

گھاس قرینے سے اگا گئی تھی، پرندے چبک رہے تھے جگہ، جگہ پھل دار درخت کھڑے ہوئے تھے، بڑے بڑے خوش تھے جن میں فوارے چل رہے تھے، میں نے اتنا خوبصورت باغ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا، دل کر رہا تھا کہ یہاں دل بھر کر سیر کروں لیکن وہ بزرگ اب بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے چل رہے تھے۔

عمارت! میں داخل ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ کافی تعداد میں مرد، عورتیں، بڑے اور لڑکیاں چل پھر رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب یا تو خدام ہیں یا نچلے درجے کے جن ہیں۔ اس لئے کہ بزرگ کو دیکھ کر جس طریقے سے وہ ان کا ادب کر رہے تھے وہ ان کے خادم ہونے کا ثبوت تھا۔ کئی جگہ میں نے بچوں کو کھیلنے بھی دیکھا، وہ بزرگ کو دیکھ کر احترام سے کھڑے ہو گئے، کسی عورت یا لڑکی نے مجھے دیکھ کر نہ ہی کوئی پردہ کیا اور نہ چھپنے کی کوشش کی۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یا تو ان میں پردے کی رسم نہیں ہے یا پھر مجھ سے پردہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ ویسے راستے میں عورتیں ملی تھیں میں نے ان کے چہروں پر نقاب جیسی چیز دیکھی تھی مگر صورتیں نقاب میں ہونے پر بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم! ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں اچھے قسم کے قالینوں کا فرش تھا۔ ان پر چھوٹے چھوٹے موٹے گدے پڑے تھے اور سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ ساتھ میں گاؤں کی بچی بھی قرینے سے لگے تھے۔ بزرگ نے مجھے ایک گدے پر لے جا کر بیٹھا پھر میرے قریب بیٹھے ہوئے بولے۔

”بیٹا تمہیں تعجب ہوگا کہ میں کون ہوں اور میں تمہیں کہاں لے کر آیا ہوں؟“

ان کے سوالات کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے، اس لئے خاموشی سے ان کی صورت دیکھنے لگا۔

”بیٹا، ڈرو نہیں بات کرو۔“ بزرگ نے شفقت

آمیز لہجے میں کہا۔

”سنوایہ جتنا توں کا شہر ہے اور میں ان سب کا امیر ہوں۔ یہ منصب ہمیں شاہ جنات کی جانب سے عطا ہوئی ہے۔ تم میرے مہمان ہو تمہیں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، جنات میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی لیکن تم سردار کے مہمان ہو اس لئے سب تمہاری عزت کریں گے۔“

میں نے کئی بار تمہیں قرآن شریف پڑھتے ہوئے سنا ہے، مجھے تمہاری قرات بہت پسند ہے، میں اپنی بیوی اور بچوں کو بھی تمہاری قرات سنانا چاہتا تھا اس لئے تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔ اطمینان سے بیٹھو، میں اپنے بچوں کو بلاتا ہوں، تم سے مل کر وہ خوش ہوں گے۔“

بزرگ نے زور سے کچھ کہا۔ دروازوں میں سے سرائی ہوئی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ یکا یک مجھے سردی کی وجہ کچھ محسوس ہونے لگی۔ خوف کی وجہ سے میرا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور میں آنکھیں میچاڑے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ ابھی میں کچھ پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ چاروں طرف لرزتے ہوئے ہیولے نظر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہیولے جسموں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ ایک لمحہ کے بعد ہی میرے سامنے عورتیں، بڑے لڑکیاں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے۔

”یہی وہ بچہ ہے جس کے بارے میں میں نے تم لوگوں کو بتایا تھا۔ اس کا نام شاید ہے اور یہ بہت اچھی قرات سے قرآن شریف پڑھتا ہے۔ آج میں تمہارے پاس اس لئے لایا ہوں کہ تم بھی اس کی قرات سن سکو۔ اچھا پہلے اس کی خاطر تواضع کرو، پھر یہ تمہیں قرآن شریف سنائے گا۔“

بزرگ کے اتنا کہنے پر پورا کمرہ سفید سفید دھوئیں سے بھر گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد ہوا زور سے چلنا شروع ہوئی لیکن جب ہوا کا زور کم ہوا تو کمرے

میں ایک بہت بڑا دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں قرینے سے پلیٹوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ پینے کے لئے ایک نئے قسم کا شربت تھا۔ اس کا رنگ نہ تو پوری طرح سفید ہی تھا اور نہ لال بلکہ عجیب طرح کا رنگ تھا۔ پینے میں اتنا اچھا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ پیئے ہی چلے جاؤں۔

مجھے اس وقت نہ تو بھوک تھی اور نہ ڈر کی وجہ سے کھانے کی خواہش تھی لیکن بزرگ کے اصرار پر کھانا پڑا۔ میرے کھانا شروع کرنے پر دوسرے لوگوں نے بھی کھانے میں میرا ساتھ دیا۔ مٹھائی بالکل تازہ تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے حلاوتی کی دکان سے گرم گرم ابھی لائی گئی ہو۔ اسی طرح پھل بھی یہ معلوم ہو رہے تھے کہ جیسے ابھی درختوں سے توڑ کر لائے گئے ہوں۔

کچھ دیر میں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر سب میری جانب دیکھنے لگے۔ اب کافی حد تک میرا ڈر بھی دور ہو چکا تھا۔ اس لئے بزرگ کی فرمائش پر سورتہ جن کا ایک رکوع میں نے قرات کے ساتھ سنایا۔ پڑھنے کے دوران سب نے مہاجر جہا کی نگرانی کر کچھ دیر کے بعد بزرگ نے اپنے گھر والوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھا لڑکا کتنا اچھا پڑھتا ہے۔“

”ان کو یہاں بلایا کیجئے۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”ہاں میں ان کو یہاں لایا کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو بھی ان سے قرات سیکھنا چاہئے۔“ اچھا بیٹا، چلو میں تم کو چھوڑ آؤں لیکن ایک بات یاد رکھنا اب میرا سب سے بڑا تم پر ہے گا۔ مگر تم ڈرو نہیں۔“

ابھی بزرگ نے بات ختم کی ہی تھی کہ یکا یک باہر سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی شخص پر سختی کی گئی ہو اور وہ اس اذیت پر کراہ رہا ہو۔ بزرگ نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ ان کے منہ سے ابھی بات ختم ہوئی تھی کہ یکا یک کمرے میں دھماکہ ہوا اس دھماکے کے ساتھ ایک دھواں اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک

جن نمودار ہوا لیکن وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک دوسرا جن بھی تھا جس کو پہلا جن مضبوطی کے ساتھ اپنے گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دوسرا جن ملزم ہے جس کو پہلا جن پکڑ کر لایا ہے۔

”کیا بات ہے؟“ بزرگ نے پہلے جن سے پوچھا۔

”اس نے پھر شرارت کی ہے۔“ پہلے جن نے جواب دیا۔

”ہٹاؤ.....“ بزرگ نے ملزم سے کہا۔

”میں راستے میں کھڑا تھا کہ ایک شخص نے مجھے لکڑی ماری۔“

”کس روپ میں کھڑے تھے؟“

”کالے کتے کے روپ میں۔“

”پھر تو نے کیا کیا؟“

”میں نے اس شخص کے گھر کو آگ لگا دی۔“

”تم نے شرارت کی ہے۔ اس آدمی کو کیا معلوم تھا کہ کتے کے روپ میں جن ہے۔ ویسے بھی کسی جن کو انسان کے ستانے کی ممانعت ہے لیکن تم نے ایک انسان کے گھر میں آگ لگائی ہے۔ اس لئے اب تمہاری یہ سزا ہے کہ چھ مہینے تک تم کتابیں کر انسانوں کی بستی میں ٹھہرو گے اور اس عرصہ میں تم نے کسی قسم کی شرارت کی تو اس کی سزا تم کو ملے گی لے جاؤ۔“

”بزرگ کے لے جاؤ کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ دونوں جن ہوا میں تحلیل ہونا شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گئے۔

میں اس عجیب قسم کی عدالت اور فیصلے کو دیکھ کر بڑا تعجب کر رہا تھا۔ نہ ویل نہ گواہ اور نہ کسی اور قسم کی عدالتی کارروائی۔ ایک منٹ کے اندر ہی ایک مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔ ”ان کے لئے تھلاؤ۔“

بزرگ نے ایک جانب دیکھتے ہوئے کہا لیکن جس جانب انہوں نے منہ کر کے کہا تھا مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ مگر ایک بار پھر ہوا زور سے چلنا شروع ہوئی اور چشم زدن میں ایک جن رومال میں کوئی چیز باندھے ہوئے کھڑا تھا۔



انجام

ساجدہ راجا - ہندواں سرگودھا

اچانک جن نے اپنے ہاتھ آگے کئے تو اس کے ہاتھوں سے تیز شعاعیں نکلیں اور ٹھاکر کے جسم میں پیوست ہو گئیں، ٹھاکر کے منہ سے انیت ناک چیخوں کا طوفان پھوٹ پڑا اور ٹھاکر جل کر خاکستر ہو گیا۔

ایک تیراگیز دل گداز اور موت کرتی حقیقی کہانی جسے پڑھنے والے عیش کرائیں گے

وہ درخت سے بندھے ہوئے جھولے پر بیٹھی مسلسل اونچی آواز میں گانا گارہی تھی۔ اس کی سریلی آواز نے اک سماں باندھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور مسلسل آگے پیچھے ہوتے ہوئے جھولے کی حرکت بھی اس کا ارتکاز نہ توڑ سکی۔

اس کا نام بریتی تھا وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن بہت پرکشش تھی خاص کر اس کی خوبصورت آواز

کے پورے گاؤں میں چرچے تھے۔ اپنے ماں باپ کی اکلونی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ بہت لاڈلی تھی۔ اس کی ہر جائز ناجائز خواہش کو آنکھیں بند کر کے پورا کیا جاتا تھا حالانکہ اس کا باپ بہت غریب تھا۔ گاؤں کے زمیندار کی حویلی کا ملازم۔ لیکن جیسے بھی ہوتا وہ اپنی اکلونی بیٹی کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی ماں اسی عمر کی عورت تھی وہ صرف گھر کے کام کاج

اس کی وضع قطع سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ملازم ہے۔ ”لو بیٹے، یہ تمہارا تھکے ہے۔“ بزرگ نے رومال کا بندل مجھے دیتے ہوئے کہا۔ میرے بندل لے لینے پر وہ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اچھا اب تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

میں نے ان کی ہدایت کے مطابق اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ ان کی آواز پھر سنائی دی۔ ”آنکھیں کھول لو۔“

میں نے آنکھیں کھولیں پہلے تو بڑی دیر تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں لیکن کچھ دیر کے بعد چاروں طرف دیکھا تو رومال کا بندل میرے ہاتھ میں تھا اور میں مسجد کے دالان میں اپنے بستر کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

جو واقعات اب تک میرے ساتھ پیش آئے تھے ان کی وجہ سے میں بہت پریشان تھا۔ میں بڑی دیر تک رومال پکڑے ہوئے بستر کے پاس کھڑا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں اور کہاں جاؤں؟

آخر جب ہوش بحال ہوئے تو یہی مناسب سمجھا کہ والد کو جگا کر تمام واقعہ بتا دوں میں نے اسی وقت اندر کمرے میں جا کر انہیں بیدار کیا اور پورا قصہ سناتے ہوئے وہ رومال کا بندل ان کو دے دیا۔ انہوں نے بندل کھول کر دیکھا تو اس میں تازہ بنی ہوئی مٹھائی تھی اور ساتھ میں چاندی کے سکے والے سو روپے بھی تھے۔ والد نے ان چیزوں کو دیکھ کر ہی رومال میں باندھ دیا اور پھر رُودر کرنے کے لئے ہمت بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں بیٹا۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ میں بھی مسجد میں ان لوگوں کو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ انہیں صرف تمہاری قرات پسند ہے۔ اچھا اب اذان ہونے والی ہے۔ تم بھی ضروریات سے فارغ ہو کر نماز کی تیاری کرو۔“

دن نکلنے پر میں ایک بار اس دروازے کی تلاش میں برجی تک گیا لیکن وہاں کسی دروازے کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس دن کے بعد کئی مرتبہ پھر میرا جانا ان



کرتی تھی۔ حالانکہ زمیندار کی جتنی نے اس کو کئی بار کہا کہ وہ بھی اس کی حویلی میں آکر کام کرے تاکہ ان کے گھر کے حالات ٹھیک ہو سکیں لیکن پریتی کے پتارام داس کو یہ بات گوارہ نہیں تھی۔ اس لئے بعد میں کسی نے اس پر زور نہیں دیا۔

رام داس کو بھی پریتی کے شوق کا پتہ تھا وہ جانتا تھا کہ پریتی کی آواز بہت سندر ہے اس لئے اس نے بھی اس کے شوق پر پابندی نہیں لگائی۔ پہلے پہل تو وہ صرف اپنی سکھیوں کو ہی گانا سناتی تھی لیکن پھر یہ بات کسی طرح زمیندار کے کانوں میں پڑ گئی کہ رام داس کی بیٹی کو گانے کا بہت شوق ہے اور وہ گاتی بھی بہت اچھا ہے۔

ایک دن اس نے رام داس کو بلا کر پوچھا۔ ”رام داس سنا ہے تیری چھوری کو گانے کا بہت شوق ہے اس کی آواز بھی سنا ہے بہت میٹھی ہے۔“ ”جی ہاں صاحب..... آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میری پریتی کو بھگوان نے بہت سندر آواز سے نوازا ہے، وہ جب گاتی ہے تو ارد گرد جیسے سب ساکت ہو جاتا ہے۔“ رام داس نے عاجزی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے ہو ہمیں گانا سننا کتنا پسند ہے اور سندر آواز ہماری کمزوری؟“ ہٹا کر چندر رام نے تائید طلب نظروں سے رام داس کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

”ہم نے تمہاری چھوری کی بہت تعریف سنی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تم اسے کسی دن حویلی لاؤ، ہم اس کا گانا سننا چاہتے ہیں۔“

رام داس نے ہٹا کر کے منہ سے پریتی کے گانے کی تعریف سنی تو اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی وہ جھک کر اٹھا اور چندر رام کے چرن چھوئے اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ چہرے پر چمکتی خوشی کو رام داس چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اس کی جتنی نے اس کے چہرے پر چمکتی خوشی کو بھانپ لیا۔ ”کیا

بات ہے پریتی کے پتا.....؟ اس سے بہت خوش دکھتے ہو کیا کوئی خاص بات ہے؟“ رام داس کی جتنی سرسوتی نے اشتیاق سے پوچھا تو جواباً رام داس بولا۔

”بھگوان بات ہی ایسی ہے تم سنو گی تو تمہاری خوشی بھی دو چند ہو جائے گی۔“

”ایسی کیا خاص بات ہے؟“ ذرا مجھے بھی بتلاؤ۔“ سرسوتی کے پوچھنے پر رام داس بولا۔

”وہ اپنے ہٹا کر صاحب ہیں نا چندر رام؟ ان کو اپنی پریتی کی آواز کی سندر تا کا پتہ چلا ہے وہ چاہتے ہیں کہ پریتی ان کی حویلی میں آکر انہیں اپنی سندر آواز میں گانا سنائے اگر انہیں پریتی کی آواز پسند آگئی تو وہ پریتی کو بہت کچھ دیں گے بلکہ جب بھی ان کا دل چاہے گا وہ پریتی کو بلا کر اس کا گانا سنیں گے اور دل کھول کر نوازیں گے۔“

رام داس نے ایک ہی سانس میں اسے اپنی خوشی کی وجہ بتائی تو جواباً سرسوتی خاموش ہو گئی۔

رام داس نے حیران ہو کے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھی تو وہ شکر سے انداز میں بولی۔ ”پریتی کے باپو تم جانتے ہو کہ ہٹا کر کس طبیعت کا آدمی ہے وہ ایک عیاش آدمی ہے اور نہ جانے کتنی لڑکیوں کی عزت روند چکا ہے مجھے پریتی کا رن خطرہ ہے کہ اگر ہٹا کر نے ہماری پریتی کو نقصان پہنچا تو ہم کیا کر سکیں گے؟ میں اپنی پریتی کو کسی صورت حویلی نہیں بھیجوں گی۔“

زمین آسان ایک کرنے شروع کئے تو سرسوتی نے اس کو ٹوک دیا۔

”بس بس..... میری زبان نہ کھلاؤ، سارا پنڈ جانتا ہے کہ یہ ہٹا کر ہی تھا جس نے پرنام سنگھ کی چھوری مادھوری کی عزت لوٹی تھی اور سزا اس بے چارے غریب گوپال کودی اور بعد میں مادھوری کے گھر والوں کو اتنی دولت دی کہ وہ بے چارے اسے ہٹا کر کا احسان سمجھتے رہے۔“

”تم بھی ہٹا کر کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو وہ اتنا اچھا نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو اس کے کالے کرٹوت حویلی کی اونچی دیواروں میں دب جاتے ہیں لیکن کب تک.....؟ بھگوان جلد ہی اس باپ کا چہرہ بے نقاب کرے گا۔“

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ رام داس بیزار سے بولا۔ ”اتنے اچھے آدمی کو محض غلط فہمی کی بنیاد پر اتنا برا کہہ رہی ہو۔ تم جو بھی کہو میں جلد ہی پریتی کو حویلی لے کر جاؤں گا اگر ہٹا کر کو پریتی کی آواز پسند آگئی پھر تو سمجھو وارے نیارے۔“

رام داس اپنی ہی من میں بولے چلے جا رہا تھا جبکہ سرسوتی کے چہرے پر فکر و تدبیر کی لکیریں جتنی جاری تھیں۔

ایک دن پریتی اپنی سکھیوں کے ساتھ جھولا جھولنے میں مگن تھی ساتھ ساتھ اس کی سریلی آواز ماحول کو بہت خوبصورت بنا رہی تھی اس کی سکھیاں بھی خاموشی سے اس کی آواز کی سندر تا کو اپنے اندر اتارنے میں مصروف تھیں۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا، وہ جب بھی اپنے گھر سے ذرا دور ان گھنے درختوں پر پڑے جھولوں میں جھولا جھولنے جاتیں اس کی سکھیاں ٹھیلے کودنے کی بجائے بڑی محویت سے اس کا گانا سنتی تھیں۔ لاجوتی کہتی تھی۔ ”پریتی تیری آواز کانوں میں رس سا گھول دیتی ہے منش کو سنا رہے بے گانہ کر دیتی ہے۔ منش تو منش ہوائی مخلوق بھی یقیناً تیری آواز کے سحر میں کھوجاتی ہوں گی تو ایسا کیا کر ان درختوں کے نیچے

یا ویران جگہوں پر اپنی آواز کا جادو نہ جگایا کر کسی دن کوئی جن عاشق ہو گیا تو پھر تو کوئی کام سے۔“

اور پریتی ہنس کر اس کی بات کو نال جاتی تھی۔ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے لڑکیاں اپنی دنیاؤں میں مگن کسی بات پر توجہ ہی نہیں دیتی ہیں انہیں جس کام سے منع کیا جائے وہی ان کی ضد بن جاتا ہے پریتی نے بھی لاجوتی کی بات کو مذاق میں اڑا دیا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن یہ بات سچ ہو کر رہے گی۔

اس دن بہت گرمی تھی پریتی کو گھر میں گھبراہٹ ہوئی تو وہ ان گھنے درختوں کی جانب چل دی جہاں وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ جھولا جھولتی تھی اس نے سوچا کہ وہاں درختوں کی چھاؤں میں کچھ دیر بیٹھنے کی تو گری سے نجات مل جائے گی اس وقت کوئی سکھی بھی اس کے ساتھ موجود نہیں تھی وہ جھولے پر آ کے بیٹھ گئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کی طبیعت میں خوشگواریت پیدا کر دی اور اس نے اپنی مدھڑا آواز کا جادو جگانا شروع کر دیا۔

ہٹا کر کا ملازم گوبی جو کسی کام سے ادھر سے گزر رہا تھا اتنی سندر آواز سن کر ٹھٹک گیا وہ دبے قدموں ادھر کی اور بڑھا جہاں سے وہ آواز آ رہی تھی گوبی نے حیرانی سے جھولے پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا جو گوبی میں کام کرنے والے ملازم رام داس کی چھوری تھی۔ حیرانی اسے اس کی آواز سے ہوئی تھی اتنی سندر آواز اس نے اپنی زندگی میں نہیں سنی تھی اور ہٹا کر چندر رام تو یہ آواز سن کر پاگل ہو جائے گا۔ اس نے سوچا وہ ابھی جا کر ہٹا کر کو آگاہ کرتا ہے کہ اتنی مدھڑی آواز ان کے اپنے پنڈ میں موجود ہے اور وہ شہر سے غریب عورتوں کی بھونڈی آواز کو سننے کے لئے اتنی رقم خرچ کرتا ہے وہ یہ سوچ کر واپسی کے لئے مڑ گیا۔ پریتی کو اس کے آنے اور جانے کی خبر بھی نہ ہوئی وہ تو بس اپنے آپ میں مگن تھی یہ جانے بنا کہ کوئی اور بھی اس کو بہت حیرت سے دیکھ رہا ہے۔

جس درخت پر وہ جھولا جھول رہی تھی اسی کی ایک شاخ پر وہ بیٹھا تھا، وہ پریتی کو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ پریتی کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا اور اس کی آواز کی

کو وہاں دیا تھا اور آئندہ کے لئے محتاط ہو گیا تھا۔

گوپی کے منہ سے رام داس کی چھوری کی تعریف سن کے اس کے منہ میں مانی بھر آئی اسے یہ مرحلہ بہت آسان لگا وہ رام داس کو حکم دے کر کسی بھی وقت پر جی کو حویلی بلا سکتا تھا اور پر جی کو دولت کالا لے دے کر یا دھکی وغیرہ دے کر بآسانی اپنی مرضی کر سکتا تھا۔

اس وقت بھی وہ گونی سے اس موصوع پر بات کر رہا تھا اور گونی بڑھ چڑھ کر اسے مشورے دے رہا تھا۔
 ٹھاکر چندر اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور اس کی آنکھیں کثرت شراب نوشی سے سرخ ہو رہی تھیں لیکن وہ مکمل ہوش میں تھا۔

”اوئے گوپی۔“ اس نے اپنے سامنے ہاتھ باندھے گوپی کو مخاطب کیا۔

”تو جب بھی کوئی خبر لاتا ہے بڑی اچھی خبر لاتا ہے تجھے اپنا خاص ملازم بنایا ہوا ہے اور پھر تیری تو اپنی بیوی بہت رسیلی ہے، میں تو اس کو کبھی حویلی میں ملا چکا ہوں۔ گوپی تو گھر کی مرغی کو چھوڑ کر ادھر ادھر منہ کیوں مارتا ہے۔؟“ تھا کر کے لہجے میں چھپی مفتی خیزی کو سمجھ کر گوپی مسکرایا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

”ٹھا کر صاحب..... آپ تو جانتے ہیں
 “گھر کی مرغی وال برابر۔ وہ مرغی تو مجھے روز نصیب
 ہوتی ہے اس لئے جی ادب سا جاتا ہے اس لئے وال
 کو منہ مارنا پڑتا ہے تاکہ کچھ تو منہ کا ذائقہ تبدیل ہو۔“
 گوپی کے جواب پر ٹھا کر کے منہ سے تہقہہ نکل
 گیا اور خوب ہسنے کے بعد وہ بولا۔ ”بہت ہوشیار
 ہو گیا ہے، لگتا ہے وال کچھ زیادہ ہی راس آگئی ہے ایسا
 کرام داس کو میرا پیغام پہنچا دے کہ جب میرا حکم ہوو
 اپنی چھوری کو لے کر حویلی آجائے ہم اس کا گانا
 سننا چاہتے ہیں۔“
 ”اور ہاں۔“ گوپی جیسے ہی باہر جانے کے لئے
 مڑا ٹھا کر چند ررام بولا تو گوپی رک گیا اور سوایہ لگا ہو
 سے ٹھا کر کی طرف دیکھنے لگا۔ ”آج رات اپنی جی کو حویلی

دوسرے دن گوپنی کو کنبھو کی بجائے ٹھاکر نے
 رام داس کو خود بلوا کر اس کی چھوری پر بیتی کو حویلی میں
 لانے کے لئے کہا۔ جب رام داس نے یہ خبر اپنی بیٹی کو
 سنائی تو وہ خوش ہونے کی بجائے پریشان ہوئی لیکن وہ کیا
 کر سکتی تھی۔ شام سے پریتی کو لازماً ٹھاکر کی حویلی جانا
 پڑتا۔ اس نے بھگوان سے پریتی کی سلامتی کے لئے
 براہنمائی اور خاموش ہو گئی۔

پڑتی اپنے کمرے میں پر سکون سو رہی تھی کہ اسے کسی نے اتنے پیار بھرے انداز میں پکارا کہ اس کی نیند فوراً اڑن چھو ہو گئی۔ کمرے میں تار کی جھیل ہوئی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اُن جھنسن پھاڑ کر حیرت سے ارد گرد دیکھنے لگی اسے حیرانگی ہو رہی تھی کہ اسے کس نے پکارا ہے.....؟ حالانکہ آواز بہت نرم اور مدھم تھی لیکن اس کے باوجود وہ گہری نیند سے کس طرح اچانک بیدار ہو گئی؟ پھر اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو یہ سوچ کر وہ پھر سے لیٹنے لگی کہ وہ آواز دوبارہ سے سنائی دی کسی نے اسے بہت پیار سے پکارا تھا۔

وہ خوف زدہ انداز میں اوپر اوپر دیکھنے لگی اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی اچانک اسے اپنے بالوں میں کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا کوئی نا دیدہ ہاتھ آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اور وہ دنیا و مافیہ سے بے خبر ہوتی جا رہی تھی پھر اس کے کانوں میں وہی دلکش آواز گونجی۔

”تمہیں مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا بلکہ تمہاری حفاظت کروں گا۔“

”لیکن..... تم ہو کہوں.....؟ اور بند کمرے میں
کس طرح آئے۔“ پریتی مدہوش سی آواز میں اس
نادیدہ وجود سے پوچھ رہی تھی۔ کچھ دیر تو پر اسرار سی
خاموشی رہی چھوڑ بولا تو پریتی کو اپنے کانوں میں رس
گھلتا محسوس ہونے لگا۔

”میرا تعلق قوم جنات سے ہے سین ہم سرکش جنوں میں شائبہ نہیں ہوتے جو انسانی وجود پر اپنا قبضہ جمالیات میں اور انہیں ہر طرح کی تکلیف دینے سے باز نہیں آتے لیکن ہمارے فیملے کا یہ دستور ہے کہ جو بھی جن کسی انسان کو تکلیف پہنچائے گا اس کی جانی طاقتیں سلب کر لی جائیں گی اور اسے سخت سزا دی جائے گی اگر وہ دوبارہ اس طرح کی حرکت نہ کرنے کا وعدہ کرے تب اسے معافی ملتی ہے۔“

حیرت انگیز طور پر اس کے جن ہونے کے باوجود پرتی کو اس سے کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پرتی کے سر سے ہٹائے تھے اس کی آواز تو آ رہی تھی لیکن وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”کیا تم میرے سامنے نہیں آ سکتے.....“ پریتی نے کسی نادیدہ نقطے پر نگاہیں جما کر کہا۔

”کیوں نہیں.....؟“ پھر ٹھنڈی ہوا کا اک جھونکا پریتی کے چہرے سے ٹکرایا اور سامنے بستر پر دوئیں کا اک مرغولہ بنے گا دھیرے دھیرے وہ مرغولہ اک ٹھوس انسانی وجود میں ڈھلنے لگا جب وہ بھولہ مکمل ہوا تو اک خوبصورت وجود پریتی کے سامنے تھا ویسے تو وہ بالکل انسان ہی دکھائی دیتا تھا لیکن اس کی ہنسنیں بہت ٹھنڈی اور آنکھیں کسی حد تک کانوں کی جانب مٹھنی ہوئی تھیں قطع نظر اس کے وہ بلاشبہ بہت حسین مرد تھا، پریتی نے آج تک اتنا خوبصورت مرد نہیں دیکھا تھا وہ آنکھوں میں ستائش لئے یک تک اس کی طرف دیکھ رہی تھی اسے اتنی حمویت سے اپنی طرف تکتے پا کر اس کے یوں بردگش تبسم آٹھرا۔

”ایسے دیکھ کر تم یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ میں بہت خوبصورت ہوں؟ حالانکہ میں خود تمہاری آواز کا دیوانہ ہوں اور تمہارا یہ محسوس سا چہرہ.....؟ اسی وجہ سے تو میں تمہارے پاس رک گیا اور اب تو یوں لگتا ہے کہ میں کہیں بھی جا نہیں پاؤں گا۔“ اس کی بے قرار آواز پریتی کو کسی اور دنیا کی سیر کرانے لگی اس نے کب اتنے خوبصورت الفاظ میں کسی سے اپنی تعریف سنی تھی اس

کے بھر بھرے لیوں پر پاک الوہی سی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے جلدی سے نظریں جھکائیں اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا ایسے پہلے تو کبھی نہیں ہوا؟ پریتی نے دل میں سوچا ضرور لیکن کچھ کہنے سے باز رہی۔

”کیا تم مجھے اپنا دوست سمجھ سکتی ہو.....؟“ اس کے سوال پر پریتی نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی چمک سے خائف ہو کر پھر سے نگاہیں جھکائیں لیکن سرکواثبات میں ہلانا نہیں بھولی تھی۔

”تم نے مجھ سے میرا نام بھی نہیں پوچھا.....؟“ روزام نے پیار سے پریتی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو پریتی کو بھی خیال آیا۔

”تم نے اتنا موقع ہی کہاں دیا کہ میں تمہارا نام پوچھ سکوں۔ اب بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟“ پریتی نے معصومیت سے دریافت کیا تو جواب میں روزام نے اسے اپنا نام بتایا اور پھر سارا واقعہ اسے بتایا کہ کس طرح وہ اس کی آواز سن کر رک گیا اور اب وہ کہیں بھی نہ جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔

پریتی کو یہ فکر کھانے لگی کہ اگر گھر والوں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟ لیکن روزام نے اس کو بتایا کہ وہ غائب حالت میں اس کے ساتھ رہے گا کسی کو ذرا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ پریتی مطمئن ہو گئی پھر باتوں میں رات گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا۔

صبح وہ جلدی بیدار نہ ہو سکی تو اس کی مانتا نے اسے جگایا اور اسے بتایا کہ آج شام سے اسے ٹھاکر کی حوٹلی گانا سننے کے لئے جانا ہے۔ پریتی بہت حیران ہوئی کہ ٹھاکر کو کیسے پتہ چلا کہ وہ اچھا گاتی ہے؟ لیکن اسے ہر حال میں ٹھاکر کی حوٹلی جانا تھا کیونکہ علم عدولی کی سزا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ساتھ ساتھ اسے یہ بھی پریشانی تھی کہ پتہ نہیں ٹھاکر کس قماش کا آدمی ہوگا کیونکہ پنڈ والوں سے وہ بھی ٹھاکر کی فطرت کے بارے کچھ نہ کچھ سن چکی تھی اس لئے اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا وہ پریشانی کے عالم میں کمرے میں واپس آ گئی اور خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

اچانک روزام کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو وہ چونک گئی اس وقت وہ بالکل اسے فراموش کئے ہوئے تھی جب روزام نے اسے مخاطب کیا تب اسے اس کا خیال آیا۔ ”اتنی جلدی مجھے ذہن سے جھٹک دیا.....؟ ابھی تو میں تمہارے پاس ہوں جب چلا گیا تو بھلا تم کہاں مجھے یاد رکھو گی.....؟“ روزام کی آواز پر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”نہیں وہ دراصل.....“ اور پھر اس نے ساری بات روزام کو بتادی جواباً اس نے پریتی کو لمبی دی اور کہا کہ وہ فکر نہ کرے۔ ”میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں ہر وقت تمہارے ساتھ موجود ہوں گا وہ بے فکر ہو کر حوٹلی جائے۔“

اس کی بات پر پریتی کو ڈھارس ہوئی اور وہ ہر پریشانی کو ذہن سے جھٹک کر حوٹلی جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

ٹھاکر چندر رام نے تمام تیاریاں مکمل کر لیں تھیں اس نے اپنی خواب گاہ کو مزید خوبصورت بنوایا۔ گلابوں کی پتیوں بیڈ پر بکھیر دیں جن کی مہک نے پورے کمرے کو محسوس کر دیا تھا بیڈ کے آس پاس گلابوں کی لڑیاں لگوائیں جس سے کمرے کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کمرے کے رنگ سے ہم رنگ پردے اور بیڈ شیٹ کی محل نما کمرے کا تاثر پیش کر رہی تھی گویا کمرہ یوں تاثر پیش کر رہا تھا جیسے آج ہی کسی کی شادی کے لئے خصوصی طور پر سجایا گیا ہو۔

وہ جب بھی کسی شکار کو یہاں لاتا تو کمرے کو اسی طرح سجاتا تھا کمرے کا رومان پر در ماحول شکار کو شکار کرنے میں آسانی دیتا تھا اور جو آسان شکار نہ ہوتا اسے دولت کی چکا چونڈ دکھائی جاتی کچھ تو ہتھیار ڈال دیتیں اور کچھ اس کے باوجود بھی مشکل ثابت ہوتیں جنہیں وہ اپنے زور بازو سے فتح کر لیا کرتا تھا اور پریتی کے بارے میں بھی اس کا خیال تھا کہ وہ غریب لڑکی ہے دولت کی چکا چونڈ سے وہ زیادہ مزاحمت نہیں کرے گی اور جب گویا نے اسے پریتی اور اس کے پتا کے آنے کی اطلاع دی

تو اس نے جلدی سے ان دونوں کو اندر بلا لیا۔

گوپی بھی ان کے ساتھ ہی اندر آیا۔ جیسے ہی ٹھاکر چندر رام کی نظر پریتی کے سانولے لیکن پرکشش چہرے پر پڑی وہ اپنی آنکھیں جھپکاتا بھول گیا۔ ایسا حسن اس نے کہاں دیکھا تھا وہ دل ہی دل میں گوپی کو شاباش دے رہا تھا جس نے اتنا تکمیل شکار سے فراہم کیا۔

اچانک رام داس کی آواز گونجی تو وہ چونک گیا جو اپنی چھوری پریتی کو کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھاکر کو پر نام کرے اس کے کہنے پر پریتی نے ہاتھ جوڑ کر تمسکار کیا جواباً ٹھاکر نے اسے ایسی بھولی نظروں سے دیکھا کہ اس کا وجود کانپ گیا عورت فوراً مرد کی نظر کو پھیلان لیتی ہے کہ وہ کس زاویے سے دیکھ رہا ہے؟

لیکن رام داس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ تو بس اسی میں خوش تھا کہ ٹھاکر نے اسے اتنی عزت بخشی کہ اس کی بیٹی کو خصوصی طور پر بلایا جب ٹھاکر اچھی طرح پریتی کو نظروں سے ٹٹول چکا تو اس نے گوپی کو مخاطب کیا۔

”گوپی رام داس کو مہمان خانے لے جا اور اسے پوری عزت سے بیٹھا جو بھی طلب کرے فوراً حاضر کر۔“ اور اس کے ساتھ ہی گوپی کو آٹھ کا مخصوص اشارہ کیا تو وہ متنی خیزی سے سر ہلاتا اور رام داس کو ساتھ لیتا مہمان خانے کی جانب بڑھ گیا وہ ٹھاکر کے اشارے کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا رام داس کو اتنی شراب پیانی تھی کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جائے اور وہ کھل کر کھیل سکیں۔

جیسے ہی گوپی رام داس کو لے کر باہر نکلا ٹھاکر چندر رام نے ہوس بھری نگاہوں سے دیکھا اور آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا پریتی کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

”یہ آپ نے دروازہ کیوں بند کر دیا.....؟“ پریتی کے سہمے لہجے پر ٹھاکر نے شیشی نظروں سے اسے گھورا اور بولا۔ ”گھبراؤ نہیں مجھے تب تک گانا سننے میں مزہ نہیں آتا جب تک مکمل خاموشی اور سکون نہ ہو۔ تم ایسا کرو گانا شروع کرو۔“

یہ کہہ کر ٹھاکر پریتی کے بہت قریب بیٹھنے لگا تو وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور بولی۔

”معافی چاہتی ہوں ٹھاکر صاحب لیکن میں آپ کے اتنا نزدیک بیٹھ کر نہیں گا سکتی مجھے عجب سا لگتا ہے۔“

پریتی کی بات پر ٹھاکر زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ ”کوئی بات نہیں تم جس طرح کا سکتی ہو ایسے گاؤ۔“ یہ کہہ کر ٹھاکر نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی اور مدہوش نظروں سے پریتی کو دیکھنے لگا اور جب پریتی نے اپنی مدہوش آواز میں گانا شروع کیا تو ٹھاکر مدہوش سا ہو گیا اتنی سندر آواز اس نے کب اپنی زندگی میں سنی تھی۔

جوں جوں پریتی گاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی ویسے ہی ٹھاکر مدہوش سا ہوتا جا رہا تھا اور جب پریتی نے گانا ختم کیا تو کچھ دیر تو وہ یونہی پڑا رہا اور پھر ایک جھپٹے سے پریتی کی طرف بڑھا اس کے لبوں پر پریتی کی آواز کی تقریظوں کے پل تھے۔

پریتی کے قریب پہنچ کر اس نے جونہی پریتی کو اپنے بازوؤں میں بھرنا چاہا اس کے منہ پر پاک زوردار تھپڑ پڑا تو وہ جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا اور پھر جیسے ہی اس کی نظر پریتی کے پیچھے کھڑے وجود پر پڑی تو اس کے جسم پر کچھ سی طاری ہو گئی۔

پریتی کے پیچھے ایک انتہائی خوبصورت اور خوفناک آدمی کھڑا تھا اس کے منہ سے خون بہہ کر اس کے پورے جسم کو بھگور رہا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر خون کی ایک بوند بھی فرش پر نہیں گر رہی تھی جب وہ بولا تو اس کی آواز نے ارد گرد بھونچال پیدا کر دیا جبکہ پریتی کو معلوم ہو گیا کہ اس کے پیچھے یقیناً روزام ہو گا جو اپنی شکل بدل کر ٹھاکر کو خوف زدہ کرنے آیا ہے تاکہ وہ پریتی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ اس کی بھیا تک آواز نے ٹھاکر کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا، وہ بہت خوف زدہ ہو گیا۔ جبکہ روزام چند قدم آگے بڑھ کر ٹھاکر کے قریب آ گیا اور اپنی ڈراؤنی آواز میں ٹھاکر کو مخاطب کیا۔

”اوئے ٹھاکر..... تو کیا سمجھتا ہے کہ تو ان غریبوں



خودی کا قاتل

انقصی رباب- فیصل آباد

بزرگ نے حیرت کی کیفیت میں جواب دیا۔ آج ہم ایک ایسے معمر میں پھنس گئے ہیں جس کا کوئی حل ہمیں نہیں مل رہا۔ ایسا ہم نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آخر بات کیا ہے جو کہ ہماری ریاضت کے باوجود سمجھ سے بالا تر ہے۔

جاہت خلوص اور توکل کی ایک دلفریب من موئی داستان اہل دل کے لئے سوغات

انجلیکا اپنے بستر پر نیم دراز چھت کو دیکھنے میں مگن تھی چھت اس کے سامنے رنگ بدل رہی تھی کبھی سرخ کبھی سفید کبھی سیاہ گراس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کے ساتھ آج کل ایسے حیرت انگیز واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ وہ جس چیز کو بھی زیادہ غور سے اور دھیان سے دیکھتی اسے وہ چیز اپنی ہیئت بدلتی محسوس ہوتی۔ ہر ایک چیز اسے جاندار، سانس لیتی ہوئی نظر آتی۔ اپنے بستر اور دیواروں سمیت ہر ایک چیز جسے لوگ بے جان سمجھتے، اسے ہر اس چیز میں جان نظر آتی۔ ہر ایک ساکت چیز بھی سانس لیتی محسوس ہوتی۔ اگر وہ اپنی می یا ڈیڈ سے بات کرتی اپنے محسوسات کے بارے میں تو وہ لوگ سمجھتے کہ شاید اس کے ساتھ کوئی دماغی مسئلہ ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کوئی اس کا اعتبار نہیں کرے گا۔ وہ کسی کو بھی وہ

میں گونجی اس نے گونپ کی طرف غضب ناک نظروں سے گھورا اور بولا۔

”تو اس دنیا کا سب سے بڑا بے غیرت ہے جو اپنی پتی کو اپنی خوشی سے ٹھاکر کے حوالے کرتا تھا اور دولت بٹورتا تھا لیکن اب وہ دولت تیرے کچھ کام نہیں آئے گی۔“ اس نے گونپ کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیئے بغیر اپنے ہاتھ آگے کر دیئے اور گونپ کے منہ سے اذیت ناک چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ٹھاکر چندر رام اور گونپ کی موت پر جہاں لوگوں نے بھگوان کا شکر ادا کیا تھا وہیں وہ حیران بھی تھے کہ ایسا کس نے کیا لیکن وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھے ان کے لئے سب سے بڑی بات ٹھاکر اور گونپ سے نجات تھی ٹھاکر کے پر پیوار نے بھی شکر ادا کیا کیونکہ وہ بھی ٹھاکر سے سخت ٹالاں تھے۔ لیکن خوف سے زبان نہیں کھولتے تھے۔ ظالم اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے۔

پریتی بہت اداس تھی کیونکہ روزام چلا گیا تھا اس کا واپس جانا بہت ضروری تھا اس نے پھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ پریتی کو اسی دن کا انتظار تھا لیکن ایک دن عجیب بات ہوئی ایک آدمی ان کے گھر آیا اس نے پریتی کو بلوانے کا کہا جب پریتی آئی تو اس نے اسے خوش خبری سنائی کہ وہ فلم کے میوزک کا پروڈیوسر ہے اسے گانے کے لئے کسی نئی آواز کی ضرورت تھی اور اسے پریتی کا پتہ چلا تو وہ یہاں چلا آیا کیونکہ ایک آدمی نے اسے یہاں کا پتہ دیا ہے پھر اس نے پریتی کو گانے کے لئے کہا، جب پریتی نے اسے گانا سنا یا تو وہ مسحور سا ہو گیا اور اسے فوراً اپنے گانوں کے لئے بک کر لی۔ کچھ دن بعد پریتی نے اپنے پر پیوار کے ساتھ ممبئی چلے جانا تھا اس پروڈیوسر نے انہیں فلیٹ دلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

پریتی حیران تھی کہ وہ آدمی کون ہو سکتا ہے اس پروڈیوسر کو اس کے بارے میں بتایا پھر اس کے ذہن میں روزام کا نام آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔



پر ظلم کے پہاڑ توڑتا رہے گا اور ایٹور خاموشی سے دیکھتا رہے گا۔ ایٹور صرف اس لئے خاموش تھا کہ شاید تو اپنی ان حرکتوں سے باز آ جائے اور ایٹور سے معافی مانگ لے لیکن نہیں۔ تو تو ظلم کرتے ہوئے بھول گیا کہ ایک تجھ سے بھی بڑا اوپر موجود ہے جو تیری ہر حرکت کو نوٹ کر رہا ہے لیکن وہ درگزر کرتا آیا اور تو نے اس خاموشی کو کچھ اور سمجھ لیا لیکن اب تیرے ظلم اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ایک لمحہ بھی اگر تجھے زندہ چھوڑا گیا تو تو یہ نہیں کیا کرے گا۔ اب اپنے انجام کے لئے تیار ہو جا۔ ایٹور ایک لمحے کے لئے بھی تجھے چھوڑنے پر تیار نہیں.....

”نہیں..... نہیں، بھگوان کے لئے مجھے کچھ نہ کہو، میں سارے برے کام چھوڑ دوں گا۔“ ٹھاکر چندر رام نے روزام کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

لیکن اب کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اس کا وقت پورا ہو چکا تھا اور ویسے بھی جب ظالم کو لگتا ہے کہ اس پر برا وقت آ گیا ہے تو وہ معافی مانگتا ہے اور اسے سندھ اچھا رہنے کا وعدہ کرتا ہے لیکن جب برا وقت مل جائے تو وہ پھر اپنے اصلی روپ میں آ جاتا ہے اور بھگوان سے کئے گئے وعدے کو بھول جاتا ہے جیسے ٹھاکر چندر رام۔

لیکن روزام نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر اپنے ہاتھ آگے کئے اس کے ہاتھوں سے تیز شعاعیں نکلیں اور ٹھاکر کے جسم میں پیوست ہو گئیں اس کے منہ سے اذیت ناک چیخوں کا طوفان پھوٹ پڑا۔ شعاعیں جہاں جہاں پڑیں وہاں سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھاکر نے اذیت کے عالم میں اپنی جان دے دی۔

پریتی آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جب ٹھاکر نے دم توڑ تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر رام داس اور گونپ دوڑتے ہوئے آئے اور اپنے آگے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئے اور جب ان کی نظر روزام کی خوفناک شکل پر پڑی تو ان کی آنکھیں باہر کو ابل پڑی۔ اچانک روزام کی آواز پورے کمرے

سب کیسے دکھا سکتی تھی جو وہ خود محسوس کرنے لگی تھی۔

پہلے اسے شکایت تھی کہ اس کے والدین اپنی اپنی مصروفیت کی وجہ سے مصروف رہتے ہیں اور اسے زیادہ وقت نہیں دیتے اور جس وقت وہ گھر ہوتے وہ خوب جی بھر کر انجوائے کرتی مگر اب صورتحال بدل گئی تھی۔ اب انجلیکا اپنے والدین کے گھر میں موجودگی کو بھی زیادہ اہمیت نہ دیتی۔ اسے بہن بھائیوں سے تو وہ پہلے ہی زیادہ گھل مل کر نہیں رہتی تھی کیونکہ وہ ان کی سوتیلی بہن تھی۔ مگر انجلیکا اس بات سے بے خبر تھی۔ کیونکہ اس کی سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کا رویہ اس کے ساتھ اگر بہت اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ وقت تنہائی میں گزارتی۔ ہر وقت خود کو اپنے کمرے میں بند رکھتی۔ ایک دو بار انجلیکا کے والدین نے اس بات کو محسوس بھی کیا مگر اپنی دفتری اور سوشل لائف کی مصروفیات میں اس بات پر زیادہ دھیان نہ دے سکے۔ انجلیکا کی شکل تب ہی نظر آتی جب وہ اسکول جانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلتی یا اسکول سے واپس آتی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ کھانا بھی اس کے کمرے میں ہی جاتا۔ اور کمرے میں یا تو وہ اپنا اسکول کا کام کرتی یا پھر ہر چیز کو نور سے بغیر چمکیں چھکائے دیکھتی رہتی۔ جیسے وہ سب چیزیں اس سے بے محاسن ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اکثر دیوار پر کچھ نقوش اور پتھر تریں ابھرتییں مگر انجلیکا ان تحریروں کو ٹھیک طور پر پڑھنے سے قاصر تھی اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا تھا وہ سمجھنے سے بالاتر تھی۔ دل ہر چیز سے جیسے اچاٹ ہوتا جاتا تھا۔

ایک دن اسکول سے واپس آتے ہوئے راستے میں اس کی مدھیٹر ایک بارش بزرگ سے ہو گئی۔ بزرگ ایک دم سے اسے دیکھ کر چونک گئے انجلیکا بھی ان سے بہت متاثر نظر آئی ان کا باوقار روحانی نور سے مزین چہرہ اسے بہت خوبصورت لگا۔ بزرگ نے شفقت سے پوچھا۔ ”بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟“ انجلیکا نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔ ”میرا نام انجلیکا ہے۔“ یہ سن کر بزرگ کا چہرہ حیرانگی کے

بحر و بر میں غوطہ زن نظر آیا۔

انجلیکا کو بزرگ کی آنکھوں میں واضح طور پر حیرانی اور کشش کے آثار نظر آئے۔ انجلیکا چاہتی تھی کہ وہ بزرگ اس سے اور بات کرے مگر وہ بزرگ خاموشی اور حیرانی اپنے پر لئے آگے کو بڑھ گئے۔ انجلیکا وہیں چپ چاپ کھڑی اس بزرگ کو جاتے دیکھتی رہی۔ اور جب وہ نظر آتا بند ہو گئے تب اس نے گھر کی طرف قدم بڑھا دیا۔

بزرگ مسجد میں پہنچ کر خاموش تھے۔ ان کے ایک شاگرد نے ادب سے عرض کیا۔ ”اے پیر و مرشد! آپ کو اتنا خاموش ہم نے بھی نہیں دیکھا۔“ بزرگ نے حیرت کی کیفیت میں جواب دیا ”آج ہم ایک ایسے معمر میں پھنس گئے ہیں جس کا کوئی حل ہمیں نہیں مل رہا۔ ایسا ہم نے آج سے پہلے بھی نہیں دیکھا۔“

”پیر و مرشد! یقیناً یہ کوئی بہت بڑی بات ہوگی جس نے آپ کو حیرت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی جانا چاہتا ہوں کہ ایسی انہونی بات کیا ہے؟“

”ہمیں آج راستے میں ایک بچی ملی جس کا نام انجلیکا ہے۔ مگر جس طرح وہ رومانیت کی سیڑھی پر قدم رکھتی مجھے نظر آئی۔ ویسے ممکن نہیں ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے نور کا سن تو نور ہی طے کر سکتا ہے آج ہم اس کے بارے میں استعارہ کریں گے ہم حقیقت جانتا چاہتے ہیں کہ آخر بات اصل ہے کیا جو ہماری اتنی ریاضت کے باوجود ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم خود کو بہت صاحب علم خیال کرتے تھے مگر ایک چھوٹی سی بچی نے ہمیں الجھا دیا ہے کہ ہم اس کے سامنے چھوٹے ہیں۔“

شاگرد بھی اپنے پیر و مرشد کی یہ بات سن کر حیران ہو گیا۔

ادھر انجلیکا آج کچھ سکون محسوس کر رہی تھی۔ جو بے چینی بے سکونی اور اضطراب اسے ایک پل کا سکون نہیں لینے دیتا تھا آج اس کا اضطراب جیسے ٹھم سا گیا تھا۔ دل کو قراں محسوس ہو رہا تھا آج وہ خوش تھی

اور انجلیکا کو محسوس ہوا کہ یہ سکون صرف اور صرف اس بزرگ ہستی کی وجہ سے نصیب ہوا ہے۔ اس نے پختہ تہیہ کر لیا کہ صبح انہیں ضرور تلاش کرنے کی کوشش کرے گی اور اس کا خدا اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اس بات کو پختہ ارادہ کر کے وہ سو گئی۔

آج انجلیکا کو اسکول جانے کی بھی جلدی تھی تاکہ واپسی پر اس بزرگ کو ڈھونڈ سکے۔ واپسی پر اسے وہ بزرگ وہیں کھڑے دکھائی دیئے بزرگ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر معصوم مسکراہٹ کھل اٹھی۔ بزرگ بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیئے۔

انجلیکا ان کے پاس پہنچ کر دلی جوش سے بولی۔ ”مجھے آپ سے ملنے کی بہت خواہش تھی۔ آپ مجھے یہاں نظر نہ آئے تو میں آپ کو ڈھونڈنے نکل پڑتی۔“ بزرگ احمد شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا۔ ”انجلیکا بیٹا تمہارے کمرے میں ایک الماری ہے اسے آج جا کر اچھی طرح دیکھنا۔ تم کو اس میں سے کچھ ملے گا۔“

انجلیکا نے حیرانی سے پوچھا کہ ”کیا ملے گا مجھے؟“

”یہ تم خود جا کر دیکھو بیٹا۔“ یہ کہہ کر بزرگ وہاں سے چل پڑے۔ انجلیکا حیرت اور دل میں طرح طرح کے خیالات سوچتے گھر کی طرف بھاگی آج پہلی بار وہ گھر کی طرف دوڑ کر جا رہی تھی۔ اسے اپنے کمرے میں پہنچنے کی جلدی تھی کمرے میں جاتے ہی اس نے اپنا بیک بستر پر پھینکا اور الماری کے پاس پہنچ کر اس سے کہا تمہارے اندر ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتی مجھے دو۔ الماری کا دروازہ کھلا اور کوئی چیز اس کے پاؤں پر گر گئی اور الماری کا دروازہ بند ہو گیا اس نے جھک کر دیکھا تو ایک ڈائری تھی انجلیکا حیران ہو گئی کہ یہ کس کی ڈائری ہے۔ تجسس سے مجبور ہو کر انجلیکا نے ڈائری پڑھنی شروع کر دی یہ کسی اسماء نامی لڑکی کی ڈائری تھی۔ وہ مسلمان تھی مگر اس نے محبت میں مبتلا ہو کر

گناہ

جس گناہ سے عمر کم ہوتی ہے وہ ماں سے ”بدسلوکی“ ہے۔ جس گناہ سے انسان پر لعنت ہوتی ہے وہ ”جھوٹ“ ہے۔ جس گناہ سے دنیا ہی میں پکڑ ہوتی ہے وہ ”ظلم“ ہے۔ جس گناہ سے رزق تنگ ہو جاتا ہے وہ ”زنا“ ہے۔ جس گناہ پر پردہ فاش ہو جاتا ہے وہ ”نشر“ ہے۔ جس گناہ سے پوری انسانیت تباہ ہو جاتی ہے وہ ”قتل“ ہے۔ جس گناہ سے ”نعتیں چھن جاتی ہیں وہ ”تکبر“ ہے۔ جس گناہ سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں وہ ”حرام خوری“ ہے۔ جس گناہ سے عبادتیں ضائع ہو جاتی ہیں وہ ”بدعت“ ہے۔ جس گناہ سے جنت حرام ہو جاتی ہے وہ ”شرک“ ہے۔ (ابن حبیب خان۔ کراچی)

ڈیوڈ سے شادی کر لی وہ حیران رہ گئی کہ ڈیوڈ تو اس کے باپ کا نام ہے۔ مگر اس کی ماں کا نام تو ایسی ہے یہ اسماء کون ہے پھر؟

جوں جوں وہ ڈائری پڑھتی گئی حیرت کی وادی میں اترتی گئی۔ اسماء اس کی ماں تھی۔ جب انجلیکا اس دنیا میں آنے والی تھی ایک دم سے اس کی ماں کے اندر اپنے مذہب سے محبت بیدار ہو گئی اور اس نے کثرت سے نمازیں اور نوافل، ذکر و افکار کا آغاز کر دیا۔ اس کی دن رات اللہ سے دعا تھی کہ اس کی بیٹی روحانیت کے اس مقام پر پہنچے جہاں لوگ زندگی بھر کی ریاضتوں کے بعد بھی پہنچ نہیں پاتے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ اللہ نے میری توبہ قبول کر لی۔

انجلیکا حیران رہ گئی کہ یہ سب جو اس کے ساتھ ہوتا ہے وہ اس کی ماں کی دعا کا نتیجہ ہے۔ اگلے دن اسے بزرگ سے ملنے کی جلدی تھی ہزاروں سوال تھے جو اس کے دل میں پھل رہے تھے۔ وہ اسلام کے بارے میں جانتا چاہتی تھی۔ ان بزرگ نے کہا۔ ”اگر وہ پاکستان جاسکے وہاں ایک روحانی پیشوا ہیں وہ اس کی

مرد کریں گے۔ وہاں رہ کر وہ مذہبی تعلیم بھی حاصل کر سکتی ہے اور روحانی منزلیں بھی ستر کر سکتی ہے۔“

اس نے حامی بھری کہ اسے اپنی ماں کی خواہش کو پورا کرنا تھا اب اس نے اپنے باپ ڈیوڈ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا جب اس نے ڈیوڈ سے بات کی تو حسب توقع وہ غصے سے چٹنے چلانے لگے مگر جو بی ڈیوڈ کی آنکھیں انجلیکا کی آنکھوں سے ملیں۔ انجلیکا کی آنکھوں سے خیال کی لہر برقی رو کی طرح ڈیوڈ کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی۔ اب ڈیوڈ ایسے خاموش تھا جیسے کچھ نہیں ہوا۔ انجلیکا جانتی تھی اب ڈیوڈ وہی کرے گا جو وہ اس سے کروانا چاہتی ہے۔ ارتکاز افکار کی شق کئی مرتبہ وہ کچلی تھی ڈیوڈ نے ہنسی خوشی اسے پاکستان بھجوا دیا۔ بزرگ نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ وہ یہاں ایک دینی مدرسے میں پہنچ گئی۔ اس کا نام انجلیکا سے بدل کر اقراء رکھ دیا گیا۔ وہ مذہب میں ڈھلنے لگی۔

”آج نماز پڑھتے ہوئے میرے ساتھ عجیب بات ہوئی ہے۔“ اقراء مدرسے کے ختم صوفی رحمن سے گویا ہوئی۔

”کیا بات ہوئی؟“ صوفی رحمن نے حیرت سے پوچھا۔

”نماز پڑھتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے میں چھوٹی ہو رہی ہوں اتنی چھوٹی کہ کم ہوتے ہوتے میرا سائز چوٹی کے سائز سے بھی چھوٹا ہو گیا پھر اس سے بھی چھوٹا، پھر اور چھوٹا اور پھر میں زمین میں اترنے لگی۔ نیچے اور نیچے شاید پاتال میں۔“ اقراء نے گہمراہے ہوئے انہیں اپنی کیفیت بتائی۔

صوفی صاحب ششدر رہ گئے انہوں نے اقراء کو تسلی دے کر بھیجا۔ اب اقراء کے ساتھ اکثر ایسا ہونے لگا کہ کبھی تو وہ پاتال کی گہرائی میں تارتا خود کو محسوس کرتی اور کبھی آسمان کی بلندی تک جاتا۔

اس طرح آج کل وہ ایک نئے روحانی تجربے سے دوچار تھی۔ جو تجربہ بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ اب اسے عجیب الحلقہ وجود واضح نظر آتے۔ کچھ تو اتنے بھیا تک ہوتے کہ اس کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ جاتیں۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ ہر انسان کے ساتھ ایسی چیزیں موجود تھیں۔ شاید عام لوگوں کو نظر نہیں آتا مگر قدرت نے ہر کلمہ گو کے گرد ایک حفاظتی حصار رکھا ہے تاکہ شیطین اس کے پاس نہ آسکیں۔ مگر بہت کم تھے جن کا وہ حفاظتی حصار موجود تھا اور نہ سب کا حفاظتی حصار صرف یہ کڑوٹ چکا تھا بلکہ ایک بہت خوفناک وجود بھی تھا جو ان کی روح کا خون پی رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خونی بلا لوگوں کی روحوں کو کمزور سے کمزور تر کرتی جا رہی تھی مگر جن کی روح کے ساتھ یہ سلسلہ جاری تھا انہیں تو اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ خونی بلا انہیں اندر سے کتنا کھوکھلا کر چکی ہے ان کی روح کیسے جاں بلب ہے۔ انہیں کیوں اس کا علم نہیں ہو رہا آخر۔ مگر اس بات کا جواب اسے کون دیتا؟ کسی کو یہ بلا، یہ خون آشام بلا، یہ ویسپائر نظر ہی نہیں آ رہے تھے جو اتنا بڑا نقصان کر رہے تھے آہستہ آہستہ ان کے جسم و روح کی طاقت کو کھینچ کر انہیں کمزور کر رہے تھے۔ آخر وہ ایک ویسپائر سے مخاطب ہوئی۔ ”تم کون ہو؟ اور کیوں اس شخص کو جسمانی و روحانی دونوں طرح سے کمزور کر رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”میں وہ شیطانی ہوں جو اس کے اپنے اندر موجود ہے۔ اس کی اپنی کوتاہیوں اور اسلام سے دوری کی وجہ سے میں اس کی روح کی ساری طاقت ختم کرتا جا رہا ہوں اگر یہ مسلمان ہوتا تو میں، تو میں اس کے پاس سے بھی گزرتا تو میں اذیت میں مبتلا ہو جاتا اور اس مسلمان سے پناہ کے پکر میں کہیں دور بھاگ جاتا کہ میرا وجود ختم نہ ہو جائے۔ مگر اللہ کے ذکر سے دوری اور غلط اعتقادات نے اس کا حفاظتی کورٹوڑ دیا۔ اور اب یہ خود کو خود ہی دھیرے دھیرے مار کر میری غذا کا سامان فراہم کر رہا ہے میں اس کو ختم نہیں کر رہا یہ خود اپنا قاتل بن رہا ہے اب میں اتنا اچھا بھی نہیں کہ یہ مجھے خود اپنے آپ کو میرے سامنے پیش کرے اور میں افکار کروں، ہم سب تو زندہ ہی ان لوگوں کے گناہوں اور برائیوں کی وجہ سے ہیں۔ یہ جتنے گناہ کرتے ہیں ہم اتنا ہی طاقتور ہوتے ہیں۔“

اقراء یہ سب سن کر حیران ہو کر رہ گئی۔ کہ اگر اس آدمی سے کوئی مانگے کہ تمہارا تھوڑا سا خون چاہئے تو شاید یہ کبھی نہ دے مگر یہ شیطان جو دن رات اس کے ساتھ ہے اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے اور دن رات اس کا خون چوس رہا ہے اپنے لیے بھی ایک دانہ تو اسے اسے تو اس کا احساس بھی نہیں کہ یہ دن رات کیسے موت کے منہ میں جا رہا ہے۔

وہ اپنی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی کہ کیسے لوگ مذہب سے دوری اور اپنے اعمال کے باعث ان خون آشام بلاؤں کے زیر تسلط تھے۔ اور وہ جادو گروں کے پاس دوڑ رہے تھے جو ان کے مرض کو کسی ان کے رشتہ داروں کے جادوؤں کا نتیجہ قرار دے کر اور ان کے جادو کی کاٹ کے نام پر لمبی چوڑی رقیں وصول کر رہے تھے۔ کہیں وہ دیکھ رہی تھی انسانوں کے اندر خوفناک اژدھے پل رہے تھے جن کی خوراک انسانی غصہ تھا۔ اور وہ اپنی پسینہ کی خوراک کھا کر اتنے مضبوط اور طاقتور ہو چکے تھے کہ اس نے انسان کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اور یہ انسانی اژدھا اتنا بے لگام تھا کہ اس کے اپنے ہی بچوں، بیوی باپ، ماں، عزیز و اقارب کو کھاتا جا رہا تھا اور انسان اتنا کمزور اور بے بس تھا جیسے اس اژدھے کا غلام بن چکا ہے۔ یہ کئی فٹ لمبا تھا اور اس نے انسان کے گرد اپنا حصار قائم کر رکھا تھا اور اسے لگا تار تنگ سے تنگ کرتا جا رہا تھا۔ اور اس انسان کو احساس تک نہیں تھا اس کے اپنے اندر اس کے اپنے خون سے ایک خطرناک اژدھا پل رہا ہے۔ جو اس کے اپنی کو تو نگل رہا ہے مگر کسی دن اچانک اسے بھی نگل جائے گا۔

اب اقراء میں اتنی طاقت آچکی تھی کہ اس کی روح اس کے بدن سے الگ ہو کر جہاں چاہے جا سکتی تھی اور کچھ دیر کے بعد واپس اپنے بدن میں آ جاتی۔ اس دن بھی اس نے اپنی روح کو بدن سے الگ کیا اور پہاڑوں پر پہنچ گئی۔ یہاں وہ حالت استغراق میں تھی اپنے ذکاوت کا رکارڈ کرنے میں مجھتی اور ہر چیز سے بے گناہ

اپنے ہی ورد میں ڈوبی ہوئی۔ اس کا ورد ختم ہوا تو نجانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ وہ واپس لوٹی تو حیران رہ گئی کہ وہاں اس کا جسم موجود نہیں تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کے جسم کو مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا ہے اس کی روحانیت اس کے لئے سزا بن گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا کرے کہاں جائے؟

اتنے میں اس کی تیسری آنکھ نے دیکھا ایک اسپتال میں ایک مردہ بچہ، نرسس باتیں کر رہی تھیں کہ اس عورت کو جب پتہ لگا کہ اس کا بچہ مردہ ہے تو یہ تو مرجائے گی اس کا شوہر اور گھر والے تو پہلے ہی ایک ایکسڈینٹ میں مر چکے ہیں بس اس بچے کے سہارے تو یہ بد نصیب زندہ تھی۔

اقراء نے فوراً فیصلہ کر لیا اور اس بچے کے جسم میں داخل ہو گئی بچے نے سانس لینا شروع کر دیا۔ وہاں موجود ڈاکٹر اور نرسس حیران رہ گئیں۔ یہ ان کی میڈیکل ہسٹری کا پہلا واقعہ تھا کہ ایک مردہ بچہ اچانک زندہ ہو گیا تھا سب حیرت کے ساتھ خوش بھی تھے کہ اس عورت کو جینے کا بہانہ مل گیا اب اس بچے کے سہارے یہ زندہ رہ پائے گی۔

اقراء سوچ رہی تھی ہم لوگ اللہ کے سوا اور سہارے کیوں ڈھونڈتے ہیں آخر؟ کیوں فانی چیزوں اور انسانوں پر بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔

سب کو معلوم ہے اپنی اصل کا، اپنی منزل کا پھر بھی خود کو کھوکھ دیتے ہیں اس عورت کی ساری امیدیں اس بچے سے وابستہ ہو گئیں ہمیشہ کی طرح یہ اس بار بھی اپنے خالق کو بھول گئی اسے اپنا سہارا نہیں سمجھا شاید اب یہ لوگ صمم، بکم، عصی کی عملی تفسیر بن چکے ہیں جن جن کے دلوں پر، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی اب یہ لوگ ہدایت کے راستے کی طرف شادی نہیں آئیں گے۔



وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

حکیم وقار نے کتاب روشنی کا سفر پڑھ کر ختم کی تو رولو کا بولا۔ مصنف نے واقعی کمال کر دیا ہے، بہت اچھی اور بالکل حقیقی واقعات بیان کئے ہیں، بہر حال بہت مزہ آیا کوئی اور اچھی کتاب ہو تو ضرور سنا بیٹے گا۔ یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ آپ فکر نہ کریں میں کوشش کروں گا کہ کوئی اور اچھی کتاب آپ کو پڑھ کر سناؤں اور ہاں یاد آیا، حکیم وقار نے کہا۔ ایک صاحب آئے تھے بہت پریشان تھے اور باتوں باتوں میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، ان کی عمر تو اسی سال ہے مگر دیکھنے میں وہ ساٹھ کے لگتے ہیں، انہوں نے یہ لفاظی اور یہ ڈانری دی ہے ان کا کہنا ہے کہ میں نے سارے واقعات ڈانری میں درج کر دیئے ہیں، رولو کا نے ڈانری لی اور اپنے کمرے میں آ کر لفاظی کھول کر پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔ حکیم صاحب میرا نام پر تاب سنگھ ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی میں آزاد طبیعت کا مالک ہو گیا تھا۔ اسکول اور پھر کالج میں داخلہ لے لیا۔ ایک چھٹی میں میں گاؤں آیا اور اپنے دو چچا زاد بھائیوں کے ساتھ شکار پر نکل گیا۔ گاؤں سے تھوڑی دوری پر جنگل تھا۔ اس دن شکار نہیں ملا تو ہم نے واپسی کے لئے اپنے اپنے گھوڑوں کو موڑا، مگر پھر اچانک ایک ہرن نظر آیا تو چچا زاد بھائی سہیل نے ہرن پر گولی چلا دی، گولی ہرن کو لگی مگر ہرن لنگڑا تا ہوا بھاگا تو بھائی بھی اس کے پیچھے لگ گئے اور ہم دونوں بھی ان کے پیچھے بھاگے تھوڑی دور جا کر دیکھا تو سہیل بھائی بے ہوش پڑے تھے اور ان کے سامنے ایک سبز اٹھا جو کہ بہت ہی ہسیا تک شکل کا تھا۔ خیر بھائی کو کھانا کھ رہے تھے، گھر آ کر ان کی حالت بہت غیر ہونے لگی اور معلوم ہوا کہ ان پر ایک بھنگی بوٹی آتما اندرا سوار ہو گئی تھی، خیر اس آتما نے کئی کمروں کی بھیٹ لے کر بھائی کی جان چھوڑ دی۔ اس کے بعد میں کالج آ گیا۔ رولو کا نے یہیں تک پڑھا تھا کہ ایک ملازم آ گیا اور رولو کا سے بولا۔ حکیم صاحب آپ کو حکیم وقار بلا رہے ہیں۔ رولو کا اٹھا اور ملازم کے ساتھ حکیم وقار کے کمرے میں آ گیا۔ حکیم وقار کے سامنے ایک صاحب اور ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ بہر حال رولو کا ان دونوں کو اپنے کمرے میں لے کر آ گیا اور ان کی روداد سننے لگا۔ اس لڑکی جس کا نام خوشبو تھا۔ اس پر ایک جن زادہ عاشق ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے سارے گھر والے بہت پریشان تھے، رولو کا نے باپ بیتی کو تسلی دی اور بولا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں میں کوشش کروں گا کہ اس جن سے آپ لوگوں کی جان چھوٹ جائے۔ وہ جن ہر روز رات میں خوشبو کے پاس اس کے کمرے میں آتا تھا۔ جب وہ اس رات خوشبو کے پاس آیا تو وہ خوشبو سے بولا۔ ”مجھے کمرے میں کسی اور کی بھی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے، اور ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی میری نگرانی کر رہا ہے۔ (اب آگے پڑھیں)

خوشبو بولی۔ ”آپ خواہ مخواہ شک

کر رہے ہیں، بھلا آپ کی طاقت کے آگے کسی کی مجال ہے جو آپ کی نگرانی کرے، لگتا ہے کہ آپ آج کچھ زیادہ ہی پریشان ہیں۔ اس سے پہلے تو آپ نے ایسی باتیں نہیں کیں۔ کسی میں اتنی ہمت ہے کہ آپ سے ٹکرائے، آپ پریشان نہ ہوں۔“

”ہوسکتا ہے کہ میرا یہ وہم ہو، خیر چھوڑو ان باتوں کو، ان باتوں میں وقت گزر رہا ہے، اگر ایسا ہوا تو

میں اسے دیکھ لوں گا، اور تمہاری حفاظت کے لئے میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا، میں کسی بھی صورت تم سے دور نہیں ہوسکتا، یہ میرا اہل فیصلہ ہے، کوئی مد مقابل آیا تو پھر اس کی خیر نہیں، چاہے تمہارا کوئی خونی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو اچھا اب وقت ضائع نہ کرو اور میری آغوش میں آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔

اور پھر خوشبو کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنی ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ خوشبو اس کی ہاتھوں میں ساکت ہو کر رہ

گئی۔ تو رولو کا نے اب غائبانہ طور پر کمرے میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

جن زادہ روشاک کافی دیر تک خوشبو کی ذات سے لطف اندوز ہوتا رہا، اور پھر ایک مقررہ وقت پر جو کہ اکثر اس کا وقت ہوتا تھا۔ اس وقت پر خوشبو کو بے سدھ چھوڑ کر کمرے سے غائب ہو گیا۔

صبح کافی دیر تک خوشبو سوئی رہی اور پھر بہن کے جگانے پر اس کی آنکھ کھلی۔ خوشبو کی آنکھیں جاگنے کی وجہ سے آج کچھ زیادہ ہی سرخ ہو رہی تھیں، جنہیں دیکھ کر کہکشاں نے پوچھا۔ ”آپ آج تو آپ کی آنکھیں بہت زیادہ سرخ ہو رہی ہیں۔ کیا آنکھوں میں کوئی تکلیف ہو گئی ہے؟“

”کہکشاں ایسی کوئی بات نہیں۔ رات سر میں بہت شدید درد تھا جس کی وجہ سے کافی دیر تک جاگتی رہی تھی، چلو نیچے چلتے ہیں۔“ اور پھر دونوں ہمیشہ سیڑھیوں سے اترتی ہوئی نیچے چلی آئیں۔

خوشبو پر نظر پڑتے ہی اس کی امی بولیں۔ ”ارے خوشبو آج تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے، آج تو بہت زیادہ سرخ ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تم پر اور ہمارے حال پر رحم کرے۔ بیٹا میں تو یہ سوچ سوچ کر مھلٹی جا رہی ہوں کہ کاش! تم نے شروع دن ہی میری بات مان لی ہوتی تو آج یہ جان لیوا آنکھیں دن دیکنا نصیب نہ ہوتا۔ تمہارے ابو بھی دن رات کرب و اذیت کے پہاڑ تلے دبے چلے جا رہے ہیں۔“

بیٹا تمہارا ذہن تو جب اس کے تسلط سے فراغت پاتا ہے تو تم گھڑی دو گھڑی کے لئے اپنے ذہن کو آزاد پاتی ہو لیکن ایک ہم ہیں کہ ہم سارے گھر والے ہر وقت ہر لمحہ سوچوں کے گرداب میں پھنسے رہتے ہیں۔ لگتا ہے اس کرب و اذیت کی وجہ سے ہم زندہ درگور ہو جائیں، یا پھر.....“

خوشبو کی امی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ”امی آپ زیادہ فکر نہ کریں، اللہ نے چاہا تو بہت جلد ہم ان جان لیوا مصائب سے چھٹکارا پائیں

گے، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہماری جان تمام پریشانیوں سے چھوٹ جائے گی۔“ خوشبو بولی۔ ”چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو۔“ اس کی والدہ بولیں۔ تو خوشبو اپنا بخلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے غسل خانے میں چلی گئی۔

ادھر رولو کا اپنے کمرے میں بیٹھا اس جن زادہ روشاک کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ”کم بخت خوشبو کو اپنے شکم میں جکڑ چکا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو ایک قسم کا سحر خوشبو کے دل و دماغ پر طاری کر دیتا ہے جس کی وجہ سے خوشبو کا دماغ اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ خیر میں دیکھتا ہوں کہ اس کا سدباب کیا ہوتا ہے۔ اس کا مکمل علاج ضروری ہے، یعنی اس کا خاتمہ، کیونکہ اگر اسے آزاد چھوڑ دیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ کسی بھی وقت جب موقع ملے یہ کوئی بھی ناسلامتی نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئے گا۔ یا پھر اگر اسے قید بھی کر دیا گیا تو کسی وجہ سے یہ آزاد ہو گیا تب بھی یہ خوشبو کی ذات اور اس کے گھرانے کو نقصان پہنچانے سے ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ اور اگر اس درمیان خوشبو کی شادی ہو گئی تو یہ اس کا اور بھی دشمن بن جائے گا۔ خیر کوئی بات نہیں، روشاک تو بھی کیا یاد کرے گا تو ناحق کسی معصوم پر اپنا تسلط جما بیٹھا ہے۔“ اور یہ بول کر رولو کا سکرانے لگا۔

دوسری رات آئی اور پھر رولو کا غائبانہ طور پر خوشبو کے کمرے میں موجود تھا۔ اپنے وقت پر روشاک کمرے میں حاضر ہو گیا۔ خوشبو اپنے سر پر اپنا ہاتھ رکھے آنکھیں موند کر سوچوں کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبی پڑی تھی۔ اسے آواز سنائی دی۔ ”خوشبو۔“ تو اس نے جھٹ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ”آپ آگئے۔“ اس نے کہا۔ ”میں آپ ہی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ ابھی تک آپ نہیں آئے۔ اب تو میں اپنی نیند بھی نہیں سو سکتی۔ کیونکہ ہر بل آپ کے آنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور یہی سوچ سوچ کر آنکھوں سے نیند کوسوں دور رہتی ہے۔“

وہ خوشبو کی باتیں سنتا رہا اور اچنبھے کی حالت میں اپنی آنکھیں کمرے کے چاروں طرف دوڑاتا بھی

رہا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اندرونی طور پر عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا ہو۔

”کیا بات ہے؟“ آپ اس طرح گھور گھور کر کمرے میں کیا دیکھ رہے ہیں؟“ خوشبو نے پوچھا۔ ”کیا بتاؤں، مجھے کسی کی موجودگی کا گمان ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی ہم دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی نادیدہ قوت۔“ روشاک اپنے ہاتھ کو مسلتے ہوئے بولا۔

”آپ کے علاوہ کوئی اور نادیدہ قوت کون ہو سکتا ہے۔ میں تو سمجھ رہی ہوں کہ آپ کو اس قسم کا وہم ہو گیا ہے۔ مجھے تو ایسا بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہا۔“ خوشبو بولی۔

”خوشبو! جو کچھ میں محسوس کر رہا ہوں، وہ تم نہیں محسوس کر سکتی۔“ اور پھر اس کی ایک گرجدار غصیلی آواز گونجی۔ ”اگر کوئی موجود ہے تو فوراً سامنے آ جائے، ورنہ اگر میں نے اسے طریقے سے معلوم کر لیا تو تمہاری خیر نہیں، تمہیں اندازہ نہیں کہ ایک جن کی طاقت کیا ہوتی ہے۔“

اس کی آوازوں کے علاوہ پورے کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ ”اب بھی وقت ہے تم جو بھی ہو فوراً ظاہر ہو جاؤ، نہیں تو.....“ اور پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ دیوار کی طرف کر دیا۔ پانچوں انگلیوں سے سرخ رنگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس کے بعد وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم کر یہ عمل کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ سے نکلتی سرخ چنگاریاں دیواروں پر پڑتی رہیں۔ مگر کوئی بھی نتیجہ نہ نکلا تو وہ جیسے شکست خوردہ انداز میں تہر آ لوں نظروں سے آ زما لیا مگر.....“ اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں، میرے اور آپ کے علاوہ اس کمرے میں اور کون ہو سکتا ہے، آپ اپنے آپ کو پریشان نہ کریں، چلیں میرے قریب بیٹھیں۔“ اور خوشبو نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بیٹھا لیا۔

پھر وہ بولا۔ ”اگر تو کوئی ہے بھی تو، میں دیکھ لوں

گا، اس حقیقت کو پانے کے لئے اب مجھے کسی وقت دن میں بھی آنا پڑے گا، پھر میں دیکھتا ہوں کہ.....“ اور اس نے اس بار بھی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”آپ کی پریشانی دیکھ کر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، آپ اس مسئلے کو چھوڑیں، کمرے میں کوئی بھی نہیں، صرف میں کمرے میں موجود ہوں، کوئی اور نہیں۔“ خوشبو مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے خوشبو کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

”خوشبو! میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تمہیں کوئی مجھ سے جدا کر دے۔ میں تمہیں کتنا چاہنے لگا ہوں اس کا تمہیں اندازہ نہیں، بس یہ سمجھ لو کہ تم میری جان ہو۔ کاش! کہ اگر میرا بس چلتا تو میں ایک بل کے لئے بھی تم سے جدا نہیں ہوتا۔“

مگر میں مجبور ہوں، کیونکہ میرے قبیلہ کا قانون بہت سخت ہے، اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ حدود سے تجاوز اور غلطی کی سزا میں کوئی بھی نرمی نہیں برتی جاتی، چاہے وہ جنتا سردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ خیر کوئی بات نہیں، تمہاری خاطر کبھی وقت آیا تو میں اپنی جان بچاؤں کر دوں گا، لیکن تمہاری ذات سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔“ وہ بولا۔

”اگر آپ کے قبیلہ کا اتنا سخت قانون ہے، اور آپ اس طرح چھپ چھپ کر یہاں آتے ہیں، اگر آپ کے قبیلہ والوں کو اس بات کی خبر ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟“ خوشبو بولی۔

”خوشبو! میں یہاں آتا ہوں اس کی خبر قبیلہ والوں کو نہیں ہو سکتی۔“

”اور اگر کسی طرح خبر ہوگی تو پھر آپ کیا قدم اٹھائیں گے اور پھر میرا کیا ہوگا؟“ خوشبو بولی۔

”تم فکر نہ کرو، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ویسے ہم مسلمان جنتا ہیں، میرے والد قبیلے کے سردار ہیں، ہمارا قبیلہ شریعت کا بہت پابند ہے اور خاص طور پر میرے والد تو کفر قسم کے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی طرف

سے دل دہل جاتا ہے۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں، بس تم مجھے اچھی لگی اور میں تم پر اپنا دل ہار بیٹھا، اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں معلوم۔“ اس نے خوشبو کا ہاتھ دبا تے ہوئے کہا۔

اس کے بعد بات جب آگے بڑھی تو رولو کا کمرے سے باہر نکل گیا اور پلک چمکتے ہی وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔

کمرے میں آ کر رولو کا ہاتھ منہ دھویا اور پھر بستر پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی، تو اس نے دل ہی دل میں کچھ سوچا اور فوراً اس کا ایک کارندہ حاضر ہو گیا تو وہ بولا۔

”شران کل صبح سورج طلوع ہونے کے بعد فلاں گاؤں میں فلاں گھر کے چھت پر جو کمرہ موجود ہے اس میں موجود رہتا ہے اور یہ خیال رہے کہ کسی طور پر بھی گھر والوں کو تمہاری موجودگی کا پتہ نہ چلے، چاہے کچھ بھی ہو جائے تم نے خاموش رہنا ہے اور پھر یہ بھی خیال رہے کہ تمہارا شانہ تک ظاہر نہ ہونے پائے، ورنہ بنانا یا کھیل بگڑ جائے گا۔“

میں تمہیں صاف اور واضح طور پر بتا رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ اس کمرے میں کوئی جن آدھکے تو تمہاری موجودگی کو وہ محسوس کرے اور پھر اپنا کوئی حربہ آزمائے، مگر تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دینا ہے۔ یہ تو مجھے پتہ ہے کہ اس کا کوئی بھی حربہ تم پر کارگر نہیں ثابت ہوگا۔ روزانہ صبح سورج طلوع سے غروب ہونے تک اس کمرے میں رہنا ہے۔“

رولو کا کارندہ شران بولا۔ ”آپ کا حکم سر آنکھوں پر، آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی، میں آپ کی باتوں پر مکمل عمل کروں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ یہ بول کر شران غائب ہو گیا۔

صبح ہوئی! سورج کے طلوع ہوتے ہی شران! خوشبو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ خوشبو جو خواب تھی۔ شران ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ خوشبو ساڑھے آٹھ بجے اٹھی اور انگڑائی لیتی

ہوئی کمرے سے نکل کر نیچے اپنی والدہ اور بہنوں کے پاس آ گئی۔ اسے دیکھ کر اس کی امی بولیں۔ ”ارے خوشبو! آج تو تم جلدی اٹھ گئیں۔“

”جی امی! آج میری آنکھ جلدی کھل گئی۔“

”اچھا ہوا۔ خیر چلو منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرلو۔“

”جی امی! میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آئی۔“ اور خوشبو غسل خانے میں چلی گئی۔

ناشتہ کے بعد خوشبو اور اس کی دونوں بہنیں گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئیں، تینوں بہنیں مل کر دن کا کھانا تیار کرنے لگیں۔ کھانے کے وقت پر دسترخوان لگ گیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے تک دن کے درجہ گئے۔

اس کے بعد کمرے میں بیٹھ کر تینوں بہنیں اور ان کی والدہ گھر کی باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ باتوں کے درمیان خوشبو کا دل کسی انجان بے چینی کی وجہ سے عجیب طرح کا ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی انجان قوت اسے اپنے کمرے میں جانے کے لئے دباؤ ڈال رہی ہو۔

”اچھا امی، اب میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔ طبیعت ذرا نیند بھرنے کو چاہ رہی ہے۔“ خوشبو نے کہا۔

”ارے یہ کون سی بات ہوئی آج دن میں تم کیسے سوئے جا رہی ہو، اس سے پہلے تو تم دن میں سوئی نہیں۔ یہاں تک نیند کا معاملہ؟“ امی نے پوچھا۔

”امی پتہ نہیں آج کیوں نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ میں چلتی ہوں، ایک گھنٹہ میں واپس آ جاؤں گی۔“ خوشبو نے کہا اور پھر اپنے کمرے میں جانے کے لئے بیڑھیاں چڑھ گئی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک کمرے میں روشاک نمودار ہوا اور اس کی آواز سنائی دی۔

”خوشبو!“ یہ سننا تھا کہ ہڑ بوا کر خوشبو بستر پر اٹھ بیٹھی اور بدحواسی کے عالم میں بولی۔ ”آپ اور اس وقت،

خدا کے لئے اور مجھے اذیت نہ دیں، فوراً چلے جائیں، اگر کسی کی نظر پڑ گئی تو کبھی تو آپ دن میں نہیں آئے۔“

”خوشبو! تم اس قدر گھبراؤ نہیں، تمہارے گھر والے تو بخوبی جانتے ہیں کہ میں اکثر بلکہ ہر روز تم سے ملتا ہوں، پھر کسی کی نظر پڑنے کا سوال کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ میں تمہارے علاوہ کسی کو نظر بھی نہیں آ سکتا۔“

دراصل میں اس بات کی تصدیق کے لئے آ گیا تھا کہ دیکھوں کہ پچھلی راتوں میں مجھے جو کسی اور کے وجود کا شک ہوا تھا، وہ دن میں تو نہیں، مگر مجھے اس وقت بھی ویسا ہی محسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت بھی کوئی وجود کمرے میں موجود ہے، مگر یہ وجود جو کہ میرے وار سے بچ رہا ہے، میں نے جو وار اس پر کیا تھا، وہ ایسا وار ہے کہ کسی اندہ کیسی مخلوق کا اس وار سے بچ نہ سکا ممکن ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

لیکن ایک بات اور میرے دماغ میں آ رہی ہے کہ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔“ روشاک بولا۔

”آپ تو خواہ مخواہ شک میں پڑ گئے جبکہ آپ نے بہت زبردست وار بھی کیا، اگر کوئی وجود ہوتا تو وہ اسی وقت خاکستر ہو جاتا۔ میرا تو مشورہ ہے کہ آپ اس شک کو اپنے دماغ سے نکال دیں اور آگے آگے دیکھنے ہوتا ہے کیا۔“ خوشبو بولی۔

”خوشبو! تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے کہ آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا؟“ روشاک نے کہا۔

”میرا مطلب کوئی غلط نہیں، میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر کوئی اندہ کیسی مخلوق آپ کا احساس ہو بھی رہا ہے تو کسی نہ کسی وقت وہ مخلوق آپ کے سامنے آ جائے گی۔“

”ہاں! یہ بات تمہاری درست ہے، اگر وہ میرے سامنے آئی تو پھر اس کا مجھ سے بچ نہ سکا ممکن نہیں۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں ورنہ آپ فکر کے پہاڑ تلے دب جے چلے جائیں گے۔“ خوشبو نے کہا۔ لیکن خوشبو کے دماغ میں یہ بات اب مکمل طور پر بیٹھ چکی تھی کہ وہ نہ ہو۔ حکیم کامل نے ضرور کچھ ایسا کیا ہے تاکہ بے چین

ہو جائے اور پھر وقت کے ساتھ اس کی بے چینی بڑھتی جائے اور مجھے یہ بات بھی بہت اہل لگتی ہے کہ حکیم کامل اس کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کئے کئے مکمل پر اس کا وار کارگر ثابت نہیں ہوا۔ اور کامیابی کی سبیل نظر آ رہی ہے۔“

”تم کیوں خاموش ہو گئی، خوشبو تم اپنے دماغ میں کوئی ایسی بات نہ لاؤ، کوئی بھی دیکھی یا نہ دیکھی چیز ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتی، اور اگر کسی نے ایسا سوچا بھی تو میں اس کا حشر کر کے رکھ دوں گا، ایسا سوچنے والے کا نام دنیا سے مٹا کر رکھ دوں گا۔ خیر اب میں چلتا ہوں، رات میں پھر ملاقات ہوگی تم آرام کرو۔“ اور یہ بولتے ہی وہ نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

”خوشبو دوبارہ بستر پر لیٹ گئی اور سوچنے لگی یقیناً یہ عمل حکیم کامل ہی کا ہے۔ ورنہ آج اور کل رات سے پہلے روشاک نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

خیر یہ بھی اچھا ہوا کہ اب وہ ناقابل یقین بے چینی سے دوچار ہو گیا ہے۔ اس نے ہم گھر والوں کو بھی ایک طویل عرصہ سے کرب و اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی حرف آخر نہیں، یہاں پر ہر سیر پر سوا میرا موجود ہے۔ اب اس روشاک کے بچے کو معلوم ہوگا کہ طاقت کیا ہوتی ہے۔“ اور اسی قسم کی باتیں سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

شام کے چھ بجنے والے تھے کہ کمرے میں خوشبو کی بہن کہکشاں آئی اور یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ خوشبو ابھی تک مجھے خواب تھی۔ اس نے دیکھتے ہوئے خوشبو کا ہاتھ پکڑا اور آواز دی۔ تو خوشبو کی آنکھ کھل گئی۔ ”ارے کہکشاں تم! خیریت تو ہے؟“ خوشبو نے پوچھا۔ ”آپ نیچے نہیں آئیں تو امی نے کہا کہ جا کر دیکھو، ابھی تک خوشبو نیچے نہیں آئی، سارے کام اس کے حصے کے پڑے ہیں۔ اسے کہو کہ جلدی سے نیچے آئے اور رات کے کھانے کی تیاری کرے۔“ پتہ نہیں کیوں آج مجھے نیند آ گئی، میں تو بے خبر سو رہی تھی اگر تم نہ جگاتی تو پتہ نہیں اور کب تک سوتی

رہتی۔ خیر چلو نیچے چلتے ہیں۔“ یہ بول کر خوشبو بستر سے اٹھ کر کھکشاں کے ساتھ بیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئی۔ خوشبو کو دیکھ کر اس کی امی بولیں۔ ”خوشبو کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج کل تم کچھ زیادہ ہی لا پرواہ ہوئی جا رہی ہو۔ میرا تو کہنا ہے کہ اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھو، ویسے بھی ہم کیا کم اذیت میں ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ہم گھر والے مزید پریشانیوں کا ڈھیر بننے جا رہے ہیں۔ اللہ کرے کہ میں اپنی موت سے پہلے اس گھر اور تم سب کو اس موذی سے آزاد دیکھوں۔“ اور انہوں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ”امی آپ پریشان نہ ہوں، اللہ نے چاہا تو بہت جلد ہم تمام گھر والے خوشیاں دیکھیں گے، میں آپ سب سے کہیں زیادہ کرب و اذیت میں ہوں، میں پتھر کا بت تو نہیں جو احساس نہ کروں، اب میرا دل یہ کہہ رہا ہے کہ بہت جلد ہماری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔“

”آمین“ برجستہ خوشبو کی امی نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ تمہاری زبان مبارک کرے اور ایسا ہی ہو، خیر تم منہ ہاتھ دھو لو، اور چائے بناؤ، ابھی تک ہم نے چائے نہیں پی۔“

”جی امی! منہ ہاتھ دھو کر فوراً چائے بناتی ہوں۔“ یہ کہہ کر خوشبو منہ ہاتھ دھوئے لگی اور پھر منہ ہاتھ دھو کر چائے بنانے لگی۔ تھوڑی دیر میں چائے بن کر تیار ہو گئی اور اس نے پیالیوں میں چائے ڈال کر سب کے سامنے رکھ دی۔

اس وقت اس کے والد یقین احمد بھی موجود تھے، چائے پیتے پیتے وہ بولے۔ ”حکیم صاحب نے کہا تھا کہ میں بہت جلد تشریف لاؤں گا، وہ ابھی تک نہ آئے اور نہ کوئی اطلاع بھیجی۔ میرا تو ایک ایک پل اذیت میں گزر رہا ہے۔ حکیم صاحب کی شہرت تو میں نے بہت سن رکھی ہے، ابھی دل مایوس ہو جاتا ہے اور کبھی دل میں امید کی کرن نظر آنے لگتی ہے۔“

”ابا حضور! آپ فکر نہ کریں اللہ نے چاہا تو بہت جلد تمام پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ میرا دل اب بہت مطمئن ہے، کیوں کہ مجھے بہت کچھ محسوس ہو رہا ہے

اور پھر حکیم کامل صاحب پر میرا یقین پختہ ہو گیا ہے، اور دل یہ بھی گواہی دے رہا ہے کہ حکیم صاحب نے اپنا کام شروع کر دیا ہے جس کا نتیجہ بہت جلد ہمارے سامنے آئے گا۔“ خوشبو بولی۔

”بیٹا دل تو میرا بھی اب کچھ کچھ مطمئن ہو چکا ہے، اللہ کرے کہ بہت جلد ہم سب اس مصیبت سے چھٹکارا پالیں۔ ہو سکتا ہے کہ حکیم کامل نے اپنی جگہ بیٹھنے کا کام شروع کر دیا ہو۔“ خوشبو کے والد بولے۔

”ابا حضور! مجھے تو امید کی کرن واضح نظر آتی محسوس ہو رہی ہے۔“

”آمین..... آمین۔“ خوشبو کے والد اور والد بیک وقت دونوں نے کہا۔ اس کے بعد چائے کر کے دونوں چھوٹی بیٹھیں چائے کی پیالیاں اٹھا کر کچن میں لے گئیں، اور پھر خوشبو بھی اٹھ کر کچن میں چلی گئی تاکہ رات کا کھانا تیار کرے۔

کچن میں جب خوشبو نیچے تو کھکشاں بولی۔

”آپی! آج دوپہر میں ابا حضور کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ بہت غمگین اور پریشان لگ رہے تھے، امی نے انہیں بہت دلاسا دیا۔“

”ابا بولنے لگے۔ ارے میری زندگی کا کیا بھروسہ ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا میں بھی کر رہی تھی کہ مگر میں بچوں کی طرف سے بہت فکر مند ہوں، میرا ہر اذیت میں گزر رہا ہے۔ یہ دن میرے بچوں کے ختم مصیبت ہمارے گلے پڑ گئی ہے اس سے نجات دے۔“

”ہونے کے تھے لیکن افسوس کہ بچے پریشانیوں میں گھر گئے اس ادھیڑ میں میں رات کے پونے بارہ کا ناٹم ہو گیا، آج میں تو ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے گرتا رہا کہ دعا میں مانگ اس کی آنکھیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں۔“

اس کا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ یقیناً کمرے میں ایک اللہ کی ذات ہے جو ہماری پریشانیوں کو دور کرے گی، اور اللہ ہی کوئی نہ کوئی وسیلہ بنائے گا۔“

کھکشاں کی باتیں سن کر خوشبو بولی! ”کھکشاں میرا دل اب بہت مطمئن ہے کہ بہت جلد اللہ تعالیٰ سب پر اپنا فضل و کرم کرے گا۔“ اور یہ بول کر وہ بیٹھ گئی۔

کی نوکری لے کر کاشنے کے لئے بیٹھ گئی۔

تینوں بیٹھیں رات کا کھانا تیار کرنے لگیں۔

گھنٹہ میں رات کا کھانا تیار ہو گیا۔ اور پھر رات کے

بجے گھر والوں نے دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا، کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ چائے پینے کے بعد تینوں بیٹھیں سارے برتن سمیت کچن میں چلی گئیں۔ ان تینوں کا روز کا معمول تھا کہ کھانے کے سارے برتن اور کھانچیاں رات میں ہی دھو کر رکھ دیتی تھیں۔ تمام کام سے فارغ ہو کر خوشبو اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بستر پر لیٹ کر وہ سوچوں کی اتھاہ گہرائی میں اترتی چلی گئی۔ اب دل طوری پر وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد روشاک سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے۔ وہ بہت آگاہ تھی کہ اب وہ نہیں چاہتی تھی کہ چھپ چھپ کر مگر کچھ کے آنسو بہائے، اسے یقین ہو گیا تھا کہ قدرت کے جواہر دل ہیں وہ اٹل ہیں۔ اور حقیقت سے چشم پوشی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

اللہ نے دنیا میں ایک اٹل اور مضبوط نظام رائج کر دیا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی مخلوقات ہیں وہ سب اپنے اپنے حدود میں پابند ہیں، کسی ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے میل ملاپ سودمند نہیں، وقتی آسودگی تو مل جاتی ہے

آج خوشبو کا دل دماغ بہت بے چین تھا، وہ دل ”ابا بولنے لگے۔ ارے میری زندگی کا کیا بھروسہ ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا میں بھی کر رہی تھی کہ مگر میں بچوں کی طرف سے بہت فکر مند ہوں، میرا ہر اذیت میں گزر رہا ہے۔ یہ دن میرے بچوں کے ختم مصیبت ہمارے گلے پڑ گئی ہے اس سے نجات دے۔“

”ہونے کے تھے لیکن افسوس کہ بچے پریشانیوں میں گھر گئے اس ادھیڑ میں میں رات کے پونے بارہ کا ناٹم ہو گیا، آج میں تو ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے گرتا رہا کہ دعا میں مانگ اس کی آنکھیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں۔“

اس کا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ یقیناً کمرے میں ایک اللہ کی ذات ہے جو ہماری پریشانیوں کو دور کرے گی، اور اللہ ہی کوئی نہ کوئی وسیلہ بنائے گا۔“

کھکشاں کی باتیں سن کر خوشبو بولی! ”کھکشاں میرا دل اب بہت مطمئن ہے کہ بہت جلد اللہ تعالیٰ سب پر اپنا فضل و کرم کرے گا۔“ اور یہ بول کر وہ بیٹھ گئی۔

کی نوکری لے کر کاشنے کے لئے بیٹھ گئی۔

تینوں بیٹھیں رات کا کھانا تیار کرنے لگیں۔

گھنٹہ میں رات کا کھانا تیار ہو گیا۔ اور پھر رات کے

خوشبو کو اچانک آواز سنائی دی اور پھر بوجھل آنکھوں سے خوشبو اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

”خوشبو اندرونی طور پر مجبور تھی کیونکہ کوئی

اندیکھی طاقت اسے مجبور کر دیتی کہ جب روشاک آتا تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے آگے سرخم کر دیتی اور پھر اس قوت کے زیر اثر روشاک کی خواہش کے مطابق اس کا ساتھ دیتی۔

”ارے کیا بات ہے، تمہاری آنکھیں بہت زیادہ بوجھل بوجھل نظر آ رہی ہیں، نیند کا غلبہ زیادہ نظر آ رہا ہے، میں بھی کیا کروں، تم بنا مجھے چین نہیں ملتا، خیر تمہاری وجہ سے آج میں جلدی چلا جاؤں گا۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔“

”میں تو خود آپ کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں، پتہ نہیں آج کچھ زیادہ ہی مجھے نیند کا احساس ہو رہا ہے۔ اور آپ سنائیں مزاج کیسے ہیں؟“ خوشبو نے کہا۔ تو روشاک مسکرانے لگا اور بولا۔ ”یہی تو تمہاری دلکش ادائیں ہیں جن پر میں مرنا ہوں۔“ یہ بول کر اس نے خوشبو کا ہاتھ دونوں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر اچانک وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا، اس پر بدحواسی طاری ہو گئی۔

وہ فوراً بستر پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اور وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم گھوم کر کسی کو دیکھنے لگا، اس کی آنکھیں جیسے شعلہ اگلنے لگیں۔

اس کی حالت دیکھ کر خوشبو بھی گھبراہٹ کا شکار ہو گئی مگر پھر دل ہی دل میں خوش بھی ہونے لگی کہ ”اچھا ہے تیری بے چینی مزید بڑھے تو نہ ہم گھر والوں کو بھی بے چین کر رکھا ہے۔“

”خوشبو! تم اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہو، بستر سے نیچے اترنا، میں اس کم بخت کو دیکھتا ہوں، اب مجھے ایک یقین ہو گیا کہ اس کمرے میں کوئی غائبانہ طور پر میری نگرانی کر رہا ہے، میں اسے ہرگز ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ جو بھی میری نگرانی کر رہا ہے کان کھول کر سن لے کہ اب بغیر میری مرضی کے اس کمرے سے باہر نکلنا ممکن نہیں، اب میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری طاقت کتنی ہے اور اگر تم میں ہمت ہے تو میرے سامنے آؤ۔“ روشاک کی آواز میں جیسے ایک گرجن تھی، اس کی آواز یک بیک

بدل گئی تھی، اس کی کھر کھاتی آواز میں وحشت تھی اس کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں، وہ اپنی مٹھیاں بھینچنے لگا تھا، وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم رہا تھا اور پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر چند ساعت بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ پھر اس کی آنکھوں سے سرخ رنگ کی شعاعیں نکلنے لگیں، وہ شعاعیں چاروں طرف کمرے میں پھیل گئیں۔

ان شعاعوں نے پورے کمرے کا احاطہ کر لیا تھا۔ چاروں دیواروں، چھت اور فرش شامل تھے، مگر اس سے پہلے روشاک نے بستر کے چاروں طرف اپنی انگلی کے اشارے سے ایک دائرہ کھینچ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ سرخ شعاعیں بستر سے ذرا ہٹ کر تھیں۔

”اب میں دیکھتا ہوں کہ تو کیسے بچتا ہے، تیرا وجود آج ہر حال میں ختم ہوتا ہے، اگر ہمت ہے تو فوج کر دکھا، میں بھی تو تیری طاقت دیکھوں، لیکن اب بھی وقت ہے کہ تو میرے سامنے آ جائیں تو.....“ اور اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ کیونکہ پورے کمرے میں سرخ شعاعیں گردش کرتی رہیں مگر کوئی بھی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کر روشاک اور بھی بوکھلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے میں موجود تمام شعاعیں غائب ہو گئیں لیکن روشاک کی بدحواسی عروج پر تھی۔ وہ زخمی سانپ کی طرح تھلا اور پھینکا رہا تھا۔

ادھر خوشبو بستر پر سہمی ہوئی بیٹھی ایک ٹک روشاک کو دیکھے جا رہی تھی، اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یہ یقین تھا کہ روشاک کی تمام باتیں کمرے سے باہر کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اس لئے وہ اس طرف سے مطمئن تھی ورنہ وہ آوازیں سن کر گھر والے بوکھلا جاتے اور رات کے اس پہر ان کا سکون غارت ہو جاتا۔

ایسا لگتا تھا کہ روشاک اپنے آپ میں نہیں، اس پر جیسے جنوں سوار ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک ٹک ایک ہی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے میں جیسے تیز ہواؤں کا جھکڑ چلنے لگا لیکن چند ساعت بعد ہی ہواؤں کا جھکڑ غائب ہو گیا۔

اس کے بعد کیا ایک روشاک کا دایاں ہاتھ لہا ہوتا شروع ہوا، اور دیوار کی طرف بڑھا، جس دیوار کی طرف وہ نظریں جمائے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ لمبا ہوتا ہوا، دیوار کے پاس پہنچ گیا، اور پھر اس کا ہاتھ دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ چند ساعت تک اس کا ہاتھ دیوار کے ساتھ لگا رہا، پھر آہستہ آہستہ دیوار سے جھٹ کر سمنٹ پر اور سمنٹ سمنٹ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس کے جسم میں ایک زبردست جبر جبری نظر آئی۔ اس کے بعد پھر اس نے ایک اور لمبا سانس کھینچا۔

ابھی بھی خوشبو اسے غمگینی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو، صرف اس کی آنکھوں کی پلکیں ہی جھپکی نظر آ رہی تھیں اور پورا وجود جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔

”خوشبو تم گھبراؤ نہیں، میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔“ جب یہ آواز خوشبو کے کان میں پڑی تو جیسے وہ چونک پڑی۔

”جی..... جی..... ہاں..... جی!!“

”جی.....“

”میں سمجھنے سے قاصر ہوں، یہ تو حقیقت ہے کہ کوئی نادیہ فوت کمرے میں موجود ہوتی ہے، میں تمام حربے آزما چکا ہوں، تمام طاقتیں صرف کر چکا ہوں مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، میں ایسا خطرناک اور خونی وار آزما چکا ہوں۔ ایسی خوفناک شعاعیں ہیں کہ اگر کوئی شے دیوار کے اندر بھی موجود ہو تو وہ جل کر خاکستر ہو جائے، لگتا ہے وہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور ہے، پتھر چلے کر وہ ہے کون۔ بہر حال میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ آج میں اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کروں گا، شاید وہ مجھے کوئی اور ترکیب بتائیں۔

لیکن پھر ایک خیال آتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن پھر یہ بھی خیال آتا ہے

کہ اس سے پہلے تو کبھی ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، اور کسی کو کیا پڑی ہے کہ ایسا خطرہ مول لے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تم گھر والوں یا پھر رشتہ داروں میں سے کوئی بھی کسی عامل کے پاس گیا ہو، اور اگر ایسا ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ کوئی کسی عامل کے پاس گیا ہے۔

پھر ایک خیال اور بھی آتا ہے کہ شاید کوئی ہنگامی ہوئی قوت ہو، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کسی ہنگامی ہوئی ہستی کا ہم دونوں کے میل ملاپ سے اس کا کیا نقصان ہو کہ درمیان میں آن کوئی، بہر حال اگر کوئی، سستی ہے تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔

یہ تمام باتیں سن کر خوشبو نے بھی ایک لمبا سانس کھینچا اور بولی۔ ”آپ تمام طاقتیں آزما چکے، بھول آپ کے یہ بہت خوفناک اور خونی وار ہے، اس کے باوجود اگر کوئی نادیہ فوت ہے تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور آپ یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی عامل کے پاس نہیں گیا۔ اور کوئی جا بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ اس سے پہلے ہمارے گھر والے اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں، اور اب تو گھر والے بھی آپ کی خوشی میں خوش ہیں، اور میں تو دل و جان سے آپ پر غار ہوں۔

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ کوئی اس معاملے میں کیسے مداخلت کر سکتا ہے۔ کسی کو ایسا کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ اور میں تو یہ سمجھ نہیں سکتی کہ اندرونی معاملات کیا ہیں، آپ بخوبی جانتے ہیں۔ میرا تو مشورہ ہے آپ اس طرف دھیان نہ دیں۔ یہ سب آنے والے حالات پر چھوڑ دیں۔

میں ایک مرتبہ پھر کہہ رہی ہوں کہ اگر کوئی نادیہ وجود ہوا تو کسی نہ کسی روز تو سامنے آئے گا ضرور اور جب وہ سامنے آئے گا تو آپ سے بچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ آپ کو اپنی طاقت پر بھروسہ ہونا چاہئے۔

اور پھر جب میں آپ سے راضی خوشی ہوں تو کسی اور کو مداخلت سے کیا فائدہ ہوگا، آپ بے فکر رہیں،

میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں، زیادہ سوچیں نہیں، ورنہ آپ جتنی غلطیوں میں مبتلا ہو کر جتنی توازن کھو بیٹھیں گے۔“ خوشبو نے ہر ایک لفظ کو جیسے چبا چبا کر ادا کیا۔ مگر خوشبو تو دل ہی دل میں بہت خوش تھی اور چاہتی تھی کہ روشاک کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر ہو، اس کا پل پل کا کھمبہ چمن چمن جائے، اور اس قدر اذیت سے دوچار ہو جائے کہ جینا محال ہو جائے۔

”خوشبو! تمہاری باتیں سن کر میں بہت خوش ہوا، واقعی تم بھی مجھے دل سے چاہتی ہو، تمہاری باتوں سے میں بہت مطمئن ہوں، بس تم حکم کرو، میں دنیا کی ساری دولت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔

میں کسی بھی صورت تمہاری آنکھوں میں پریشانی کی جھلک نہیں دیکھ سکتا۔ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر تم سے جدا نہیں ہو سکتا۔

اور ہاں! یاد آ یا۔ آج میں کچھ رقم لے آیا ہوں، اپنے گھر والوں کو دے دینا، سامنے بیک پڑا ہے، رقم ہے تو ٹھیک ٹھاک اگر کم ہو تو بتا دینا۔ اپنے والد کو دینا اور کہنا کہ اگر ضرورت ہو تو، میں اور بھی لا دوں گا۔ گھر کو زیادہ وسیع اور عالی شان بنوا لیں گے۔“

خوشبو مسکرانے لگی اور بولی۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ ہم لوگوں کا خیال رکھتے ہیں۔ میں بھی تو ہر پل آپ کے انتظار میں اپنا وقت کاٹی ہوں اور جب آپ پر نظر پڑتی ہے تو میرا دل بہت خوش ہو جاتا ہے، کاش! کہ آپ میری نظروں سے اوجھل نہ ہوں۔“ خوشبو اوپر کی دل سے تو یہ باتیں کر رہی تھی مگر اندر ہی اندر اس کے خیالات روشاک سے باغیانہ تھے۔

وہ بستر سے نیچے اترتی اور بیک کو کھول کر دیکھا تو وہ مسکرانے لگی اور بولی۔ ”یہ رقم تو بہت زیادہ ہے، آپ کہاں سے لائے، خیر اسے میں اباحضور کے حوالے کر دوں گی۔“ یہ بول کر وہ بستر پر دوبارہ بیٹھ گئی، پھر بولی اب تو آپ بہت مطمئن نظر آ رہے ہیں، کمرے میں جس نادیہ فوت کو آپ محسوس کر رہے تھے کیا وہ گلی کی یا اب بھی کمرے میں موجود ہے؟“

”وہ بھاگ گیا، اگر نہیں بھاگتا تو آج اس کا آخری وقت ہوتا، خیران باتوں کو چھوڑ دو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے خوشبو کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی بانہوں میں بچھ لی۔ خوشبو ایک ادا سے لہراتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کے بعد دونوں جذبات کے ٹھاٹھیں مارتا سمندر کے گرداب میں غوطہ زن ہو گئے۔ اس کے بعد خوشبو کب نیند کی وادی میں اتر گئی اسے پتہ نہ چلا۔

خوشبو صبح کے وقت اپنے کمرے سے نکلے آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کالا بیگ تھا جسے دیکھ کر اس کی والدہ اور والدہ اچنبھے میں پڑ گئے۔

”خوشبو! یہ کیا ہے؟“ اس کی والدہ نے پوچھا۔
”امی! اس میں روپے ہیں، رات وہ لے آیا تھا، اس نے کہا ہے کہ اپنے والد کو دے دینا تاکہ اس رقم سے وہ گھر کو زیادہ وسیع اور عالی شان بنائیں۔“ یہ بول کر خوشبو نے بیک اپنے والد کے سامنے رکھ دیا۔

”بس بیٹا! مرنے کی بات نہ کرتا۔“ یہ بول کر انہوں نے ایک لمبا سانس کھینچا اور خاموش ہو گئے۔ اور پھر وہ بولے۔ ”آج میں نے حکیم کامل صاحب کو خواب میں دیکھا کہ وہ مجھ سے مصافحہ کر رہے ہیں، مصافحہ کے بعد انہوں نے کہا۔ ”عقیق صاحب اور سنا میں کیسے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”حکیم صاحب بس اللہ کا کرم ہے، آپ کی یاد متاثر آ رہی تھی۔“ یہ سن کر وہ مسکرائے اور بولے۔ ”آپ نے یاد کیا اور میں آ گیا۔ دراصل میں

کل آتا مگر ایک ضروری کام کی وجہ سے نہ آ سکا۔ آپ کو یہ بھی بتانا تھا کہ آپ لوگ فکر نہ کریں، کیونکہ میں نے اپنا

کام شروع کر دیا ہے اور بہت جلد وہ کم بخت اپنے انجام سے دو چار ہو جائے گا، ابھی میں اسے بلکان کر رہا ہوں

تاکہ وہ اندرونی اور ظاہری طور پر کرب و اذیت میں مبتلا ہو جائے اور پر والے پر بھروسہ نہ رکھیں، آپ لوگوں کو اس سے نجات مل جائے گی۔“ اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

اذان فجر کی آواز سنائی دی۔ ”اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔“
”ابا حضور! میرا دل بھی گواہی دے رہا ہے کہ اب بہت جلد ان تمام پریشانیوں سے ہمیں چھٹکارا مل

جائے گا اور مجھے بھی یہ کمال یقین ہو چلا ہے کہ حکیم نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔“ خوشبو بولی۔ ”اچھا! لوگ بیٹھیں، میں ناشتہ بنا کر فرائے آتی ہوں۔“

تھوڑی دیر میں ناشتہ تیار ہو گیا تو سب نے ناشتہ کیا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر خوشبو کے ابا نے ”بیگم یہ رقم اٹھا کر سنبھال کر رکھ دو۔“

دن کے دس بجے ہوں گے کہ باہر سے ملازم اور خبر دی۔ ”صاحب ایک صاحب آئے ہیں اور ان سے ملنا چاہتے ہیں۔“

ملازم سے عقیق صاحب بولے۔ ”تم ایسا کرنا نہیں بیٹھک میں بیٹھاؤ، میں ابھی حاضر ہوا۔“

یہ سن کر ملازم چلا گیا۔ چند منٹ بعد عقیق صاحب بیٹھک میں گئے تو دیکھ کر چونک پڑے۔ بیٹھک میں رولو کا بیٹھا تھا۔

رولو کا کو دیکھ کر عقیق صاحب اچنبھے میں پڑ گئے۔ ”حکیم صاحب آپ! اور اتنی صبح، اگر مجھے ہوتا کہ آپ آج تشریف لائیں گے تو میں گاڑی دیتا۔ آپ کو آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی۔“

”نہیں جناب! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی آپ فکر نہ کریں، بس پروگرام بنایا اور آ گیا، میں آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ضرور آؤں گا، آنا بھی میری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ اگر کوئی مسئلہ جب

میرے ذہن پر سوار ہو جاتا ہے تو جب تک میں اسے حل نہیں کر لیتا، مجھے عجیب عجیب سی بے چینی لگتی رہتی ہے۔ آپ لوگ فکر نہ کریں، میں نے اپنا کام شروع

کر دیا ہے، اوپر والے کی مدد سے یہ مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے گا، یہ مسئلہ کوئی آسان نہیں، بلکہ بہت خطرناک ہے، وہ بہت طاقتور ہے ساتھ ہی ساتھ ضدی اور ہٹ دھرم بھی ہے۔

آپ کی بچی خوشبو کی ذات سے دست بردار رہنے سے منظور نہیں۔ اس مسئلے کے لئے وہ بہت دور تک جاسکتا ہے، وہ کسی بھی خونی دار سے نہیں چوکے گا۔

اس طرح کے جب کسی ضدی جن یا روح سے

واسطہ پڑ جاتا ہے تو اسے آہستہ آہستہ قابو کرنا پڑتا ہے، اسے بہت زیادہ ہلکان کرنا پڑتا ہے، آہستہ آہستہ ہلکان کرنے سے اس کی اندرونی کیفیت کمزور پڑنے لگتی ہے، وہ ناقابل یقین حد تک بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر جذبات میں آ کر اوجھے، جھکنڈوں پر اتر آتا ہے، وہ بہت زیادہ پریشانی کے عالم میں چڑچڑا ہو کر اپنا چین سکون کھو بیٹھتا ہے اور یہی نہیں بلکہ خواہ مخواہ بے موقع اپنی مخفی طاقتوں کو ضائع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پریشانی کے عالم میں اپنے ہمدردوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔

اس کے ہمدرد بھی یہی کہتے ہیں کہ تم خواہ مخواہ اپنی ضد کے آگے اپنے حدود سے تجاوز کر گئے اور اس کے کارن اب پریشانی سے دو چار ہو، اس کے دوسرے ساتھی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس کا مقابل کس طاقت کا حال ہے۔ خیر آپ اپنے ذہن پر بالکل بھی بار نہ ڈالیں، آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ تمام پریشانیوں سے بہت جلد چھٹکارا مل جائے گا۔

اور ہاں! یاد آئے۔ ذرا پچی کو بلائیں، اس سے چند باتیں کرنی ہیں۔ ”رولو کا بولا۔“

”حکیم صاحب میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں ابھی تک باتوں میں لگا رہا ہوں اور آپ سے پانی تک کا نہیں پوچھا۔ آپ تشریف رکھیں، میں ابھی آیا۔“ عتیق صاحب بولے۔

عتیق صاحب جلدی سے اٹھے اور گھر میں چلے گئے اور فوراً ہی وہ واپس آ گئے بولے۔ ”میں نے آپ کے متعلق خوشبو کو بتا دیا، وہ اب بھی ہے۔ حکیم صاحب آپ کا یہ احسان ہم گھر والے تاحیات مانتے رہیں گے، آپ کی طرف سے ہمیں نئی زندگی ملے گی، میں تو اس قدر پریشان تھا کہ کیا بتاؤں، کئی مرتبہ تو خیال آیا کہ میں خودکشی کروں، کیونکہ اس ذلت و رسوائی، کرب و اذیت اور بچوں کی تکلیف سے دلیراشتہ ہو چکا تھا، اگر ہمارے مذہب میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں اب تک اپنے آپ پر یہ ظلم کر بیٹھا ہوتا۔“ یہ بولتے بولتے عتیق صاحب کی آنکھوں میں نمی جھلکے لگی تھی۔

”عتیق صاحب! انسان کو ہمت حوصلہ اور جواں مردی سے مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہئے، جو لوگ حوصلہ ہار بیٹھے ہیں وہ بہت زیادہ ناقابل یقین اور ناقابل برداشت پریشانیوں میں گھر جاتے ہیں، اوپر والے پر بھروسہ کرتے ہوئے کوشش کرنی چاہئے اور جو لوگ اوپر والے پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ ان کی جان پریشانی سے چھوٹ جائے تو یقیناً وہ ایسا وسیلہ، اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ مصیبت زدہ کی جان مصیبت سے چھوٹ جاتی ہے۔“

”السلام علیکم! خوشبو کی آواز سنائی دی۔“

”جیتی رہو!“ رولو کا بولا۔ خوشبو کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس پر ایک بڑا سا شیشے کا جگ اور دو گلاس موجود تھے۔ پاس آ کر اس نے ٹرے پر رکھی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے گلاس میں شربت ڈالا اور رولو کا کو پیش کر دیا۔ دوسرا گلاس اس نے اپنے والد کو پکڑا دیا۔

رولو کا بولا۔ ”عتیق صاحب اس کی کیا ضرورت تھی۔ خیر آپ لوگوں کی محبت کے پیش نظر میں شربت پی لیتا ہوں، ویسے اکثر میری کوشش ہوتی ہے کہ میں کسی مریض یا ضرورت مند کو تکلیف نہ دوں، یادہ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں، خوشبو بیٹی دراصل میں نے تم سے چند باتیں کرنی تھیں، اس لئے آ گیا۔“

”حکیم صاحب آپ بھد شوق پوچھیں۔ میں بالکل صحیح جواب دوں گی۔“ خوشبو نے کہا۔

”حکیم صاحب آپ برائے مہربانی شربت پئیں، نہیں تو گرم ہو جائے گا۔“ عتیق صاحب بولے۔

عتیق صاحب کے بولنے پر رولو کا نے شربت پی لیا۔ اس کے بعد وہ خوشبو سے مخاطب ہوا۔ ”بیٹی یہ بتاؤ کہ جب سے تم مجھ سے مل کے آئی ہو، اس کے بعد اس جن کا تمہارے ساتھ کیا رویہ رہا ہے، یا پھر اس نے تمہارے سامنے کچھ محسوس کرتے ہوئے کیا کچھ بولا۔ یا تم نے اسے سامنے پا کر کیا اس میں کوئی تبدیلی یا کوئی بے چینی محسوس کی ہے اور اگر تم نے کچھ محسوس کیا تو، کیا

محسوس کیا؟“

”حکیم صاحب! اس کی پریشانیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، وہ جب بھی رات کے وقت کمرے میں آتا ہے تو دیواروں کو گھومنے لگتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ کوئی ناپیدہ قوت میری نگرانی کرنے لگی ہے، کئی مرتبہ اس کی آنکھوں سے سرخ شعلیں نکل کر کمرے میں پھیل چکی ہیں، اس کا کہنا ہے کہ ”یہ میرا ہماری وار ہے جس کے ذریعہ ان دیکھی قوت جل کر خاکستر ہو جائے گی۔“

اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ میں کسی بھی صورت تم سے دست بردار نہیں ہو سکتا چاہے اس کے لئے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے اور اگر کسی نے رکاوٹ ڈالی تو رکاوٹ ڈالنے والے کا میں شتر نشتر کر کے رکھ دوں گا۔“ اس طرح کی اور بھی باتیں وہ کرنے لگا ہے، بہر حال اس کی بے چینی قابل دید ہوتی ہے، میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کا سکھ چین اس سے دور ہو رہا ہے، وہ بہت زیادہ بے چین ہو گیا ہے۔

میں اندرونی طور پر اس کیفیت سے بھی دو چار ہوں کہ کہیں پیش میں آ کر وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا بیٹھے جس سے ہم گھر والوں کو کوئی نہ تلافی نقصان ہو جائے۔“ یہ بول کر خوشبو خاموش ہو گئی۔

”بیٹا! یہ تو تم اپنے دماغ سے نکال دو کہ وہ تم گھر والوں کو کوئی نقصان پہنچائے گا، میں نے اپنے خفیہ کارندے لگا دیئے ہیں جو کہ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھ رہے ہیں اور اس کی تمام حرکتوں کی خبر مجھے دے رہے ہیں۔ میرے کارندے چوبیس گھنٹے اس گھر کی اور اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ میں چاہتا تو اب تک اسے آہنی کتبے میں جکڑ چکا ہوتا مگر میں نے یہ نہیں چاہا۔“

میرا پروگرام یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ ہلکان اور پریشان ہو جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ پھر ہوا اور نہ غیض و غضب کے عالم میں بہت زیادہ دوڑ بھاگ کرتا ہے، وہ جتنا زیادہ غضبناک ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی

اسلم راہی اسماء کی تحریر کردہ بہترین کتابیں

سلطان عماد الدین زنگی
سلطان نور الدین زنگی
سلطان صلاح الدین ایوبی
سلطان محمود غزنوی
شہاب الدین غوری
قطب الدین ایبک
شمس الدین التمش
غیاث الدین بلبن
جلال الدین خلجی
علاؤ الدین خلجی
سلطان محمد تغلق
فیروز شاہ تغلق
تیغورنگ
قبلائی خان
اسکندر لودھی
ابراہیم لودھی
بہلول لودھی
ظہیر الدین بابر
ہمایوں
شیر شاہ سوری

قیمت فی کتاب - 25 روپے

Ph: 32773302

شیخ الحدادی
نوبلسکالر کراچی
ایڈیٹرز

بیٹا! تم میرے لئے تھوڑا سا حلوہ بنا دو، آج کافی دنوں بعد میرا دل حلوہ کھانے کو چاہ رہا ہے۔“ یہ سن کر خوشبو کی والدہ مسکرانے لگیں اور بولیں۔ ”خوشبو! یہ تو ٹھیک نہیں کہ صرف تمہارے اپاہی حلوہ کھائیں گے، میں تو سمجھتی ہوں کہ سب لوگ ہی حلوہ کھائیں گے، تم سب کے لئے حلوہ بنا لو۔“ یہ سن کر خوشبو مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ دونوں بہنیں بھی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ ایک بیٹا تھا جو کہ صبح کے وقت اسکول چلا جاتا تھا۔ وہ نویں کلاس میں زیر تعلیم تھا۔

عتیق صاحب! بیگم سے بولے۔ ”حکیم کامل بہت پیچھے ہوئے اللہ والے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی اور ہم گھر والوں پر کرم و فضل ہے کہ اس نے ہمارے لئے ایک وسیلہ پیدا کیا اور ہم حکیم صاحب تک جا پہنچے، دلی میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے اس جن کے گرد گھیرا ڈال دیا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔

اس جن کی بے چینیوں بہت بڑھ گئی ہیں۔ وہ بالکل بدحواس ہو کر رہ گیا ہے، اور اس بات کی تصدیق خود خوشبو نے بھی حکیم صاحب سے کی ہے۔“

”کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غصے میں ہمیں کوئی نقصان پہنچا بیٹھے۔“ بیگم بولیں۔

”بیگم یہ نہیں ہو سکتا۔ حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ اس کا دماغ انہوں نے اس طرف سے باندھ دیا ہے۔ اس کے دماغ میں اس طرح کا اور اس طرف کوئی بھی خیال نہیں آ سکتا۔

”اور اگر کسی طرح وہ جان جائے کہ یہ گھر والے میرے راستے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں اور کسی عامل کے پاس گئے تھے تو وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا بیٹھے۔“

”بیگم! حکیم صاحب نے ہر طرح کی گارنٹی دی ہے کہ آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں اور نہ ذرہ برابر بھی دل میں اندیشہ لائیں۔ اس گھر کا وہ ایک تنکا بھی اب نہیں توڑ سکتا۔ بھی میں تو حکیم صاحب کی قابلیت کا قائل ہو گیا ہوں۔ خوشبو کا کہنا بھی ہے کہ وہ بھی اب

کو چوان نے تانگہ روک لیا تو رولو کا تانگہ سے اتر گیا اور بولا۔ ”اب تم واپس چلے جاؤ، مجھے یہاں پر کچھ کام ہے، ورنہ میں دلی تک تمہیں تکلیف دیتا۔“

کو چوان بولا۔ حکیم صاحب! اس ویران اور بیابان میں آپ کو کیا کام پڑ گیا اور پھر آپ یہاں سے کس طرح دلی تک جائیں گے، جبکہ یہاں سے دلی کا فاصلہ کوئی دو صاعی گھنٹے کا ہے اور اس وقت یہاں سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزرتی، اگر آپ اپنا کام کر لیں اس کے بعد میں آپ کو دلی تک چھوڑ دوں گا۔“

”نہیں میاں! تمہاری بڑی مہربانی، اب تم واپس جاؤ، میری فکر نہ کرو، میں واپس چلا جاؤں گا، ویسے تو میرے ایک جاننے والے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وقت پر وہ آجائیں اور میں ان کے ساتھ ان کی گاڑی میں دلی چلا جاؤں، تمہاری بڑی مہربانی یہاں تک چھوڑنے کا۔“ رولو کا بولا۔

بہر حال رولو کا حکم کے مطابق کو چوان واپس آ گیا۔

آدھا گھنٹہ میں وہ عتیق صاحب کے سامنے تھا۔ اسے دیکھ کر عتیق صاحب بولے۔ ”میاں! تم نے حکیم صاحب کو کہاں چھوڑا!“ یہ سن کر کو چوان بولا۔ ”جناب وہ تو فلاں جنگل کی حدود شروع ہونے سے پہلے ہی اتر گئے، اور مجھ سے کہا کہ تم واپس چلے جاؤ، میں نے بہت اصرار کیا کہ آپ کو میں چھوڑ دوں گا، انہوں نے کہا کہ مجھے ایک کام پڑ گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے ان کی مرضی اور خوشی، وہ کسی نہ کسی طرح دلی پہنچ جائیں گے۔“ عتیق صاحب نے کہا۔

”عتیق صاحب دراصل رولو کا حقیقت کو کچھ کچھ سمجھ چکے تھے کہ حکیم کامل بہت زیادہ ماورائی قوتوں کے حامل ہیں اور بہت زیادہ نایدہ قوتیں ان کے قبضے میں ہیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ دلی میں بیٹھے بیٹھے جن زادہ روشاک کے گرد آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کر رہے تھے۔

آج عتیق صاحب، خوشبو بلکہ سارا گھر بہت خوش تھا۔ عتیق صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ”خوشبو

نہیں ہوتا۔ ذرا اس مسئلے سے نمٹ لوں پھر کسی روز تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا ضرور کھاؤں گا۔ تم اور تمام گھر والے بے فکر ہو کر کھائیں پیتیں اور خوش رہیں، کسی قسم کے بھی نقصان کے متعلق نہ سوچیں۔ بلکہ یہ سمجھ لو کہ کسی بھی حالت یعنی غصے یا انتقامی طور پر وہ اس گھر کا ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا۔

اچھا عتیق اب آپ مجھے اجازت دیں، میں چلتا ہوں، مئی کام اور بھی نمٹانے ہیں۔“

یہ سن کر عتیق صاحب بولے۔ ”گھر کا تانگہ ہے میں کو چوان کو بلاتا ہوں، آپ تانگہ میں تشریف لے جائیں۔ دیکھئے میری بات سے انکار مت کریں، آپ کی مہربانی ہوگی، میری یہ بات رکھ لیں۔ یہاں سے آپ کا دواخانہ زیادہ دور نہیں، میں سمجھتا ہوں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔“

خیر چلے میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ میں تانگہ میں چلا جاتا ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ راستے میں مجھے کسی ضرورت سے رکن پڑے تو تانگہ واپس کر دوں گا، اور یہ بات کو چوان کو بتا دیجئے گا، جب میں تانگہ رکوؤں تو وہ تانگہ روک لے اور مجھے اتار کر واپس آجائے۔“ رولو کا بولا۔

”ٹھیک ہے حکیم صاحب! میں کو چوان کو سمجھا دیتا ہوں، چلیے آپ کی مرضی۔“ عتیق صاحب بولے۔

کو چوان کو عتیق صاحب نے ملازم کے ذریعہ بلوایا اور اسے ساری بات بتلا دی۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ رولو کا نے عتیق صاحب سے مصافحہ کیا اور خوشبو کے اوپر اپنا دایاں ہاتھ پھیر کر دعا دی اور کمرے سے نکل کر تانگے میں بیٹھ گیا۔ عتیق صاحب نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ خوشبو نے بھی اپنا ہاتھ اٹھا کر خدا حافظ کہا اور تانگہ آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا اور پھر تانگہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کافی دور تک تانگہ چلتا رہا۔ جب تانگہ ایک جنگل کی حدود کے قریب پہنچا تو رولو کا نے کو چوان کو تانگہ روکنے کے لئے۔

اندرونی طاقتیں کمزور پڑنے لگتی ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اندرونی اور بیرونی دونوں طرح سے تھک جاتا ہے، اس کی ہمت پست ہو جاتی ہے، وہ نڈھال ہو جاتا ہے، اس کی ساری طاقتیں اپنا دم ختم کر دیتی ہیں۔ وہ اتنا تھک جاتا ہے کہ اس سے چلنا بھی دو بھر ہو جاتا ہے اور پھر غلغلہ پانے والے اسے آسانی سے دبوچ لیتے ہیں۔ یہی حال اس جن کا ہوگا۔ مجھے اس کو مارنے کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ خود اپنی موت مر جائے گا یا پھر اسے مار دیا جائے گا۔

ضدی اور ہٹ دھرم لوگ جو دوسروں کو اپنی خواہشات کے پیش نظر اذیت پہنچاتے ہیں وہ بہت جلد اوپر والے کے عتاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میں نے اس گھر کی طرف سے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود کر دی ہے، اس گھر کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس گھر کے کسی فرد نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔

کسی وقت ہو سکتا ہے کہ وہ زیادہ پھیر جائے اور بے نیکی بکنا شروع کر دے، ڈرانے دھمکانے کے الفاظ اس کے منہ سے نکلیں، ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بھی بولے کہ میں ابھی اور اسی وقت اپنی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے یا اس میں ملوث لوگوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا، میں ابھی دیکھتا ہوں کہ ایسا کرنے والا کون ہے، اور اس نے کس کی مدد حاصل کی ہے۔ ایسی حالت میں تم بالکل بھی خوف نہ کھانا۔“ رولو کا نے کہا۔

”ٹھیک ہے حکیم صاحب! میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ میری آپ سے التجا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ دوپہر کا کھانا کھائیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“ خوشبو نے کہا۔

”خوشبو بیٹی! ایسی کوئی بات نہیں، یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ میرا ایک ایک پل بہت اہم ہوتا ہے، اس وقت میں یہاں بیٹھا تم لوگوں سے باتیں بھی کر رہا ہوں اور میرا دماغ نہیں اور بھی لگا ہوا ہے۔ وقت کی اہمیت کے پیش نظر میرا ایک جگہ زیادہ دیر تک بیٹھنا کسی وقت ممکن

بالکل مطمئن ہے۔

حکیم صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ بہت جلد وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔“

”اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو، ہماری بچی سکھ کا سانس لے، اور پھر سولی پر لٹکی ہوئی ہماری جان بھی اس کے خوف سے آزاد ہو جائے میں تو ہر نماز میں گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں مانگتی ہوں کہ ہمیں اس موذی سے نجات ملے۔“ عتیق صاحب کی بیگم بولیں۔

”بیگم اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ تعالیٰ اپنا فضل ضرور کرے گا۔“ عتیق صاحب بولے۔

”اتنی دیر میں حلوہ بن کر تیار ہو گیا۔ گرم گرم حلوہ پلیٹ میں نکال کر خوشبو لے آئی تو تمام گھروالوں نے مزے لے لے کر حلوہ کھایا۔ آج گھر والوں کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔

خیر خوشی خوشی کام کاج میں لگ گئے دن کٹ گیا، شام ہوئی اور پھر رات آ گئی، سب نے مل کر رات کا کھانا کھایا اور پھر کھانا کھانے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ والد والدہ ایک کمرے میں جبکہ دونوں بیٹیں ایک کمرے میں اور بھائی الگ کمرے میں سوتا تھا اور خوشبو تو چھت پر بنے کمرے میں سوتی تھی۔

تمام کام اور کپ شپ کے بعد خوشبو اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں جاتے وقت اس کی والدہ بولیں۔ ”خوشبو بیٹا! تم اس بد بخت سے زیادہ بحث مباحثہ نہیں کرنا، اپنا منہ بند ہی رکھنا تو زیادہ اچھا ہوگا، اور اسے کسی قسم کی بھی بھٹک نہ پڑے کہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا ہے۔ اگر وہ کسی بہانے یا پھل سے معلوم کرنے کی کوشش کرے تو اپنا دل دماغ قابو میں رکھنا، ورنہ اگر اسے کوئی بھٹک پڑے تو ہماری ذات کو تو نہیں نہس کر دے گا۔ بیٹا! میری بات دھیان میں رکھنا اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتے رہنا۔ اچھا اب جاؤ اپنے کمرے میں۔“

”جی امی! میں آپ کی باتیں دماغ میں رکھوں گی، آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ اور خوشبو

سیڑھیاں چڑھتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں جا کر اس نے لائٹ جلائی اور بستر پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ بستر پر بیٹھی رہی، پھر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ پر سوچوں کی یلغار تھی۔ ویسے بھی وہ اپنے کمرے میں بہت زیادہ اذیت کا شکار رہتی تھی۔ کیونکہ ایک آدمی اکیلے کمرے میں پڑے پڑے حقیقتاً اکتا جاتا ہے اور وقت نکلتے نہیں کٹتا۔

کمرے میں اگر وہ افراد ہوں تو بات چیت میں تھوڑا وقت کٹ جاتا ہے، اور پھر وہ باتیں کرتے کرتے نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

آج خوشبو کو کمرہ بہت زیادہ بھیا تک لگ رہا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مجبوراً کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس کے دماغ میں صرف یہی باتیں گردش کر رہی تھیں کہ نہ جانے آج وہ کس طرح کمرے میں آئے، آج نہ جانے اس کے ساتھ کیسے حالات ہوں، وہ کس طرح کی بے نیکی باتیں کرے گا، اس کی شکل کس قدر وحشت ناک اور بھیا تک نظر آئے گی، یا پھر جس ہستی کو وہ کمرے میں محسوس کرتا ہے، کہیں وہ ہستی کوئی ناقابل برداشت قدم نہ اٹھا بیٹھے، کیونکہ روشاک تو اپنے تئیں اس ہستی کو زبردست نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ حکیم صاحب نے اس کی مکمل گارنٹی دی ہے کہ وہ کسی قسم کا بھی نقصان کرنے کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں، اور حکیم صاحب کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

خوشبو مزید اس قسم کے خیالات کے ادھیڑ بن میں مبتلا تھی کہ اچانک کمرے میں آواز سنائی دی۔ ”خوشبو! اور اپنا نام سنئے ہی خوشبو نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، تو دیکھا کہ روشاک سامنے موجود تھا اور اس کی آنکھیں کمرے کی دیواروں کی طرف گردش کر رہی تھیں۔

”آج پھر یہ کم بخت کمرے میں موجود ہے، میں اپنے محسوسات کو غلط نہیں قرار دے سکتا۔“

”اوئے چھپکلی کی اولاد، اگر تجھ میں ہمت ہے تو میرے سامنے آ، یہ چھپ چھپا کر کیوں مجھے تنگ کر رہا

ہے، ہمت والے تو سامنے آ کر مقابلہ کرتے ہیں، تو گیدڑ سے بھی بدتر اور کم ہمت ہے، اس لئے تو چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھ مجھے میں تو تیرے سامنے موجود ہوں، اور اگر تجھ میں ہمت ہے تو میرا کوئی نقصان کر کے دیکھ، تجھے میری طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اوئے آ جا میرے سامنے ورنہ میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تیری دنیا والے پناہ بھی نہیں مانگ سکتے، تیرا حشر دیکھ کہ وہ عبرت حاصل کریں گے اور آئندہ تیری دنیا کا کوئی بھی ہم جیسے کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کرے گا، چل فوراً میرے سامنے آ جا، کیوں دم دبا کر خاموش ہے۔“

وہ اس طرح کے اور بھی جملے بولتا رہا اور خوشبو ایک تک اسے دیکھنے جا رہی تھی۔

”ارے چل! اگر سامنے نہیں آتا تو یہ بتا دے کہ تو میرا کوئی دشمن ہے یا پھر خوشبو کا کوئی ہمدرد ہے یا پھر تیری مرضی مجھے صرف پریشان کرنا ہے یا پھر مجھے خوشبو سے الگ کر کے خود اس پر قبضہ کرنے کی خواہش ہے، کچھ تو بتا دے، دیکھ اگر تو نے ابھی بھی نہ بتایا تو میں تیری تلاش میں زمین کے اوپر ہی نہیں بلکہ پاتال تک جاؤں گا، میں اکیلا نہیں بلکہ اپنے چند خیر خواہوں کے ہمراہ تجھے ڈھونڈ نکالوں گا۔“

پھر اس نے ایک لمبا سانس کھینچا اور بولا۔ ”کم بخت ڈر کی وجہ سے بھاگ گیا۔ اگر ہمت ہوتی تو میرے مد مقابل ٹھہرتا۔ خیر میں اسے چھوڑوں گا تو نہیں، بہر حال میں اب اسے تلاش کر کے اس کا حشر نشر کر کے ہی رہوں گا۔ دیکھتا ہوں کہ اب یہ کہاں تک بھاگتا ہے۔“

اس کے بعد وہ خوشبو کی طرف پلٹا، خوشبو ایک تک اسے ہی دیکھنے جا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”خوشبو! تم بھی میری وجہ سے خاموش پریشان ہو گئی ہو، تمہیں پریشان کرنے کی میری مرضی قطعی نہیں مگر نہ جانے یہ کیوں کم بخت ہے جو مجھے پریشان کرنے لگا ہے، خیر ان باتوں کو چھوڑو، میں اسے دیکھ لوں گا کاش! میرے بس میں ہوتا کہ میں چندوں تک اسے دور دراز کر اس چوہے کو تلاش کر سکتا۔

میں یہ بات اپنے قبیلے میں بھی نہیں کہہ سکتا،

میرے والد صاحب تو زبردست قوت کے مالک ہیں، نادیدہ قومیں تو ان کے سامنے دست بدست سر جھکائے کھڑی رہتی ہیں، ان کی خفیہ طاقت اتنی وسیع ہے کہ ایک نظر میں سامنے چھپے ہوئے کی اصلیت جان لیتے ہیں۔ اگر میں ان سے مدد، طلب کروں گا تو پھر وہ اصلیت جاننے کی کوشش کریں گے کہ کوئی میرے پیچھے کیوں پڑا ہے اور مجھے ہر اسال کیوں کر رہا ہے اور پھر کم سے کم سارا معاملہ سامنے آ جائے گا اور پھر میں والد کی نظروں میں قصور وار ٹھہر جاؤں گا کیونکہ والد صاحب اصول کے بہت کچے ہیں۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کسی بھی آدم زاد کو کسی جن سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے کیونکہ آدم زاد نادیدہ قوتوں کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے مگر جنات تو یہ طاقت رکھتے ہیں کہ وہ آدم زاد کو دیکھ سکیں بلکہ جنات مخفی چیزوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔

اور ہمارے قبیلے کا کوئی جن کسی آدم زاد کو نقصان پہنچاتا ہے یا پھر کسی طرح تنگ کرتا ہے، اور اگر والد صاحب کو پتہ لگ جائے تو وہ جن بھیر سزا کے فوج نہیں سکتا، اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے اور خاص طور پر وہ جن تو اور بھی سخت سزا کا حق ٹھہرایا جاتا ہے جو اپنے دل اور نفسانی خواہشات کے پکر میں پڑ کر کسی آدم زادی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ ایسے جن کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔“

یہ باتیں سن کر خوشبو بولی۔ ”اور اگر آپ کے متعلق آپ کے والد صاحب کو پتہ لگ جائے کہ آپ میرے عشق میں گرفتار ہو کر اپنی من مانی کرتے ہیں تو۔“ ”خوشبو یہی تو سوچ کریں اکثر لرز جاتا ہوں، لیکن کیا کروں دل کے ہاتھوں بہت مجبور ہوں، اور میری حتی الامکان کوشش رہتی ہے اور رہے گی کہ کسی بھی صورت میرے اور تمہارے معاملات کے بارے میں والد صاحب کو پتہ نہ چلے۔ میں نے تو اس بات کو اپنے دوستوں تک سے چھپا رکھا ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کسی وقت کوئی دوست باعث حسد میرے راز کو افشاء

کردے اور میں بے موت مارا جاؤں۔“

”جلے جان لیتی ہوں کہ آپ کی کوشش ہے کہ اس معاملے کی خبر آپ کے قبیلے کے کسی جن یا پھر آپ کے والد صاحب کو پتہ نہ چلے مگر کسی بھی وجہ یا کسی بھی طریقے سے اگر پتہ چل جاتا ہے تو آپ اس صورت میں کیا قدم اٹھائیں گے اور پھر آپ کے ساتھ ساتھ کہیں میں نہ درمیان میں آ جاؤں اور میری ذات کا نقصان ہو جائے اور اگر ایسا وقت آیا تو میں اپنی صفائی میں اپنے بچاؤ کی تدبیر کر سکتی ہوں۔“

آپ جن زادہ ہیں اور میں کمزور آدم زادی، بھلا طاقت میں، میں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

”خوشبو بات تو تمہاری بالکل صحیح ہے، بس اس کے آگے میری سوچ محدود ہو کر رہ جاتی ہے، خیر ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ تمہاری ذات کو کوئی نقصان پہنچے کیونکہ اس صورت میں ہمارے قبیلہ والے اور خاص طور پر والد صاحب آدم زاد کو معصوم اور بے قصور گردانتے ہیں اور اگر کوئی آدم زاد عامل خواہ خواہ جب کسی جن کو نقصان پہنچاتا ہے تو اس کی خیر نہیں ہوتی۔“

خوشبو بولی! ”میری تو آپ سے التجا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آئے اور آپ کا مجھ سے ملنے کا راز فاش ہو جائے تو براے مہربانی مجھے اور میرے گھر والوں کو دور ہی رکھئے گا کیونکہ ایسی صورت میں تو ہم تمام گھر والے دل کا دورہ پڑنے سے ختم ہو جائیں گے۔ ایک تو ویسے ہی ہمارے گھر والے ہر وقت آپ کے غضب سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ سبہ ہوئے رہتے ہیں۔“

”خوشبو ایسی کوئی بات نہیں، بھلا تمہارے گھر والے مجھ سے کیوں خوفزدہ رہتے ہیں، ان سے بول دینا اور میں تو پہلے ہی بول چکا ہوں کہ وہ مجھ سے خائف نہ رہا کریں۔ ویسے بھی میں تم لوگوں کی مالی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہوں۔“

ارے میں تم پر قربان ہو سکتا ہوں مگر تمہاری ذات کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا اور اگر وقت آیا تو دیکھ لیتا یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔“

روشا کہ بولا۔

”اگر ایسی خطرناک بات ہے آپ کے قبیلے کی تو آپ اپنے دل پر پتھر رکھ کر مجھے بھول جائیں، کیونکہ میں نہیں چاہتی اور نہ بھی چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ کو نقصان اٹھانا پڑے، میں تو یہ بھی مانتی ہوں کہ آپ کے قبیلہ میں جن زادیاں مجھ سے کہیں زیادہ خوب صورت ہوں گی اور ویسے بھی قبیلہ کے سردار کے بیٹے کے لئے تو ایک سے ایک لگ سکتی ہے، میرا تو مشورہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو سمجھا بچا کر شانت کر لیں۔“

میں بھی آپ کو دل و جان سے جانتی ہوں مگر جہاں جانی نقصان کا احتمال ہو وہاں سوچہ بوجھ سے کام لینا چاہئے، اور یہ حقیقت ہے کہ جان سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں۔ ایک کا جانی نقصان اور دوسرے کو زندگی بھر کے لئے کرب و اذیت، کیونکہ زندہ رہنے والا زندہ درگزر ہو کر رہ جاتا ہے اپنے محبوب کی جدائی میں۔ اب بھی وقت ہے آپ سنجیدگی سے غور کریں۔“

کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ میں آپ کی جدائی میں زندگی بھر تڑپتی رہوں، اب تو میں بھی آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔“ خوشبو نے اوپری دل سے کہا۔ جبکہ خوشبو تو چاہتی تھی کل چھوڑ آج ہی اس سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ وہ تو مجبوری کے تحت اس کے آگے سرخم کر دیتی تھی تاکہ اس کے گھر والے اس کے غضب کا نشانہ نہ بنیں۔

”خوشبو! میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں، میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میرے قبیلہ میں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت جن زادی موجود ہیں مگر تمہاری ذات کے آگے وہ سب بچے ہیں اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو میں نہ چاہتے ہوئے اپنے والد اور قبیلہ کے رسم و رواج کے تحت کسی جن زادی کو زندگی کا ساتھی بنالوں مگر اصل چاہت کی حقدار صرف تم رہو گی۔ میرا وجود اس کے پاس رہے گا اور دل و دماغ تمہارے پاس۔“

”خیر چلے یہ تو وقت بتائے گا کہ کس کی قسمت

میں کیا لکھا ہے۔ قبل از وقت یہ سوچ سوچ کر خود کو ہلکان اور پریشان کرنا ٹھیک نہیں۔“ خوشبو نے ہر ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کیا۔

خیر چھوڑو ان باتوں کو، آج کا وقت تو باتوں میں ہی کٹ گیا، تم اپنے دل پر کوئی بار نہیں محسوس کرنا، بس تم کھاؤ پیو اور خوش رہو۔“ روشاک بولا۔

خوشبو بولی۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج آپ نہ جائیں اور صبح تک یہیں رہیں۔“ اور یہ بول کر خوشبو مسکرائے گی۔

خوشبو کی یہ بات سن کر روشاک جھٹھٹ بولا۔ ”نہیں خوشبو، یہی تو نہیں ہو سکتا، اذان فجر سے قبل والد صاحب میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیتے ہیں اور اگر میں موجود نہیں ہوا تو۔۔۔۔۔“ اور پھر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور جلدی سے کمرے سے غائب ہو گیا۔

صبح کے وقت حسب معمول خوشبو نیند سے جاگ گئی اور پھر سے نیچے آ گئی۔ منہ ہاتھ دھویا غسل کیا اور ناشتہ کے بعد کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

دن کے گیارہ بجے رولوکا ان کے گھر کے دروازے پر موجود تھا۔ ملازم اندر آیا اور عتیق صاحب کو بتایا کہ ”جناب ایک صاحب تشریف لائے ہیں اور وہ اپنا نام حکیم کامل بتا رہے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

حکیم کامل کا نام سنتے ہی عتیق صاحب جھٹھٹ کر سی سے اٹھے اور فوراً باہر آئے اور رولوکا کو دیکھتے ہی مصافحہ کے لئے ہاتھ جا بڑھایا۔ مصافحہ کے بعد عتیق صاحب بولے۔ ”حکیم صاحب آپ نے بتایا ہوتا تو میں تا نگہ نہ دیتا، اب آئندہ آپ نے جب بھی آنا ہو، تو آپ دن ضرور بتائے گا تاکہ میں اس دن آپ کو لانے کے لئے تا نگہ نہ بیچ دوں۔ آپ ہمارے لئے اتنی تکلیف اٹھا رہے ہیں، ہم تو کسی قابل نہیں اس کا جبرائیل تعالیٰ یقیناً آپ کو دے گا۔ آپ اندر تشریف لے آئیں۔“ اتنی دیر میں خوشبو نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔

عتیق صاحب کے ساتھ رولوکا ڈرائنگ روم میں آیا اور صوفے پر بیٹھ گیا اور خوشبو سے مخاطب ہوا۔ خوشبو بیٹی! خیر یہ تو ہے ناں۔“

”جی حکیم صاحب بالکل خیریت ہے۔“ خوشبو رولوکا کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ عتیق صاحب رولوکا اور خوشبو کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر گھر کے اندر چلے گئے۔

رولوکا بولا۔ ”بیٹی گھبرا نا نہیں، میں خاص کر یوں آیا کہ بتا دوں، روشاک دودن نہیں آئے گا، میں اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دوں گا، وہ رکاوٹ ایسی ہوگی کہ کسی صورت بھی اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتا، نہ ہی وہ دن میں آئے اور نہ رات میں اور تیسرے دن رات میں جب وہ آئے گا تو بہت نڈھال ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ غصے میں پھرا ہوا ہو، تم اسے دیکھ کر قطعی خوف نہیں کھانا اور نہ ہی اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی بات لانا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ اب اس گھر والوں کی ذات کو ذرہ برابر بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ان دونوں راتوں میں تم بالکل بے فکر ہو کر آرام سکون کے ساتھ سونا۔“

”جی حکیم صاحب! بہت اچھی بات ہے، میں آپ کی باتوں پر بھرپور عمل کروں گی۔ کسی کسی وقت تو میرے دل میں یہ بھی آتا ہے کہ چاہے میری ذات کا نقصان ہو جائے مگر میرے گھر والے بخیر و عافیت رہیں۔ کاش! میں شروع میں امی کی بات مان کر اس کے ساتھ رعایت نہ کرتی، یعنی جب وہ ملی کے بچے کی شکل میں آیا تھا۔ امی کی بات نہ مان کر ہی میں اذیت ناک کرب سے دوچار ہوں۔“ خوشبو بولی۔

”خیر جو ہوتا تھا تو ہو گیا، اس کے پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب بس کھاؤ پیو اور خوش رہو، اس کے سامنے اس طرح رہنا کہ جیسے تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ بالکل انجان، ہو سکتا ہے کسی بھی بہانے سے تم سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔“

دودن جب اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی

ہوگی تو ناقابل یقین حد تک طیش میں آجائے گا اور پھر ہر موضوع پر سوچے گا کہ یہ اچانک میرے ساتھ ایسا کون کر رہا ہے۔

مجھے اس کی ساری حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ بہر حال اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ بہت زیادہ دھمکی پر اتر آئے کیونکہ زخمی سانپ بہت زیادہ تڑپتا ہے، اس کی کسی بھی حرکت پر بے خوف رہنا۔

اتنے میں عتیق صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس پر چائے کے لئے دو کپ موجود تھے۔ ٹرے لا کر انہوں نے سامنے بڑی میز پر رکھ دی۔ پھر سامنے صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے۔ حکیم صاحب آج آپ نے تکلیف کیے کی، عتیق صاحب کی بات سن کر رولوکا بولا۔ ”دراصل میں نے خوشبو بیٹی سے چند باتیں کرنی تھی وہ میں نے کر لی ہیں۔ ٹھیک ہے خوشبو بیٹی، اب تم جا کر آرام کرو۔ چند منٹ میں میں چلا جاؤں گا۔ اور جو باتیں میں نے کی ہیں، انہیں دماغ میں رکھنا۔“

رولوکا کی بات سن کر خوشبو نے خدا حافظ کہا اور گھر کے اندر چلی گئی۔ عتیق صاحب کے اسرار پر رولوکا نے چائے پی اور مصافحہ کر کے ڈرائنگ روم سے نکل گیا تو دیکھا کہ تانگہ دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ عتیق صاحب نے تانگے والے کو پہلے ہی بلوایا تھا۔

”حکیم صاحب! آپ پیدل نہیں جائیں گے، آج آپ تانگے میں اپنے مطب تک جائیں گے۔ یہ میری خواہش اور التجا ہے۔“

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ”ٹھیک ہے عتیق صاحب، آج میں آپ کی بات مان لیتا ہوں اور میں تانگے میں ہی چلا جاؤں گا۔“

عتیق صاحب کو چوان سے بولے۔ ”رمضانی، حکیم صاحب کو بہت آرام سکون سے لے جانا، کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ملے اور تانگہ زیادہ تیز نہ چلانا جس

سے حکیم صاحب کو تکلیف ہو آرام آرام سے دلی مطب تک پہنچا دینا۔“

”ٹھیک ہے سرکار۔“ کوچوان بولا۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ اور یہ بول کر اس نے گھوڑے کو اشارہ دیا تو گھوڑا آگے ہی آگے بڑھنا لگا۔

ڈھائی گھنٹے میں کوچوان نے رولوکا کو دلی مطب کے پاس اتار دیا اور واپس آ کر عتیق صاحب کو بتا دیا کہ ”حکیم صاحب کو آرام سکون کے ساتھ میں نے پہنچا دیا۔“

بہر حال دن گزر گیا۔ رات آئی اور خوشبو اپنے کمرے میں جا کر آرام سے بے فکر ہو کر سو گئی، اسے تو پتہ تھا کہ آج کسی صورت بھی روشاک نہیں آئے گا۔ سکون سے بستر پر لیٹ گئی اور رولوکا کی صلاحیت اور طاقت کا دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ آج وہ ذہنی طور پر بہت ہی پرسکون تھی اور پھر ایک طویل عرصہ کے بعد بہت جلد نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

ادھر رات کے ساڑھے گیارہ بجے جب وہ جن زادہ روشاک خوشبو کے پاس آنے کے لئے اپنے قبیلہ سے نکلا اور جب خوشبو کے گھر سے تھوڑی دوری پر پہنچا تو وہ اچانک ایک شیشے کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ وہ شیشے کی دیوار بہت گرم تھی مگر آٹھ سے پوچھل، اسے چھونے سے لگتا تھا کہ یہ بہت کرم ہے مگر کوئی اندیکھی دیوار ہے۔

وہ کئی لمحے سوچتا رہا اور پھر وہ اوپر آسمان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جتنا اوپر گیا، وہ دیوار اپنی جگہ برقرار تھی۔ پھر وہ اوپر کو بڑھتے بڑھتے آسمان کی وسعت میں پہنچ گیا مگر وہ گرم دیوار بدستور اپنی جگہ قائم تھی۔

پھر آنا فانا وہ اوپر سے زمین کی طرف بڑی تیزی سے آیا اور زمین کے اندر گھستا چلا گیا، مگر یہ کیا زمین کے اندر بھی وہ دیوار موجود تھی۔ وہ پاتال میں گھستا چلا گیا۔ مگر پاتال میں بھی وہ گرم دیوار اپنی جگہ قائم تھی۔

اب تو اس کی پریشانی، گھبراہٹ دیدنی تھی۔ وہ پاتال سے اوپر کواٹھے اٹھتے زمین سے باہر نکل آیا اور ایک جگہ ٹھہر کر اس دیوار نما رکاوٹ کے متعلق غور کرنا

شروع کر دیا۔

وہ سمجھ چکا تھا کہ کوئی ایسی ہستی اس کے سامنے آ گئی ہے جو کہ بھرپور طریقے سے اس کی نگرانی کر رہی ہے اور اس ہستی نے اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے تاکہ میں خوشبو تک نہ پہنچ سکوں، مگر وہ ہستی کون ہے؟

اور اسے میری ذات سے کیا لیتا دینا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میری کسی ایسی ہستی سے کوئی مدد بھیج بھی نہیں ہوئی۔

پھر وہ سے کون جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔ خوشبو یا پھر اس کے گھر والے کسی کے پاس گئے نہیں اور نہ ہی انہوں نے کسی سے میرے متعلق کوئی بات کی ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ ”چھپ کر وار کرتا ہے، اگر ہمت ہے تو سامنے آ کر دکھ۔ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔“ پھر اس نے سوچا۔ ”میں اس کے متعلق پتا کیسے کروں، میری تمام کوششیں کمزور ہو گئی ہیں۔ پھر بھی وہ زبردست طریقے سے وار پر وار کرنے لگا، جس سے اس کے راستے میں حاصل رکاوٹ دور ہو جائے اور وہ خوشبو تک پہنچ جائے۔ مگر وہ کسی صورت بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ آخر پھر پھرے ہوئے زخمی ناگ کی مانند اپنے قبیلہ کی طرف پلٹ گیا۔ کیونکہ اس کا ایک مخصوص ٹائم ہوتا تھا اس ٹائم تک اسے ہر حال میں اپنے کمرے میں موجود ہونا ہوتا تھا۔

اپنے کمرے میں بیچ و تاب کھانے لگا، اس کی نیند اور آرام و سکون غارت ہو چکا تھا۔ اس شش و پنج میں اس کا وقت گزرنے لگا اور پھر ایک مقررہ وقت پر اس کے والد نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے اس نے آواز دی۔ ”جی ابا حضور! میں جاگ گیا ہوں۔“

صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا۔ وہ سوچوں کے پہاڑ تلے دبار ہا، اس نے لاکھ جتن کر لئے مگر اس راز کو جاننے سے قاصر رہا کہ اسے کون اور کیوں پریشان کر رہا ہے؟

اور پھر ابھی ادھیڑ بن میں دن کے ڈھائی بج

گئے اب اس کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی تھی، اس نے گھر والوں اور قبیلہ والوں سے نظریں ہٹا کر خوشبو کے گھر کی طرف اڑاٹن بھری مگر اس جگہ پہنچ کر اسے پھر مایوسی ہوئی کیونکہ رات کی طرح اس وقت بھی وہ رکاوٹ والی گرم اندیکھی دیوار موجود تھی۔ جب اسے مکمل یقین ہو گیا کہ وہ رکاوٹ تو بدستور اپنی جگہ قائم ہے تو مجبوراً اپنے قبیلہ میں واپس آ گیا۔

رات آئی تو اس کی بے چینی مزید دو چند ہو گئی اور پھر رات کے ساڑھے گیارہ بجے اپنے کمرے سے نکلا خوشبو کے گھر جانے کے لئے اور پھر اس جگہ آ کر اسے مایوس ہونا پڑا کیونکہ اس کے راستے میں وہی گرم اندیکھی دیوار موجود تھی۔ آج تو اس نے اپنی تمام جتنی تو تیں آزمائیں مگر وہ دیوار اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

طرح طرح کے بے شمار وار کر کے جب وہ تھک گیا تھا پھر طوعاً و قراً واپس پلٹ گیا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ جیسے بن جل پھیل ہوئی ہے۔ یا پھر جیسے کسی زندہ وجود کو آگ میں پھینک دیا گیا ہو۔ وہ اپنے کمرے میں موجود تڑپتا رہا مگر اس کے دماغ میں کوئی بھی حل نہیں آیا، وہ ہر صورت یہ نہیں جان سکا کہ وہ کون ہے جو اس کے راستے میں سنگلاخ پہاڑ کی طرح کھڑا ہو کر رکاوٹ ڈال رہا ہے۔

ادھر خوشبو اپنی جگہ بہت مطمئن اور خوش تھی کہ حکیم کامل نے اسے اپنے مضبوط ٹکٹے میں جکڑنا شروع کر دیا ہے اور اس کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی ہے ورنہ ہر صورت میں وہ آتا ضرور، اس سے پہلے ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ متواتر دو دن اور دو رات نہ آیا ہو، آندھی ہو یا طوفان وہ آتا ضرور تھا۔

آج تیسرا دن تھا اور خوشبو کو پتہ تھا کہ آج وہ ضرور آئے گا کیونکہ رولوکا نے خوشبو کو بتا دیا تھا کہ میں صرف دو دن کے لئے اس کے راستے میں رکاوٹ حائل کر دوں گا اور تیسری رات میں وہ ضرور آئے گا کیونکہ

تیسری رات میں وہ رکاوٹ میں ہٹا لوں گا۔
اور پھر تیسری رات آگئی۔ گھٹا نوپ اندھیرا ہر
سو چھا گیا۔ اس کے سارے گھر والے اپنے اپنے
کمروں میں آرام کرنے لگے۔ رات کے ساڑھے
گیارہ بجے وہ طوفان کی طرح باہر نکلا اور خوشبو کے گھر
کی طرف کارخ کیا۔

مگر یہ کیا! آج تو اس کے راستے میں وہ
رکاوٹ والی دیوار غائب تھی۔ اس رکاوٹ کو نہ پا کر اس
کی بانچیں کھل گئیں۔ اور پھر وہ تیزی کے ساتھ خوشبو
کے گھر کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ خوشبو حسب معمول
اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور
اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھا ہوا تھا۔ اس
انداز سے کہ وہ بہت زیادہ سوچوں میں غرق ہے۔

کمرے میں آ کر چند ساعت وہ بالکل خاموش
کھڑا رہا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ آج کمرے میں بھی
کوئی اندیکھی، ہستی موجود نہیں اور خوشبو بھی بے حس و
حرکت پڑی ہوئی تو اس نے آواز دی۔ ”خوشبو۔“

خوشبو کی ساعت سے جیسے ہی اس کی آواز نکلائی
تو خوشبو نے جھٹ اپنی آنکھیں کھول دیں، اور اسے
یک ننگ دیکھتے ہوئے فوراً بستر سے اٹھی اور تیزی سے
نیچے اتر کر اس کے سینے سے لگ گئی اور بہت ہی زیادہ
لگاؤ سے بولی۔ ”آپ دو دن کہاں رہے؟ انتظار
کرتے کرتے میری آنکھیں جیسے پتھر اگی ہیں۔ آپ
نے مجھے تڑپتا ہوا چھوڑ دیا۔“

اس نے خوشبو کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ اس کی
حالت اپنی جگہ بہت غیر عادی تھی۔ وہ بالکل بدحواس ہو رہا تھا،
اس کی حالت ایسی تھی کہ جیسے کوئی پرندہ پنجرے سے
آزاد ہو گیا ہو، اس نے اپنے ہونٹ خوشبو کی گردن پر
ٹکا دیئے اور پھر اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ خوشبو کی
گردن سے ہوتے ہوئے اوپر کو بڑھنے لگے۔ خوشبو
ایسی حالت میں تھی کہ جیسے ساکت ہو گئی ہو۔

اس کے ہونٹ متواتر گردن سے چرے اور پھر
گال سے ہوتے ہوئے خوشبو کے ہونٹوں میں پیوست

ہو گئے، پھر خوشبو کے پورے وجود میں ایک سرد لہر دوڑ
گئی، اس کے پورے جسم میں اچانک ایک پچی سی طاری
ہوئی جسے روشاک نے بخوبی اور واضح طور پر محسوس
کرتے ہوئے خوشبو کے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا کچھ
زیادہ ہی تنگ کر دیا۔

آج پہلی مرتبہ اس کی طاقت کا خوشبو کو احساس
ہوا، خوشبو اس کی بانہوں میں کسمانے لگی۔ مگر باوجود
کوشش و کسمانے کے اس کی بانہوں سے نکلتا خوشبو
کے بس سے باہر تھا۔ پھر اسی حالت میں خوشبو کے گرد
اپنی بانہوں کا گھیرا تنگ کئے بستر کی جانب وہ بڑھنے لگا،
خوشبو کو اس نے اوپر اٹھایا اور بستر پر آرام سے لٹا دیا۔

خوشبو کی آنکھیں بند تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے
خوشبو کے پورے وجود اور دل و دماغ پر سحر پھونک دیا گیا
ہو۔ خوشبو کی حالت بالکل غلط تھی، یوں محسوس ہوتا تھا
کہ جیسے اس کے جسم سے جان نکال لی گئی ہو۔ اس کے
پورے جسم پر سکنت طاری تھا۔ مگر سانس لینے کی وجہ سے
خوشبو کا سینہ اوپر نیچے ہوتا محسوس ہوتا تھا۔

خوشبو کو وہ یک ننگ لٹکیا باندھے چند کھڑی دیکھتا
رہا پھر اچانک وہ خوشبو کے نرم و ملائم نازک گالوں پر
اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی
اندرونی بھجائی کیفیت بڑھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر
ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ اپنی گردن گھما کر
اپنے دائیں بائیں اور سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔ اس کا
انداز بتا رہا تھا کہ شاید وہ بغور کسی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔

اس کی آنکھوں میں ایک انجانی چمک پیدا
ہوئی، ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں
پھر اس کی آنکھوں سے سرخ شعاعوں کی دو لکیریں
نکلیں اور خوشبو کے دماغ میں گھس چلی گئی۔ اس کے
بعد ان سرخ شعاعوں کا وجود ختم ہو گیا تو وہ مسکراتے
ہوئے مجسم خوشبو کے پورے وجود پر اوندھے منہ جیسے
ڈھے گیا۔

اچانک کمرے میں ایک گرجدار آواز گونجی۔
(جاری ہے)



بھیا ننگ سزا

شائستہ اختر۔ راولپنڈی

گائٹوں کے لوگ اسے آسیبی بیماری کہتے تھے، ڈاکٹر یا حکیم کے
پاس اس بیماری کا علاج نہ تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ اس
بیماری سے صرف اور صرف معصوم بچے ہی ہلاک ہوتے تھے،
بڑے بالکل محفوظ تھے۔

حرص و طمع کے مثالی لوگ اکثر عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔ ایک سبق آموز کہانی

نور پور چھوٹا سا قصبہ تھا جو ایک خوبصورت پہاڑی
علاقے میں آباد تھا اس قصبے میں اکثر سیاح خوبصورت
مقامات سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے تھے۔ مگر
کچھ عرصے سے اس قصبے کی خوبصورتی کو جیسے کسی کی
نظر کھا گئی تھی۔ کیونکہ کچھ ہی عرصے سے وہاں کسن بچوں کی
اموات میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تھا۔ ایک پراسرار قسم
کی کوئی بیماری تھی جس نے کئی تندرست بچوں کو اپنی پلیٹ
میں لے لیا تھا۔ اچھے خاصے تندرست بچے رات کو سوتے
اور صبح اپنے بستر پر مردہ حالت میں پائے جاتے تھے۔
گاؤں کے اکثر لوگ اس بیماری کو آسیب کا نام

وہ خوف زدہ نگاہوں سے اس وجود کو دیکھ
رہا تھا جو کسی چونک کی طرح اسکے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ یہ
..... یہ سب کیا ہے؟ چھوڑ دیجئے۔ وہ مذہبی آواز میں چیخا
اور خود کو اس وجود کی گرفت سے چھڑوانے کی ناکام کوشش
کرتے ہوئے دروازے کی طرف اس نے بڑھنا چاہا
مگر وہ ایسا نہ کر پایا اور چکر کر زمین پر آگرا۔ وہ تنہا سا
وجود اس کے اوپر سوار ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی من
وزن اس کے اوپر آن گرا ہو۔ اس نے مدد کے لئے پکارنا
چاہا مگر آواز جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ یکدم اسے
باہر سے کئی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

دیتے تھے، جو رات کے کسی پہر معصوم بچوں کی جان لے لیتا تھا۔

علاقے کی انتظامیہ سخت دباؤ میں تھی کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس اس بیماری کا علاج نہ تھا حیرت کی یہ بات بھی اس بیماری سے صرف بچے ہی جاں بحق ہوتے تھے۔ بالغ لوگ اس بیماری سے بالکل محفوظ تھے۔

ریاست جو ای قصبہ کا رہائشی تھا علاقے میں نہایت معزز شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس نے کئی سال مختلف عملیات کیے تھے۔ قصبہ والوں کی آخری ڈھارس وہی تھا لوگ ہر روز اس کو اپنا سمجھا کر کوئی نا کوئی تعویذ اس سے لے کر چلے جاتے تھے مگر موت جب کسی انسان کا تعاقب کرے تو اس سے پھر بچھا چھڑوانا ناممکن بات ہے۔ حاجی غلام رسول کا گھر انہ قصبہ میں واحد گھر نہ تھا جو اس بیماری سے محفوظ تھا مگر وہ سخت پریشانی میں مبتلا تھے کیونکہ ان کا بھی پانچ چھ سال کا بیٹا بیمار تھا ان کو ہر وقت یہی دھڑلکا رہتا تھا کہ کہیں وہ شخص بیماری ان کے تخت جگر کو بھی نہ لنگل لے لے لے وہ وقت ضائع کے بغیر مختار کو شہر کے ایک مشہور عامل کے پاس لے گئے۔

عامل نے مختار کے گلے میں تعویذ ڈالا اور کلام الہی پڑھ کر اس پر دم کر دیا۔ غلام رسول کو عامل نے پوری تسلی دی کہ ”اب انشاء اللہ وہ آفتوں سے محفوظ رہے گا۔“

غلام رسول کو خدا کی ذات پر بڑا بھروسہ تھا سو وہ مختار کو لے کر واپس قصبہ میں آگئے غلام رسول کی قصبہ میں مختار کے ساتھ واپسی پر ہر شخص حیرت زدہ تھا۔ قصبہ کے لوگ ان دونوں کو ایسے گھورے تھے جیسے وہاں بیٹا کوئی عجوبہ ہوں۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں غلام رسول کے لئے مسخر تھا۔ جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ قصبہ میں مہلک بیماری نے ڈیرا ڈالا ہوا ہے اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں لے آئے تھے کچھ لوگ غلام رسول کی بیوقوفی پر خسوس کر رہے تھے غلام رسول ان کی پرواہ کئے بغیر بیٹے کا ہاتھ تھامے بڑے اعتماد سے اپنے گھر کے دروازے کے قریب پہنچے۔

ریاست اتنے میں نمودار ہوا۔ ”آپ کدھر غائب تھے۔“ وہ غلام رسول سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

غلام رسول مسکرا کر بولے۔ ”آپ تو جانتے ہیں کہ قصبہ میں کتنی خطرناک بیماری کی وبا پھیلی ہوئی ہے، بس اسی بیماری سے محفوظ رکھنے کے لئے مختار کو شہر دم کروانے لے گیا تھا وہ بہت مشہور عامل ہیں۔“

”اچھا کیا مگر ہر عامل ٹھیک نہیں ہوتا کچھ فراڈی ہوتے ہیں، آپ کو چاہئے تھا مختار کو میرے پاس لے آتے۔“ ریاست بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

غلام رسول صاف گھوٹی سے بولے۔ ”دل تو میرا یہی کر رہا تھا مگر اس کی ماں کو کون سمجھائے عورتوں کے دماغ میں جب ایک بات گھس جائے تو اس کو ٹکانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کسی جاننے والے نے اسے شہر والے اس عامل کا پتہ بتایا تو بس پڑ گئی میرے پیچھے مجبوراً مجھے اسی عامل کے پاس جانا پڑا۔“

ریاست مسکرا کر بولا۔ ”چلیں پھر اگر میری خدمت کی ضرورت پڑی تو ضرور یاد رکھیے گا میں ایک کام سے نکلتا تھا، آپ چلیں اپنے گھر پھر ملاقات ہوگی۔“

ریاست آگے بڑھ گیا تو غلام رسول بچے کو لے کر گھر میں داخل ہو گئے۔

کئی روز بیت گئے قصبہ میں کوئی اندوہناک واقعہ رونما نہ ہوا، سب لوگوں کی نظریں غلام رسول کے گھر پر تھیں کیونکہ غلام رسول کا گھر موت کے تختے سے محفوظ تھا مگر غلام رسول کو پورا یقین تھا کہ ان کے بیٹے کو یہ موذی بیماری ہرگز لاحق نہیں ہو سکتی۔

لیکن کچھ حادثات ایسے ہوتے ہیں جن کو روکنا انسان کی دسترس میں نہیں ہوتا کیونکہ وہ مقدر میں لکھ دیئے جاتے ہیں، غلام رسول بھی سوچ نہیں سکتے تھے کہ جو بچہ ان کے ساتھ ہونے والا تھا۔

ایک شام مختار سودا لینے کے لئے گھر سے نکلا اور پھر واپس نہ آیا۔ اس کو قصبہ کے چپے چپے میں تلاش کیا گیا مگر وہ نہ ملا۔ غلام رسول کی بیوی کا رورور برا حال تھا، کوئی بد بخت اس کے بچے کو اغوا کر کے لے گیا تھا مگر وہ کون تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

غلام رسول نے اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ

بھیا تک سزا۔ شائستہ سحر

تھانے میں درج کروائی۔ مگر پولیس بھی مسلسل کوشش کے باوجود مختار کو ڈھونڈ نہ پائی۔

مختار کو لایا۔ ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ غلام رسول کا گھر کی ماتم کدہ سے کم نہیں رہا تھا بیٹے کی اچانک گمشدگی نے دونوں میاں بیوی کو بے حال کر دیا تھا۔

شاہ زیب نامی ایک دس سالہ بچہ جو کہ اس خوف ناک عفریت کی وجہ سے اپنا چھوٹا بھائی کھو چکا تھا ڈور اور سہا ہوا اپنی ماں کے ہمراہ غلام رسول کے گھر میں داخل ہوا۔

غلام رسول کی بیوی بستر پر کسی لعش کی طرح پڑی اپنے بیٹے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی غلام رسول پریشان حال صدمے سے چوریشے تھے اور اپنی منماک آنکھوں سے دروازے کو گھورے جا رہے تھے۔ ان کی بے چین نگاہوں کو اب بھی اپنے بیٹے مختار کا انتظار تھا۔

”رشدہ..... رشدہ“ غلام رسول کی بیوی کو پکارتے ہوئے کمرے میں وہ داخل ہوئی مگر غلام رسول کو کچھ کڑھٹک گئی۔ غلام رسول بے جان لہجے میں بولے ”کیا بات ہے؟“

وہ شاہ زیب کو بازو سے پکڑ کر بولی۔ ”اس کم بخت نے پہلے کچھ نہیں بتایا مختار کے بارے میں۔“ مختار کا نام سن کر غلام رسول کے منہ میں وجود میں تحریک پیدا ہوئی وہ اٹھ کر بولے۔ ”مختار کے متعلق کیا جانتا ہے؟“ آپ پوچھیں اس سے وہ شاہ زیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

غلام رسول تیزی سے شاہ زیب کی طرف بڑھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر گڑ گڑائے ”کہاں ہے مختار بتاؤ بیٹے۔“ شاہ زیب بہت زیادہ خوف زدہ تھا، اس کا وجود کا پتہ رہا تھا وہ حراساں نگاہوں سے غلام رسول کو گھورنے لگا۔ ”بتاؤ بیٹے“ غلام رسول التجا کرتے ہوئے بولے۔ شاہ زیب ہٹکایا۔ ”وہ اور وہ مختار کو ریاست چاچا لے گئے تھے اس شام، میں نے خود دیکھا تھا۔“

”ریاست چاچا لے گئے تھے۔“ غلام رسول حیرت سے بڑبڑائے۔ ”مگر کیوں؟“ غلام رسول نے اس سوال کے ساتھ ہی اس کو جھجھوڑ ڈالا۔

”مم..... میں نہیں جانتا“ وہ بڑی مشکل سے ہٹکایا

اور رونے لگا۔ شاہ زیب کی ماں ایک تھپڑ اس کے منہ پر مار کر بولی۔ ”اس کم بخت نے بھی ایسی بتایا ہے، پہلے بول پڑتا تو اچھا تھا۔“ ریاست کا نام سن کر غلام رسول کے دماغ میں بہت سے سوالات اٹھنے لگے۔ ریاست کو بھی اس نے اسی دن سے قصبہ میں نہیں دیکھا تھا جب سے مختار غائب تھا۔ مختار گمشدگی کے ساتھ ریاست کی قصبہ سے عدم موجودگی کو کسی شخص نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر یہ غور طلب بات تھی۔

غلام رسول اپنے آپ کو کون سے لگے کہ انہیں اس بات پر غور کرنا چاہئے تھا۔ مگر وہ غم سے اس قدر غمگین تھے اپنی کی بات کا ہوش کہاں تھا۔

وہ فوراً اٹھے اور تھانے چلے گئے اور اپنا سارا مسئلہ بیان کیا۔ انسپٹر نے بڑے جھل سے کہا۔ ”غلام رسول تم سمیت سارا قصبہ جانتا ہے کہ ریاست ایک بہت اچھا انسان ہے۔ قصبہ میں کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ اپنے گھر میں بند ہو کر کئی دن چلے کاٹتا رہتا ہے۔ لیکن قانون سب کے لئے ایک جیسا ہے، ہمیں شک ہے تو ابھی تمہارا شک دور کرنے دیتے ہیں اشو۔“

یہ کہہ کر انسپٹر اپنے دو ماتحت پولیس اہل کاروں اور غلام رسول کے ہمراہ ریاست کے گھر پہنچا۔ قصبہ کے اور بھی بہت سے لوگ ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انسپٹر نے دروازہ کھٹکھٹایا، دھڑ دھڑایا، مگر جواب نہ مارا، لہذا دروازے کا تالا توڑ کر وہ اندر داخل ہوئے مگر اندر کا منظر ایسا تھا جو سب پر لرزہ طاری کر رہا تھا۔

ریاست اونٹ سے من زمین پر پڑا تھا۔ اس کے اوپر مختار کا خون آلود وجود ہوتا تھا جس نے اسے بری طرح اپنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔ کمرے میں مردہ وجود کی بو پھیلی تھی۔ وہاں ایک لمحہ بھی کھڑے ہونا محال تھا انہوں کی آوازن کر ریاست نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں اور گڑ گڑایا ”خدا کے لئے اس سے مجھے بچاؤ، یہ میری جان نہیں چھوڑ رہا۔ میرے وجود سے جدا نہیں ہو رہا، خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔“ وہ اذیت سے رونے لگا۔

یہ منظر ایسا تھا کہ وہاں موجود ہر شخص توبہ استغفار کر رہا تھا غلام رسول خود بھی غم و حیرت میں مبتلا اپنے



خونی جوکر

ایس حبیب خان - کراچی

رات کا سناٹا ہر سو مسلط تھا، کمرے میں جان لیوا خاموشی طاری تھی کہ اچانک ایک کھلونے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کھلونے کا وجود بڑھنے لگا پھر اس نے ایک جوکر کا روپ دھار لیا اور اس نے آگے بڑھ کر لڑکی کی گردن دبوچ لی۔

کیا ایسا ہوتا ممکن ہے؟ ایک دل گرفتہ حقیقت جسے پڑھنے والے دنگ رہ جائیں گے

ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور بلیک اسکرین کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے اٹھ گئی۔

ناشتے کی میز پر مدھونے جلدی جلدی جوس ختم کیا اور سینڈویچ ہاتھ میں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ مدھو آرام سے اس کی مام بولیں۔ ”مام میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ اور جلدی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

مدھونے ریموٹ اٹھایا اور صوفے پر گر کر ٹی وی آن کیا اور بغیر سر اٹھائے فریج فرائز کھانے لگی پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر اسکرین دیکھی اور دھک سے رہ گئی بے اختیار اس نے خوف سے آنکھیں موند لیں۔ کافی دیر گزرنے کے بعد اس نے ایک آنکھ میں جھیری بنا کر اسکرین کی طرف دیکھا اور لمحہ بھر میں آنکھ واپس بند کر لی اور بند آنکھوں میں ہی ہاتھ بڑھا کر

ہی ڈن کر دوں گا مگر مختار کو چھری سے ذبح کرنے کے بعد میں جیسے ہی اسے اٹھانے کے لئے جھکا اسی کا مردہ وجود مجھ سے چٹ گیا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اسے خود سے الگ کر سکوں مگر یہ مجھے ہی جانے نہیں دیتا۔ خدا کے لئے اسے مجھ سے الگ کر دو ورنہ میں اس کے منوں وزنی وجود کے بوجھ سے مر جاؤں گا۔“ وہ روتے ہوئے گر گڑاٹنے لگا۔

تھپے کا ہر شخص ریاست کو نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے مہذب چہرے میں کتنا مکروہ چہرہ چھپا تھا۔ وہ کتنے معصوم بچوں کا قاتل تھا مگر قدرت سے جواز سے سزا ملی تھی وہ بہت بڑی اور اذیت ناک اور بھیا تک تھی۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ ریاست کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے مگر کچھ باشعور لوگوں نے مشورہ کیا کہ شہر سے اسی عامل کو بلایا جائے جس نے مختار کے لئے تعویذ دیا تھا۔ ریاست کو جو قدرت کی طرف سے سزا ملی تھی اس کے دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آ رہے تھے۔

ریاست اذیت اور شرمندگی سے مر اجار ہا تھا۔ وہ خدا سے اپنی موت کی دعا کر رہا تھا۔ کبھی گنہگاروں کی دعا بھی قبول ہو جاتی ہے۔ جس وقت تک شہر والے عامل تھپے میں پہنچے۔ ریاست کا وجود زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ شہر سے آئے ہوئے عامل نے ریاست کا حال دیکھتے ہی کہا۔ ”یہ بچہ یوں کبھی بھی اس شخص کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کا ایک ہی حل ہے اس بچے کی ماں خود اپنے ہاتھوں سے اس بچے کے مردہ وجود کو اس بد بخت سے جدا کرے۔“

بڑی کوشش کے بعد غلام رسول کی بیوی رشیدہ کو وہاں لایا گیا۔ رشیدہ کی حالت بہت خراب تھی، اسے سہارا دے کر وہاں لے کر آئے تاہم اپنے لخت جگر کے مردہ وجود کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی اس نے نرمی سے اپنے لخت جگر کے بے جان وجود کو ریاست کے مردہ وجود سے جدا کیا اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اس حیرت ناک واقعہ نے وہاں موجود ہر شخص کو شذر کر دیا تھا۔ سچ کہتے ہیں قدرت کا انتقام بہت برا ہوتا ہے۔



بچے کی لاش کو دیکھ رہے تھے جو ریاست کے لئے بدترین سزا بن چکی تھی۔ پولیس اہلکاروں نے بڑی کوشش کی کہ مختار کے ننھے وجود کی گرفت سے ریاست کو چھڑوا سکیں۔ مکروہ ایسا نہ کر سکے۔ یہ انتہائی عبرت ناک منظر تھا جس نے ہر دیکھنے والی آنکھ کو دم بخود کر ڈالا تھا۔ پولیس اہلکار بڑی مشکل سے ریاست اور مختار کے مردہ وجود کو ٹھیکیت کر کرے سے باہر لے گئے۔

غلام رسول نے روتے ہوئے ریاست سے پوچھا۔ ”تم نے میرے لخت جگر کو کیوں مارا اس معصوم نے تمہارا کیا گناہ کیا تھا؟“ ریاست بڑی مشکل سے بولا۔ ”آج سے تقریباً ایک سال پہلے ایک عورت نے مجھ سے عمل کروایا تھا وہ عقلی عمل اس نے اپنے کسی دشمن کے کم سن بچے کو مرنے کیلئے کروایا تھا مگر میری بد قسمتی کے عمل میں ذرا سی کوتاہی سے وہ عمل الٹا ہو گیا اور میرا لخت جگر ایک پراسرار بیماری کا شکار ہو کر مر گیا۔ مگر میں نے یہی مشہور کر دیا کہ ”میرا بیٹا معمولی بخار کے بگڑ جانے کی وجہ سے فوت ہوا ہے۔“ میری بیوی رات دن بیٹے کی جدائی میں تڑپتی رہتی آخر اس صدمے نے میری بیوی کی بھی جان لے لی۔ تب میرے دل میں انتقام کی آگ بجھنے لگی۔

مجھے جلن ہوئی تھی جب میں دوسرے لوگوں کے بچوں کو ہتے کھیلنے دیکھتا تھا اس لئے میں نے اپنے انتقام کا نشانہ چھوٹے بچوں کو بنانا شروع کر دیا۔ تھپے میں جس جس گھر میں معصوم بچے ہوتے ان میں سے کسی ایک کو اپنے خطرناک عمل کے ذریعے نشانہ بناتا لگا۔

صرف غلام رسول کا گھر ایسا تھا جہاں ایک معصوم بچہ زندہ سلامت تھا اور میرے انتقام کی آگ سے محفوظ تھا کیونکہ غلام رسول شہر میں رہنے والے عامل سے نورانی علم کا تعویذ لائے تھے اور وہ تعویذ تم نے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ اس تعویذ کے سامنے میرا عقلی علم بیکار ہو جاتا تھا۔

جب میں کچھ نہ کر سکا تو میں تمہارے بیٹے مختار کو ہلا بھلا کر پہلے اپنے گھر لے آیا پھر میں نے اسے بے ہوش کر دیا سوچا تھا کہ اسے قتل کر کے اپنے گھر کے صحن میں

سے پریشان نہ لی۔

روجر جب روم میں داخل ہوا تو اسے وہاں کا ماحول بہت عجیب لگا۔ ایک طرف بیچک شوکا جو کہ بیضا تھا مگر اس کے آگے آگ جلی ہوئی تھی اور وہ انسانی کھوپڑی پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کر بیٹھا تھا۔ ایک دم سے اس نے آنکھیں کھولیں تو روجر اچھل گیا۔ ”آئی ایم سوری! شاید میں غلط ٹینٹ میں آ گیا ہوں۔“ اور واپس پلٹنے لگا۔ ”ظہور! تم ان سب سے ڈر رہے ہو، یہ کچھ نہیں میرا ذاتی سامان ہے تم تو لوگوں میں کیا کام ہے۔“

”کیا تم جادو کرتے ہو؟“ روجر نے پوچھا۔ ”تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے اپنا کام بتاؤ۔“ اور پھر روجر نے اس سے اپنی فرینڈز کو ڈرانے کا کام طے کر لیا۔

”گائز شو ہے کس کا؟ راک کنسرٹ؟ مدھونے ایکسٹینڈ ہوتے ہوئے پوچھا۔“ ”یو آ کری پیٹ چلے گا۔“ ”اٹس سر پرائز۔“ ہاں اس بات کی گارنٹی ہے کہ مزہ بہت آنے والا ہے۔ مدھیر نے آنکھ مارتے ہوئے اپنے دوستوں کو دیکھ کر کہا تو سب سکرانے لگے۔ مدھونے کار کے شیشے میں سے بڑا بڑا ”بیچک شو“ لکھا ہوا دیکھا تو منہ بنا کر بولی۔ ”تم لوگ بھی حد کرتے ہو، دودھ پیتے بچوں کی حرکت کی ہے تم نے بیچک شو دیکھنے کی عمر ہے تمہاری؟ یہ سر پرائز تھا؟ شیم آن یو گائز۔“ ہم نے کب کہا کہ یہ سر پرائز ہے۔ وہ تو ہمیں آئے گا، وہ سب اندر جا کر سیٹوں پر بیٹھ گئے اور شو شروع ہو گیا۔ ایک دو آئٹم کے بعد پردہ گر گیا۔ مدھو بوریٹ سے جمائیاں لینے لگی پھر پردہ اٹھا تو وہاں ”جوکر“ نمودار ہوئے اور لوگوں کے دل بہلانے لگے۔ جہاں لیتی مدھو کا منہ جوکرز کو دیکھ کر کھلا کا کھلا رہ گیا۔ خوف کی جھرجھریاں اسے سر سے پیر تک محسوس ہونے لگیں وہ ایک دم سیٹ سے اٹھ کر بھاگی اور باہر نکل آئی۔

”جوکر سے مدھو کی روح فنا ہو جاتی تھی اور یہ خوف بچپن سے تھا اس کے کھلونوں میں بھی کوئی جوکر نہیں تھا۔ جوکر کو دیکھ کر اسے ایک انجانا خوف گھیر لیتا کہ

مدھو اپنی مام کے ساتھ رہتی تھی اس کے پاپا اس دنیا سے جا چکے تھے، کالج پہنچ کر مدھو اپنے فرینڈز کے پاس آ گئی۔ ”اب چلو بھی تمہاری وجہ سے ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔“ اس کے دوستوں نے کہا اور کلاس لینے چل دئے۔ کلاس کے بعد وہ لوگ کینیٹین میں بیٹھ کر برگر اور کوڈرنگ انجوائے کرنے لگے۔

”تم لوگوں نے کل کی نیوز دیکھی؟ مجھے تو اس طرح لوگوں کو ایک دوسرے کو مارتے دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔“ لیش نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سچ میں مجھے بھی بہت برا لگ رہا تھا وہ سب دیکھ کر۔“ روجر نے اس کی تائید کی، پتا نہیں کیوں یہ لوگ بٹے ہوئے ہیں، سب انسان ہیں تو ایک کیوں نہیں ہو جاتے، مل کر ہیں ہماری طرح، ہمیں دیکھو مدھو، مناشی روجر، لیش مذہب، میں خود ہم سب الگ ہو کر بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ مدھیر نے افسردہ ہو کر کہا۔

”کم آن گائز ویسے ہی کیا کم ٹیشن ہے جو پھر یہ سب باتیں کر رہے ہو۔“ مدھو بولی۔

”تم جیسے ہی لوگ تو ہوتے ہیں جو خود تو کچھ کرتے نہیں دوسروں کو بھی نہیں کرنے دیتے۔“ روجر بولا۔

”چھوڑا راکل کے بیچ کا بتا کیا ہوا؟ میں باہر تھا دیکھنا ہی نہیں ہوا بیچ۔“ لیش بولا۔

”ہونا کیا تھا، فیڈر ری جیٹا اینڈی کو اسٹریٹ سیٹس سے ہرا دیا ہے۔“ مدھیر بولا اور پھر بیچ کی باتوں میں سب گم ہو گئے آخر ان کے فیوڈریٹ فیڈر کا بیچ تھا۔ ”بھی میں نے تم لوگوں کو ایک ضروری بات کے لئے بلایا ہے۔“ روجر نے مناشی مدھیر اور لیش سے کہا۔ ”دودن بعد فرسٹ اپریل ہے اور اب کی بار ہم مدھو کو فوٹو بنائیں گے، پچھلے سال دیکھا تھا اس اکیلی نے ہم سب کو فوٹو بنایا تھا۔ اب اس کی باری ہے۔“

”گڈ آئیڈیا! روجر۔“ مناشی بولی اور پھر وہ پلاننگ کرنے لگے۔ پھر انہوں نے مدھو کو کال کی کہ ”اپنی مام سے پریشان نہ ہو دودن بعد شو ہے اور پاسز آ گئے ہیں۔ ہم سب جائیں گے۔“ مدھونے اپنی مام

جوکر اسے مار ڈالے گا۔ اس کے چہرے کے رنگوں سے اس کو گھبراہٹ ہوتی تھی کیوں؟ یہ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا وہ تو کسی فلم کے سین میں بھی جوکر کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی تھی یہاں تو بیچ کے جوکرز تھے اسے اپنے فرینڈز پر غصہ آ رہا تھا۔ ”بھلا ایسا مذاق بھی کوئی کرنے کا ہے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ میں جوکر سے کتنا ڈرتی ہوں۔“ وہ روتی ہوئی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی اور سیٹ سے نکل لگا کر آنکھیں بند کر لیں مدھو کے فرینڈز گاڑی سے کچھ دور کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ ”کیوں روجر! سر پرائز کا وقت کب آئے گا؟“ سب نے کہا۔ ”بس یہ آوا گیا۔“ روجر بولا اور سب ہنسنے لگے۔

ادھر مدھو کی آنکھیں بند تھیں اچانک اسے اپنی ران پر کسی کی انگلیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں وہ بھی مناشی ہوئی مگر پھر اس نے سوچا کار کا گیٹ تو کھلا ہی نہیں اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نظر اپنی ران پر گئی۔ وہاں ایک ہاتھ تھا جس نے ”سفید دستانہ“ پہنا ہوا تھا اس نے چونک کر نظریں اوپر کیں تو اس کی کٹی گم ہو گئی سامنے جیتا جاگتا جوکر اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔

گہرے گہرے رنگوں والا گول ناک، بھنجاسر وہ پورا منہ کھول کر ہنسا تو اس نے چچنیں مارنی شروع کر دیں۔ اسے لگ رہا تھا اس کا دل پھٹ جائے گا اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور بے تحاشا تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا وہ اندھا دھند دوڑ رہی تھی اور پارکنگ سے نکل کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا جوکر اس کے پیچھے آ رہا تھا اس نے دائیں بائیں گردن گھما کر دیکھا اور بائیں طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی راستہ نیچے کی طرف ہو گیا دوڑتے دوڑتے وہ ایک زبردست طریقے سے منہ کے بل گری کوئی چیز تھی جو اس کے پیروں سے ٹکرائی تھی اس کا منہ مٹی میں اٹ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو درود کی ایک شدید لہر اس کے پیروں میں دوڑ گئی۔ مدھونے نیچے دیکھا وہاں زمین پر سریے پڑے تھے۔ اس کو دور سے قدموں کی آواز آنے لگی۔ اس نے گھبرا کر ایک سریا اٹھایا اور ایک طرف اڑ کر بیٹھ گئی۔ اس

کے آگے چھوٹی سے جھاڑی تھی جس سے وہ کچھ حد تک چھپ گئی تھی۔ جیسے ہی وہ جوکر قریب آیا تو مدھو وارلٹ ہوئی اس جوکر کی پیٹھ اس کی طرف تھی اس نے اٹھ کر ایک بھر پورا وار اس کے سر پر کیا وہ اپنا سر پکڑ کر گھوما اور مدھو کو دیکھتے ہوئے لہرا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ مدھو دھڑکیں مار مار کر رونا شروع ہو گئی اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی اتنے میں اس کے فرینڈز بھی وہاں پہنچ گئے مناشی نے مدھو کو سنبھالا اور روجر زمین پر پڑے جوکر کو ٹولنے لگا۔ ”اوہ شٹ!“ وہ زور سے بولا مدھیر نے آگے بڑھ کر اس کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی۔ ”یہ تو مریگا!“ اس کا یہ کہنا تھا کہ سب کو سانپ سوگ گیا۔

”میں نے اس کو جان بوجھ کر نہیں مارا، میں نے ڈر کر اس کو بھگانے کے ارادے سے مارا تھا، مجھے کیا پتہ تھا یہ مری جائے گا!“ مدھونے روتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو اس بات کو، اب یہ سوچو کرنا کیا ہے؟“ مناشی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ہمیں اس کو ٹھکانے لگانا ہو گا ورنہ اگر کسی نے دیکھا تو ہم سب لاک اپ میں ہوں گے۔ لیش کہنے لگا۔

پھر ان لوگوں نے وہیں گڑھا کھودا اور اس مریے ہوئے جوکر کو مٹی میں دبایا۔

مدھو کی حالت قبل رجم ہو رہی تھی مناشی کا دل اسے دیکھ کر کٹ رہا تھا اس کو خود سمیت روجر، لیش اور مدھیر پر غصہ آ رہا تھا۔ ”ہم سب نے انتہائی بے ہودہ مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ مدھو پلیز ہمیں معاف کر دو۔“ اس نے مدھو سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

”وہ جوکر تھا کون؟“

”اسی بیچک شو میں کام کرتا تھا، اچھا ہوا جب میں نے اس سے بات کی تھی تو اس وقت وہ اکیلا تھا ورنہ ہمیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔“ روجر بولا۔

مدھونے اپنے فرینڈز سے بات چیت بند کر دی۔ کافی دنوں تک ان لوگوں نے مدھو کو منایا اور معافی مانگی جب کہیں جا کر مدھونے انہیں معاف

کیا۔ آہستہ آہستہ سب روٹیں لائف میں آ گئے۔
”مدھو ڈنیر جلدی آ جاؤ پاستا ریڈی ہے!“ مام
نے آواز دے کر کہا۔

”آئی ایم کنگ مام!“ اور پھر مدھو آ کر بیٹھ
گئی، پہلا نوالہ لیتے ہی اس نے کہا۔

”مام آپ کے جیسا پاستا کوئی نہیں
بنا سکتا“ اور جلدی جلدی کھانے لگی پلیٹ خالی کر کے مدھو
بترن اٹھائے اور اپنے بستر میں آ کر لیٹ گئی۔ مدھو
بستر پر دراز تھی آہستہ آہستہ اس کے اوپر سے چادر سرکنے
لگی، پھر کسی نے نوکیلی چیز سے اس کے پیٹے میں گدگدی
کی تو وہ اچھل پڑی اس کی نظر جو اپنے پیروں کی طرف گئی
تو وہ سن ہو گئی وہاں ”وہی جو کہ جسے اس نے مارا تھا مکاری
سے کھڑا ہنس رہا تھا، پھر وہ پیروں کی طرف سے ہی
بستر پر چڑھا اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس طرف بڑھنے
لگا اس کا دم نکلے لگا۔ پھر وہ بڑھتے بڑھتے اس کے بالکل
اوپر آ گیا، پھر وہ اس کے بالکل قریب آیا اور اپنا چہرہ اس
کے منہ پر جھکانے لگا مدھو کو اپنا خون رگوں میں جتا محسوس
ہو رہا تھا اس نے آنکھیں سخت سے پھینچ لیں۔

جو کہ گرم گرم سانس اس کو اپنے کان کی
طرف محسوس ہوئیں پھر اس کے کان میں سرگوشی سنائی
دی۔ ”آئی ایم بیک۔“ مدھو نے زوردار چیخ ماری
اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بے یقینی سے چاروں
طرف دیکھا مگر پورا کمرہ خالی تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھی
اور سانس دھوکے کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے سائیڈ
میں رکھا گلاس اٹھایا اور ایک سانس میں خالی کر دیا پھر وہ
لیٹ تو گئی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی
اور جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ وہ اٹھی پھر اس نے گرم پانی
کا شاور لیا اور تیار ہو کر کالج جانے لگی مام نے بچن سے
آواز دی ”مدھو تمہارا آلیٹ ریڈی ہے بننا۔“

”نوام! کلاس ہے، کالج میں کچھ کھا لوں گی۔“
اس نے مام کو توتلی دے دی مگر خود وہ ابھی تک
رات کے خواب سے ڈسٹرب تھی۔

کلاس میں بھی وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ بریک

ٹائم میں اس کے دوست اسے گھیر کر کینٹین لے آئے
۔ مدھو اوٹ ہینڈ؟ رو جرنے اس سے پوچھا تو اس نے
ان سب کورات کا خواب بتا دیا۔ ”اوہ کم آن، ڈونٹ لی
سلی، تم اس بات پر پراپ سیٹ ہو؟ اٹ واز جسٹ اسے
ڈریم۔“ رو جرنے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آئی فورور جیٹ.....“ مدھو نے کہنا چاہا۔
”اوکے اب تمہیں وہ جو کہ نظر آئے تو کہنا رو جرنے
کے ڈریم میں جاؤ۔“ اور سب ہنسنے لگے۔ پھر وہ لوگ
مدھو کو بھلانے لگے۔

مناکشی کالج سے آ کر لاؤنج میں بیٹھی تھی وہاں
اس کا بھتیجا کھیل رہا تھا اتنے میں اس کی بھانجی
آ کر یو لیں۔ ”مناکشی میں اور ماں جی بس ابھی آ رہے
ہیں مارکیٹ سے، تم نیل کو اپنے ساتھ روم میں لے
جانا، یہ بہت شرارتی ہو رہا ہے ابھی بھی اسے سیڑھیوں
سے پکڑ کر لائی ہوں۔“

”اوکے! بھابھی آپ جائیں۔“ اور پھر وہ نیل
کو گود میں اٹھا کر اپنے روم میں لے آئی اور اسے بیڈ پر
بٹھا دیا مناکشی نے کپڑے پہنچ کئے اور نیل کے برابر
میں لیٹ گئی نیل اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا
۔ آدھے گھنٹے میں اس کی بھانجی مارکیٹ سے آ گئی
پھر وہ سب ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے لگے کھانا کھا کر
مناکشی اپنے روم میں آئی اور کمپیوٹر آن کر کے بیٹھ گئی
اچانک پیچھے سے شور سنائی دیا مناکشی نے مڑ کر دیکھا
تو بیڈ پر نیل کا جو کہ کھڑا تھا جو اچھل، اچھل کرتا لیا
بجاء رہا تھا۔ مناکشی نے اٹھ کر اس کا ہٹن آف کیا اور بیڈ پر
پھینک دیا اور دوبارہ کمپیوٹر پر کام کرنے لگی۔

ایک بار پھر تالیوں کا شور سنائی دیا۔ مناکشی
چونک کر مڑی۔ ”جو کہ ہنس ہنس کر اچھل کرتا لیا
بجاء رہا تھا۔“ گلتا ہے اس کا ہٹن لوز ہو گیا ہے۔ اور پھر
مناکشی نے جو کہ کوالٹا کیا اور بیڑی نکال کر اسے سامنے
میز پر رکھ دیا اور دوبارہ اپنا کام کرنے لگی۔

اب کی بار وہ کرسی پر اچھل پڑی تالیوں کی آواز
پھر اس کا سواگت کر رہی تھی۔ اس نے لرزتے ہوئے

مڑ کر میز کی جانب دیکھا جو کہ تالیاں بجاء رہا تھا اور وہ رک
گیا اور مڑ کر مناکشی کی جانب دیکھنے لگا اور دم سے نیچے
کو دیکھا۔ مناکشی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا پھر وہ چلتا ہوا
اس کے پاس آیا اور اچھل کر مناکشی کی ران پر آ گیا تو وہ
دوبن کر پیڑ پر جم کر رہ گئی۔

جو کہ بھیا تک انداز میں قہقہہ لگا رہا تھا ”م.....
م..... مجھے چھوڑ..... دو! میں نے تمہیں نہیں
مارا۔“ مناکشی نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

”اوہ ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں، تم نے
تو مجھے نہیں مارا۔“ جو کہ مکاری سے سوچنے کے انداز
سے کہا اور بل بھر میں اس کے چہرے کے تاثرات
بکڑ گئے۔ ”مگر جرم میں تو تم بھی برابر کی شریک تھیں، تم
سب مرو گے۔“ اس نے اپنے ناخن مناکشی کے کندھے
میں ٹھونپ دیئے، آہ! کی سسکاری مناکشی کے منہ سے
نکل گئی۔ پھر وہ تنہا سا جو کہ مناکشی کے گلے پر چڑھ گیا
اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلہا دبانے لگا۔

مناکشی کا دم کھٹنے لگا اس کی آنکھیں باہر نکل
آئیں، اس ننھے سے کھلونے میں اتنی جان تھی کہ مناکشی
کے پورا زور لگانے پر بھی وہ اس کے ہاتھ نہیں ہٹا سکی۔
اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور گردن ایک جانب
ڈھلک گئی۔

مناکشی کی ماں اس کے کمرے میں آئی اور مناکشی
کو بے ترتیب حالت میں دیکھ کر کھٹک گئی پھر تو گھر میں
کھرام برپا ہو گیا۔ مناکشی کے فریڈ ڈوائف نام کیا گیا سب
اضرہ تھے مگر مدھو شاک تھی اس کا ذہن پھر سے اپنے
خواب کی جانب گیا۔ اس کا دل انجانے خوف سے زور
زور سے دھڑک رہا تھا اس نے رو جرنے اور مدھیر سے کہا مگر
انہوں نے اس کا دم کہہ کر بات ختم کر دی۔

”چلو مدھو میں تمہیں گھر ڈراپ
کر دیتا ہوں۔“ مدھیر نے مدھو سے کہا۔

گاڑی میں مدھو گہری سوچ میں غرق تھی
۔ مدھیر نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”مدھو جیسا تم سوچ رہی ہو
دیکھا بالکل نہیں ہے۔ مرنے کے بعد بھلا کوئی واپس کسے

آ سکتا ہے؟“

”مدھیر مجھے نہیں پتا کہ یہ میرا وہم ہے یا کوئی
بھیا تک حقیقت، لیکن کچھ تو ہے جو نارل نہیں ہے۔ جس
کی گواہی میرا دل دے رہا ہے۔ تم چاہے نہ مانو مگر دیکھنا
ایک وقت ایسا آئے گا جب تم بھی میری بات کی تائید
کر دو گے۔“ مدھو نے کہا اور چپ ہو گئی۔

مدھیر نے کچھ کہنا چاہا مگر مدھو کا گھر آ گیا
تو مدھو نے ”ہائے“ کہا اور گاڑی سے اتر گئی۔ مدھیر نے
گہری سانس لے کر سر ہلایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

رو جرنے میں اپنے کزن کے ساتھ داخل ہوا
اور اسے ایک سر ساز کرتا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا اسے سوانا
باتھ لینا تھا۔ وہ چلتا جا رہا تھا کوریڈور میں اسے محسوس ہوا
کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اس نے رک کر پیچھے دیکھا
مگر کوریڈور خالی تھا رو جرنے شانے اچکائے اور دروازہ
کھول کر اندر چلا گیا۔ ابھی اسے لیٹے ہوئے تھوڑی
دیر ہی گزری تھی کہ اچانک نمبر پچ خود بخود بڑھنے لگا
پھر وہ اذیت ناک حد تک بڑھنے لگا رو جرنے گھبرا کر
دروازہ کھولا چاہا مگر وہ لاک تھا۔ رو جرنے کو اپنی کھال بدن
سے اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”ہیلپ! ہیلپ!“ رو جرنے
چینیں مار کر دروازہ پیٹ رہا تھا۔

”کیوں بجتی ہم سے ملاقات نہیں کرو گے؟ تم
تو ہمیں ڈریم میں انوائٹ کر رہے تھے، ہم تو جاگتے ہیں
چلے آئے۔“ رو جرنے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا کیوں کہ
اسٹیم فل بھر چکی تھی کمرے میں۔ غور سے دیکھنے پر وہی
جو کہ سامنے نظر آیا۔ ”ت..... ت..... تم!! تو مرنے گئے تھے
؟“ رو جرنے منہ سے بمشکل نکلا۔

”تو میں نے کب کہا کہ میں زندہ ہوں
ہا..... ہا.....!!!!!!“ جو کہ خوفناک انداز میں ہنستے ہوئے
کہا۔ رو جرنے کھال اس کے جسم سے الگ ہونے لگی وہ درد
سے چلا رہا تھا مگر کسی کو اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔
”کیوں موت کی اذیت کیسی محسوس ہو رہی
ہے؟“ جو کہ نے سینے پر ہاتھ باندھ کر مزاحیہ انداز میں کہا۔
”دیکھو پلیز مجھے چھوڑ دو۔“ رو جرنے گڑگڑایا۔

”چھوڑ دوں؟ تو میں نے پکڑا کب ہے؟“ روجر چٹیں مارتا رہا مگر کسی کو کچھ سنائی نہ دیا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا جب تک بہت دیر ہو چکی تھی روجر کی لاش! لاش کہنا غلط تھا لوگوں کا خوف سے دم نکل رہا تھا اسے دیکھ کر ایک حادثہ قرار دے دیا گیا۔ جم والوں پر کیس فائل ہو گیا مگر مدھو اور سدھیر دونوں خاموش تھے مدھو نے خوف زدہ انداز سے سدھیر کی جانب دیکھا جو کہ کسی سوچ میں گم تھا۔

”سدھیر آج تم کا جنم نہیں جا رہا ہے؟“ ماں نے پوچھا۔ ”نہیں ماں آج کلاس نہیں تھی کوئی اس لئے آج نہیں جا رہا۔“

”تو ٹھیک ہے آج تمہارے پتا کو جانا تھا اب تم ذرا چھت کا کام دیکھ لینا۔“ ماں نے کہا۔

”جی اچھا ماں سدھیر نے کہا اور کمرے سے نکل کر اوپر جانے لگا۔ اوپر کی منزل پر کمرے بنائے جا رہے تھے مزدور اپنا کام کر رہے تھے سدھیر ایک طرف کرسی ڈال کر اپنا پٹا پٹ لے کر بیٹھ گیا۔ ڈیڑھ بجے کے وقت مزدور کھانا کھانے چلے گئے سدھیر بھی اٹھ کر نیچے جانے لگا یہی تھا کہ کھٹ..... کھٹ کی آواز آئی اس نے سامنے دیکھا تو ایک مزدور اکیلا سریوں کے بیچ میں ہتھوڑا لے کر پیٹ رہا تھا۔ ”کیوں صاحب آپ نہیں گئے کھانا کھانے؟“ سدھیر نے اسے مخاطب کیا۔

وہ مزدور سر جھکائے ہتھوڑا چلائے جا رہا تھا۔ سدھیر اس کے قریب گیا۔ ”میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔“ وہ مزدور پلٹا اور ہتھوڑے کا وار سدھیر کے منہ پر کیا سدھیر کا جبڑا ٹوٹ گیا وہ زمین پر جا پڑا سدھیر نے اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں مزدور کی جگہ وہی جو کہڑا تھا جسے مدھو نے مارا تھا سدھیر کے دماغ میں مدھو کے الفاظ گونجنے لگے۔

”تم مانو یا نہ مانو سدھیر ایک وقت آئے گا جب تم میری تائید کرو گے۔“ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی وہ کھٹ کر آگے بڑھنا چاہ رہا تھا مگر کھٹ بھی نہیں پارا تھا۔ خوفناک رنگوں سے سچے چہرے کے ساتھ وہ

جو کہ سدھیر کے قریب آیا اور مسکراتے ہوئے گردن ہلا کر بولا۔ ”دو!..... دو! درد ہو رہا ہے؟“ اور سدھیر کے ٹوٹے ہوئے جڑے پر ہاتھ پھیرنے لگا تو اس کے درد میں اور اضافہ ہو گیا۔

”مجھے تو کچھ درد ہی محسوس نہیں ہوا تھا، بس ایک دھماکہ ہوا تھا سر پر اور بس!“ جو کہ تاج تاج کر باتیں کرنے لگا چلو میں تمہیں بھی درد سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جو کہ نے سدھیر کو دونوں ہاتھوں پر فضا میں بلند کیا اور سامنے کھڑے سریوں کی جانب اچھال دیا۔ سدھیر سریوں پر گرا اور سرے پر اس کے جسم کے آ پار ہو گئے سدھیر چند لمحے پھر کا پھر ٹھنڈا ہو گیا اس کی پتھرائیں نگاہیں آخری وقت تک اسی جو کہ پر تھیں۔

مدھو کو سدھیر کی موت کی اطلاع ملی تو اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ ”مناشی، روجر، سدھیر! اب میری باری ہے۔“ یہ کہہ کر مدھو دھاڑیں مارنے لگی اس کی مام بھاگتی ہوئی آئیں۔

”نہیں بیٹا! ایسے نہیں روتے، بہت کرو پھگوان کی یہ ہی مرضی تھی میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری فیلنگز مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ مام آپ سمجھ نہیں رہی ہیں بات وہ نہیں ہے۔“ مدھو روتے ہوئے بولی۔

”تو کیا بات ہے؟“ مام نے پوچھا تو مدھو نے انہیں شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ جسے سن کر مدھو کی مام سکے میں آ گئیں۔

”اوہ تو! یہ تم نے کیا کر دیا“ مرڈر“ اور اتنی بڑی بات تم اب بتا رہی ہو؟“ مام غصہ کرنے لگیں۔

”اب ہو گئی ناں غلطی! مام اب میں کیا کروں؟“ مدھو نے روتے ہوئے کہا۔

”بیٹا رو نہیں، دراصل تم نے اس بات کا اتنا اثر لے لیا ہے کہ تم نے اپنے دوستوں کی موت کو بھی اس سے جوڑ دیا ہے تمہیں چیخ کی ضرورت ہے، ہم کل ہی تمہاری آغوش کے پاس چلتے ہیں کچھ دن وہاں رہو گے تو سب بھول جاؤ گی اوکے؟“ انہوں نے مدھو کو بیاہ سے پلٹاتے ہوئے کہا تو مدھو مسکراتے ہوئے

جہاز نے ٹیک آف کیا تو مدھو نے سکون کا سانس لیا۔ دوسرے شہر پہنچ کر مدھو کی جان میں جان آگئی تھی پچھلے دنوں وہ بہت زیادہ پریشان اور خوف زدہ رہی تھی اوپر سے اس کے بیٹ فرینڈز کی جدائی، یہ سب سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اتنے پورٹ پر آئی روزی نے ان کا والہانہ استقبال کیا ان کے شوہر کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے جبکہ وہ اپنے چھوٹے سے بیٹا مائیکل کے ساتھ رہتی تھیں مدھو نے مائیکل کو گود میں اٹھایا اور چل دی، آئی روزی اور اس کی مام پیچھے آ رہی تھی مدھو سب بھول کر زندگی میں گم ہو گئی، دن آرام سے کھنے لگا۔

صبح کے وقت مدھو نے جوس پی کر گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا اور برتن اٹھانے لگی۔ ”مدھو“ آئی روزی کی آواز آئی۔

”جی آئی!“ مدھو بولی۔

آئی کچن سے نکل کر آئیں تو ان کے ہاتھ میں گتے کا ڈبہ تھا۔ ”بیٹا اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو یہ باکس اسٹور روم میں رکھ دو۔“ آئی نے کہا۔

آئی زحمت کیسی؟ لاٹین اور پھر مدھو نے باکس لیا اور اسٹور روم کا دروازہ کھول کر بیڑھیاں اترنے لگی۔ باکس کو ایک سائڈ پر رکھ کر مدھو جیسے ہی کچن دھب سے کوئی چیز اس کے سامنے گرے۔ مدھو کی ایک دم چیخ نکل گئی وہ بھی کوئی سامان ہے اس نے زمین پر گری چیز کو اٹھایا تو اس کی سٹی گم ہو گئی وہ ایک ”جوکر“ تھا۔

مدھو نے اسے زور سے اچھال کر دور پھینک دیا اور بھاگ کر بیڑھیاں چڑھ کر باہر نکل آئی اور دروازہ بند کر کے پشت سے ٹیک لگا کر زور زور سے سانس لینے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا ذل حلق سے اچھل کر باہر نکل پڑے گا بڑی مشکل سے وہ اپنے روم میں آئی۔

تھوڑی دیر بعد مائیکل مدھو کو اپنے ساتھ کھینے کیلئے بلانے آیا تو مدھو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل دی کیوں کہ وہ بڑی مصروفیت سے اسے کہہ رہا تھا۔ لان میں کھینے کے بعد وہ لوگ جھولے میں بیٹھے آ گئے۔ مدھو جیسے ہی جھولے میں بیٹھی اس کو اپنے نیچے کوئی چیز محسوس

ہوئی اس نے کھینچ کر نکال کر جو دیکھا تو وہ سن ہو گئی یہ وہی ”جوکر“ تھا جو نیچے اسٹور روم میں تھا یہ یہاں کیسے آیا یہ سوال شدت سے مدھو کے ذہن میں گونجنے لگا۔ اس نے جو کہ دور اچھال کر پھینک دیا اور اندر چل گئی۔

رات کھانے کی ٹیبل پر مدھو خاموش تھی۔ ”کیوں مدھو ذرپ نہ نہیں آ رہا بیٹا؟ تمہارا فیورٹ اسٹو بنایا ہے میں نے خاص طور سے تمہارے لئے۔“ آئی روزی نے کہا۔

”نہیں آئی ذر بہت لذیذ ہے۔ وہ دراصل میں نے اور مائیکل نے شام میں پیزا آرڈر کر لیا تھا۔“ مدھو نے کہا اور چہرے سے اسٹو کاٹنے لگی۔ متراس کا ذہن جو کہ کی طرف ہی تھا۔

آنکھ کھلنے پر مدھو کو حلق میں کانٹے پڑے محسوس ہو رہے تھے اس نے اٹھ کر سائڈ سے گلاس اٹھایا مگر وہ بالکل خالی تھا۔ وہ جھنجھلائی ہوئی آئی اور کچن میں فرنیج کھول کر بوتل نکال لی پھر گلاس میں پانی بھر کر پینے لگی۔ پانی کا گلاس ابھی بھی اس کے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا پانی اس کے حلق سے نیچے اتر رہا تھا اور وہ فرنیج کے اوپر دیکھنے لگی ایک دم گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ فرنیج کے اوپر وہی ”جوکر“ بیٹھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں نیلی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

مدھو نے زوردار چیخ ماری اس کی آواز سن کر آئی روزی اور مام دونوں آ گئیں کچن میں مدھو نیچے ایک کونے میں کھٹی بیٹھی ہوئی تھی وہ کانپ رہی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ ”کیا ہوا مدھو؟“ مام نے مدھو کو پلٹاتے ہوئے کہا۔

”وہ، وہ، وہاں“ مدھو نے انگلی فرنیج کی طرف کرتے ہوئے کہا اس کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔

”وہاں کچھ نہیں ہے! بیٹا۔“ آئی نے کہا۔

”مام! ج..... ج..... ج..... جوکر فرنیج“ مدھو کے منہ سے الفاظ نکل رہے تھے۔

”بیٹا کچھ بھی تو نہیں ہے۔ فرنیج پر بھی۔“ مام نے کہا تو مدھو نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ فرنیج



آسیبی معمر

محمد وارث آصف - وال بھراں

کمرے کے وسط میں بیٹھے قاری صاحب نے قرآنی آیات کا ورد شروع کیا تو کوئی پندرہ منٹ بعد کمرے میں چند ہیولے نمودار ہوئے اور پھر وہ ہیولے ایک ٹھوس وجود دھار کر سامنے آگئے، اور وہ ہمکلام ہوئے۔

خوف و ہراس پھیلاتی جسم و جاں پر کچپی طاری کرتی ناقابل فراموش دلخراش کہانی

آصف جب اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس نے اپنی بیوی نگین کو دروازے پر ہی بدحواسی کے عالم میں اپنا منظر پایا۔ آصف اس وقت کام سے واپس آیا تھا۔ وہ مسٹر یوں کے ساتھ دیہاڑی کا کام کرتا تھا۔ اسے گھر آتے آتے اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس کی ابھی ایک سال پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ کئی سال پہلے اس کو چھوڑ کر راہی عدم ہو چکے تھے۔ وہ اکلوتا بھائی تھا اور صرف ایک ہی بہن تھی جو کہ شادی شدہ تھی۔ آصف کی عمر 22 سال تھی۔ ماں باپ کے بعد اسے اس کے چچا نے پالا پوسا تھا اور شادی کر کے اب اس کے کندھوں پر ذمہ داریاں ڈال دی تھیں۔ اپنی بیوی کو اس حالت میں دیکھ کر اسے سخت حیرانگی ہوئی۔ نگین کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ کچھ زیادہ ہی بدحواس

اپنی سانس روکی مگر آواز پھر بھی آ رہی تھی۔ اس کا دم ٹپکنے لگا وہ ایک دم ابھی تو ایک دھماکہ ہوا اور اس کی آنکھوں کے گرد تارے تاجنے لگے پھر اندھیرا اچھا گیا۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ٹنکی کے نیچے ہے۔ اور بے دھیانی میں اس کا سر زور سے ٹکرایا تھا وہ اپنا سر پکڑے پکڑے ٹنکی کے نیچے سے گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی نکلی تو کسی نے کس کر اس کے بال پکڑ لئے اس کی چیخ نکل گئی اور پھر وہ کھشتی کھشتی چھت کے کونے پر آ کر رک گئی۔ جو کر خوف ناک انداز سے اس کے سامنے کھڑا تھا پھر اس کا دہانہ کھلا اور وہ بولا۔ ”اتنی آسان موت نہیں ملے گی تجھے۔“ اور مدھو کے سینے پر اپنا پنجہ رکھ کر اس کو پیچھے دھکیل دیا۔

مدھو جیتی ہوئی نیچے گرتی چلی گئی پھر دھپ کی آواز کے ساتھ سوئمنگ پول کے کنارے پکے فرش پر پیچھے گر گئی، اس کے جسم کے نیچے خون کا تالاب بننے لگا۔ جو کچھ بھر میں چھت سے غائب ہو کر نیچے آن موجود تھا۔ مدھو کا خون آس پاس پھیل کر سوئمنگ پول میں گرنے لگا۔ سوئمنگ پول کا پانی سرخ ہونے لگا مدھو جھٹکے لے لے کر تڑپ رہی تھی۔ وہ جو کر اس کے پاس آیا اور اکڑو بیٹھ کر رونے لگا پھر ایک دم قہقہے لگانے لگا۔ پھر اس نے اپنے سفید دستانے کے ہاتھ گھمائے تو ایک ہاتھ کے انگوٹھے پر آگ کا شعلہ جل اٹھا، اس نے تڑپتی مدھو کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی سے کہا۔ ”گڈ بائے“ اور مدھو کی پچھی ہوئی فی شرٹ میں آگ بھڑک اٹھی وہ زندہ تھی مگر مزاحمت بھی نہ کر سکی اور زندہ جلتے جلتے اذیت ناک موت کا شکار بن گئی۔

ان سب میں مدھو کا کوئی تصور نہ تھا مگر اس کے دوستوں کے ایک مذاق کی وجہ سے اس کی زندگی کے سب سے بڑے خوف نے حقیقت کا روپ لے کر اس کی جان لے لی اور یوں اس کا خوف سچ ثابت ہو گیا کہ ”جو کر اسے مار دے گا۔“



بالکل خالی تھا۔ ”بننا پرانی باتوں اور یادوں کو اگنور کرنے کی کوشش کرو۔“ اور اسے اٹھا کر اس کے روم میں لے آئیں اور بیڈ پر لٹا کر جانے لگیں تو مدھو نے جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا ”مام! پلیز مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جائیں۔“ ”مدھو بننا اپنے ڈر کا مقابلہ تمہیں خود کرنا ہے۔“ مام نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مام بس آج آخری بار“ آپ میرے ساتھ سو جائیں، پھر میں آپ کو کبھی بھی تنگ نہیں کروں گی۔“ مدھو نے بے چارگی سے اپنی مام کی جانب آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو مام کو مدھو پر اس وقت بے انتہا ترس آیا۔ ”اوکے مائی چائلڈ ایڈیوش“ پھر مام مدھو کے برابر میں لیٹ گئیں۔ انہیں فکر تھی کہ مدھو اس خوف سے کیسے باہر آئے گی پھر انہوں نے دیکھا کہ مدھو سو گئی ہے تو وہ آہستہ سے اٹھی اور اپنے روم میں آ گئیں۔ ”جب مدھو صبح اٹھے گی تو اسے بتاؤں گی کہ تم بے کار میں ڈر رہی تھیں، رات بھر بالکل اکیلی سوئی تھیں تم۔“ اور مسکرا کر سونے لگیں مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ رات کا جانے کون سا پھر تھا جب مدھو کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی اس نے کمرٹ لے کر مام کو دیکھنا چاہا مگر وہ سن ہو گئی کیونکہ برابر والے تکیے پر مام کے بجائے ”جو کر“ لیٹا ہوا تھا۔ مدھو کو کرنٹ سا لگا اور وہ جھل کر بستر سے نیچے کود گئی اس نے بھاگنا چاہا تو جو کر نے پیچھے سے اس کی فی شرٹ پکڑ لی، اس نے زور لگایا تو فی شرٹ چرچر کر کے پھٹتی چلی گئی۔ مدھو نے اس کی پرواہ نہ کی اور بھاگتی چلی گئی کمرے سے نکل کر اسے سامنے سیڑھیاں نظر آئیں وہ بے ساختہ اس پر چڑھ گئی سیڑھیاں چھت پر جا کر ختم ہو گئیں چھت پر پہنچ کر مدھو ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سامنے اسے پانی کی بڑی تنگی نظر آئی تو فوراً جھک کر اس کے نیچے گھس کر اکڑو بیٹھ گئی وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کو اپنے سانسوں کے علاوہ بھی آواز سنائی دی اس نے

تھی۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا نکلن اس سے لپٹ گئی اور سسکنے لگی۔ بیوی کے اس طرح کے عمل نے اس کے دل میں طرح طرح کے دوسوے اور باتیں ڈالنا شروع کر دیں۔ اس نے جھٹ پوچھا۔ ”نکلن..... کیا ہوا؟ خیر تو ہے نا..... تم رو کیوں رہی ہو؟ مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے.....؟“

مگر اس کی بیوی صرف اس سے لپٹی روئے جاری تھی۔

اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دونوں کا آپس میں کبھی جھگڑا تک نہیں ہوا تھا۔ وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے مگر آج جیسا اس نے سوچا۔ ”ضرور کوئی اہم بات ہوگی۔“ اس نے استفسار کیا تو نکلن نے انگلی کا اشارہ اپنے گھر کے کمرے کی جانب کیا اور ڈرتے ہوئے بولی۔ ”وہ..... وہ..... وہ کمرے میں.....!“ خوف کے مارے اس پر جیسے کچکا پاٹ طاری تھی اور اس کی وجہ سے اس کے منہ سے صحیح الفاظ بھی ادا نہیں ہو رہے تھے۔

آصف نے حیرانگی سے کمرے کی طرف دیکھا جس کی جانب نکلن نے اشارہ کیا تھا۔ تمام گھر میں اندھیرا تھا کیونکہ اس جگہ بجلی نہیں تھی۔ آصف کے ذہن میں کئی باتیں آئیں، اس نے جلدی سے کمرے کی جانب قدم بڑھایا مگر اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیزی سے بولی۔ ”نہیں..... ادھر مت جانا۔“

”کیا مطلب.....؟ کیوں نا جاؤں ادھر اور مجھے بتاؤ تو سہی ہوا ہے کیا آخر؟..... نہ تم مجھے کچھ بتا رہی ہو، نہ کمرے میں جانے دے رہی ہو، آخر ایسا ہے کیا ادھر.....؟“

”وہ..... وہ میں کھانا پکا رہی تھی کہ مجھے یاد آیا کہ سالن میں دھنیا بھی ڈالنا ہے اور میں دھنیا لینے کمرے میں گئی تو مجھے کمرے میں جا کر ویسی خوشبو محسوس ہوئی جیسے کمرے کے جسم اور کفن پر ڈالی جاتی ہے..... میں سخت حیران ہوئی، خوشبو بہت واضح تھی اور ایسے محسوس ہو رہی تھی کہ جیسے اندر کمرے میں ابھی ابھی کسی کو کفن

دے کر اسے خوشبو سے نہلا یا گیا ہو۔ میں اسے وہم کا نام بھی نہیں دے سکتی کیونکہ خوشبو مجھے برابر آتی رہی، میں نے جیسے ہی دھنیا والا ڈالنا اٹھانا چاہا تو مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کہ یا تو کوئی چار پائی پر بیٹھا ہو یا پھر اٹھا ہو کیونکہ ہماری جو چار پائیاں ہیں ان پر بیٹھنے یا کھڑا ہونے پر وہ آواز دیتی ہیں بس اسی سے مجھے خوف محسوس ہوا اور میں بھاگتی ہوئی یہاں آ گئی ہوں۔“ نکلن نے اسے جب تفصیل سے آگاہ کیا تو اس لمحے خوف کی ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔

اسے اپنی بیوی پر اعتبار تھا وہ ہمیشہ بات کو پرکھ کر ہی بولتی تھی۔ اسے بھی اندھیرے سے ڈرنا محسوس ہوا مگر یکدم اس نے سارے ڈر کو ختم کیا اور بیوی کو دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔ ”اوہ..... اتنی سی بات پر تم ڈر گئی کچھ بھی نہیں یہاں..... تم کو صرف وہم ہوا ہے اور ویسے بھی تم چونکہ گھر میں اکیلی رہتی ہو اسی لئے اکثر اوقات ایسا ہو جاتا ہے اور تمہیں اک خاص بات بتاؤں..... یہ جو تم ہر وقت خوفناک کہانیوں کے رسالے پڑھتی ہونا، یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے کبھی۔ اب چلو شاہاں! مجھے پانی پلا دو..... سخت پیاس لگی ہے۔“

آصف کی اس بات سے نکلن کو شرمندہ ہونا پڑا کیونکہ واقعی وہ خوفناک کہانیوں والے رسالے بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ آصف کے آنے سے اس کے ذہن میں جو ڈر تھا وہ ختم ہو گیا اور وہ اس کے لئے گھرے سے پانی لینے چلی گئی۔

آصف کمرے میں داخل ہوا تو اسے کسی بو کا احساس نہ ہوا، وہ کافی دیر تک کمرے میں کھڑا رہا پھر اپنی بیوی سے بولا۔ ”مجھے تو کوئی بو محسوس نہیں ہو رہی..... کہان گئی وہ مردوں والی بو۔“

نکلن کمرے میں آئی اور اس نے سوگھا تو اسے بھی کوئی بو محسوس نہ ہوئی۔ وہ سخت حیران ہوئی مگر پھر مزید شرمندگی سے بچنے کے لئے اس نے آصف سے کہا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے آؤ کھانا کھاتے ہیں۔“ اور وہ دونوں کھانے پر جت گئے۔

آصف دوسرے دن عصر کے وقت ہی واپس آ گیا۔ جب شام ہونے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر اپنے گھر کے دونوں کمروں کے دروازے بند کر دیئے کیونکہ دیہاتوں میں اکثر لوگ شام کے وقت کمروں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ وہ نماز پڑھنے چلا گیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ گھر آیا اور کسی کام سے کمرے میں داخل ہوا تو یکایک اس کی ناک میں عجیب سی خوشبو عود کر آئی۔ اس نے تیزی سے سوگھا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ خوشبو تو وہی ہے جو مردے کے کفن پر لگاتے ہیں۔ خوشبو بڑی واضح تھی اور نکلن نے بالکل سچ کہا تھا۔ اس نے تیزی سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

وہ سخت پریشان ہو گیا۔ وہ کافی عرصے سے اس گھر میں تھا۔ اس کے والدین بھی اسی گھر میں انہی کمروں میں رہے تھے مگر کبھی بھی ایسا کچھ نہ ہوا تھا تو پھر اب ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اسے پریشانی کے ساتھ ساتھ خوف بھی لاحق ہو گیا اس نے سوچا کہ ”اسے ضرور کسی اللہ والے سے اس بابت مشورہ کرنا چاہئے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ان کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے۔“

”اس نے اس قسم کے کئی قصے سن رکھے تھے۔ بہر حال وہ جتنا سوچتا جتنا ہی اکتاہٹ لگتا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ مزید تپیل کے لئے کمرے میں آیا تو اب اسے کوئی بھی خوشبو محسوس نہ ہوئی۔ اس نے کئی بار زور زور سے سوگھا مگر خوشبو ہوتی تو محسوس ہوتی۔ وہ اس اچنبھے پر سخت حیران ہوا۔ شام کو اس نے واضح خوشبو محسوس بھی کر لی تھی اور کل نکلن نے اسے شام کے بعد اسی ٹائم کا بتایا تھا جس ٹائم اسے آج محسوس ہوئی تھی۔ اسے اتنا پتا تو چل گیا کہ خوشبو اس وقت آتی ہے جب اندھیرا مکمل پھیل جاتا ہے اور پھر کچھ دیر بعد خوشبو آنا بند ہو جاتی ہے مگر سوال یہ تھا کہ یہ خوشبو آخر آتی کیوں ہے؟ اور چند لمحے کے لئے کیوں ہوتی ہے؟ پوری رات کے لئے کیوں نہیں اور صرف اسی وقت کیوں؟ اس کی ضرور کوئی نہ کوئی بڑی وجہ ہوگی۔ اس نے سوچا۔ ”مجھے مزید دیر کئے بنا اس مسئلے کو حل کرنا ہوگا۔“

اسے یاد آیا کہ جس مدرسے میں وہ کام کرنے جاتا ہے اس مسجد کے امام صاحب کافی نیک اور اس قسم کے کاموں کے ماہر ہیں۔ کام کے دوران وہ کئی مزدوروں سے اس قسم کی کچھ باتیں بھی سن چکا تھا۔ ضرور وہ اس مسئلے کو حل کریں گے۔

رات اس نے کانتوں پر گزاری۔ صبح اس نے کام پر جاتے ہوئے مستری کو راہ میں مکمل تفصیل سے آگاہ کیا تو مستری نے بھی اسے وہی مشورہ دیا کہ تم جیسے ہی پہنچو اسی وقت قاری صاحب سے مشورہ کر لیتا۔ آصف جیسے ہی مدرسہ میں پہنچا، باقی مزدور اور مستری تو کام کی سیٹنگ کرنے لگے مگر وہ سیدھا مدرسے سے ملحقہ مسجد میں چلا گیا۔ وہاں بچے پڑھتے بھی تھے۔ اس نے ایک بچہ سے قاری صاحب کا پوچھا تو اس نے بتلایا کہ وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ ایک گھنٹہ میں آ جائیں گے۔ تو اس نے سوچا جب قاری صاحب آ جائیں گے تو ان سے بات ہوگی۔ ٹائم گزرتا گیا پھر کھانے کے لئے کام بند کیا گیا۔ کھانا آرام سے کھانے کے بعد وہ سیدھا قاری صاحب کے پاس گیا جو کہ اپنے کمرے میں موجود تھے۔

کمرے کے دروازے پر اس نے چپل اتاری اور اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا، سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہاں..... بولو کیا بات ہے؟“ قاری صاحب نے دریافت کیا۔

”قاری صاحب دراصل میں ایک کام سے حاضر ہوا ہوں۔“

”کون سا کام؟“

”قاری صاحب کچھ پر اسرار مسئلہ ان دنوں ہمارے گھر میں رونما ہو رہا ہے اس لئے آپ سے مدد لینا چاہتی۔“

”پر اسرار مسئلہ.....؟“ قاری صاحب نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کیا مسئلہ ہے.....؟“

پھر آصف نے ان کو تفصیل سے تمام باتوں

سے آگاہ کیا جو تکین اور اس کے ساتھ رونما ہو چکا تھا۔
قاری صاحب نہایت توجہ اور دھیان سے اس کی باتیں
سننے رہے۔

جب آصف انہیں باتوں سے آگاہ کر چکا تو وہ
بولے۔ ”اوہ..... تو یہ بات ہے!“

”جی قاری صاحب.....! ہم بہت پریشان
ہیں۔ میں چونکہ گھر پر اکثر اوقات نہیں ہوتا اور بیوی
اکیلی ہوتی ہے اس لئے مجھے ڈر ہے کہ کہیں اکیلے میں
اس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ بن جائے اس لئے مجھے
مستری نور احمد نے آپ کا بتلایا اور میں امید لے کر
آپ کے پاس آ گیا۔ قاری صاحب ہمیں اس پریشانی
سے نجات دلائیں، ہم پر آپ کا یہ احسان ہوگا؟“
آصف نے عاجزی سے کہا۔

”تم فکر مت کرو..... انشاء اللہ اس مسئلے کا حل
نکل آئے گا لیکن اس سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ
آیا گھر میں جنات ہیں یا کوئی تعویذ وغیرہ اور تم نے جو
خوشبو کا ذکر کیا ہے وہ اکثر اوقات کالے جادو کی کارستانی
ہوتی ہے۔“

آصف یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ اسے اچانک
پریشانی نے آگھرا اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کا منہ
لنک گیا۔ کالے جادو کے بارے میں اس نے کئی باتیں
سن رکھی تھیں جنہیں ذہن میں دہراتے وقت وہ خوف
سے لرز رہا تھا۔

قاری صاحب نے اس کے لٹکے ہوئے منہ کو
دیکھ کر کہا۔

”آصف..... اتنی جلدی کالا جادو اثر نہیں
کرتا..... اسے اثر کرنے میں ٹائم لگتا ہے شکر کرو کہ تم
وقت پر آ گئے۔ اب تم ایسا کرو کہ جب یہاں سے گھر
جانا تو آدھ پاؤ گوشت لیتے جانا، رات جب سونے لگو تو
اس کمرے میں جہاں یہ شکایت ہے کسی خالی پلیٹ میں
رکھ دینا اور پھر کمرے کا دروازہ بند کر کے سو جانا۔ رات کو
اس کمرے میں بالکل مت جانا..... صبح اٹھ کر کمرے
میں دیکھنا۔ اگر گوشت اسی طرح پڑا ہے جیسے تم نے رکھا

تھا تو پھر اس کا یہ مطلب ہے کہ گھر میں جنات نہیں ہیں
کوئی اور مسئلہ ہے..... اگر گوشت غائب ہو اور خالی
پلیٹ پڑی ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ جنات
ہیں..... ٹھیک ہے اب تم جاؤ چیک کرو اور ہاں نمازی
خاص پابندی کیا کرو۔“

آصف نے تمام باتیں ذہن نشین کر لیں اور
قاری صاحب سے اجازت لے کر کمرے سے باہر
آ گیا اور کام پر لگ گیا۔ شام کا ٹائم اس نے جیسے تھے
کمرے کے پاس کیا، جب کام سے چھٹی ہوئی تو اس نے
گھر آتے ہوئے بازار سے پاؤ گوشت لے لیا آدھ
اپنے پکانے کے لئے اور آدھ کمرے میں رکھنے کے
لئے۔ گھر آ کر اس نے اپنی بیوی کو ساری داستان بتائی
اور رات کا کھانا کھا کر اس نے ڈرتے ڈرتے گوشت
خالی پلیٹ میں رکھ کر کمرے میں ایک جگہ میز پر رکھ دیا
اور دل میں ہزار سوچیں لئے سو گیا۔

سویرے آنکھ کھلتے ہی وہ کمرے میں آن وار
ہوا۔ اس نے پلیٹ کی طرف دیکھا تو اس کے ہوش
اڑ گئے۔ پلیٹ میں ڈرہ بھر بھی گوشت نہ تھا اور خالی
پلیٹ اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس نے خوفزدہ انداز
میں کمرے میں ایک گہری نظر دوڑائی اور پلیٹ اٹھا کر
باہر آ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو پریشان کرنا مناسب
نہ سمجھا اور اس سے بہانہ کر دیا کہ ”ہو سکتا ہے کوئی بلی
وغیرہ گوشت کھا گئی ہو کیونکہ گوشت کو ہم نے ایسے
رکھ دیا تھا۔“

اس نے مزید تسلی کے لئے بیوی سے کہا کہ
”ایک مرتبہ گوشت غائب ہونے سے وہ کوئی رمانے
قائم نہیں کر سکتا۔ آج چونکہ جمعہ ہے اور کام سے چھٹی
ہے اس لئے میں قاری صاحب کے پاس نہیں جاؤں گا
بلکہ آج رات پھر گوشت رکھوں گا اور ایسی جگہ رکھوں
جہاں بلی وغیرہ نہ پہنچ سکے۔ اگر اگلی صبح بھی یہی حال ہو
تو پھر ہفتہ کو تو ویسے بھی کام پر جانا ہے لہذا میں قاری
صاحب کو بتلا دوں گا۔“
یہ سن کر بیوی مطمئن ہو گئی مگر سارا دن آصف

کے دماغ میں بے شمار پریشانی اور دوسرے بننے اور
جگرتے رہے۔ شام میں وہ پھر گوشت لایا اور اک
ندرے اوپنی جگہ پر پلیٹ میں ڈال کر رکھ دیا۔
سویرے جب اٹھا اور کمرے میں آیا تو پلیٹ اوندھی
پڑی تھی اور گوشت غائب تھا۔ اس نے پھر اسے بلی کا
کرشمہ ہی کہا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر واقعی جنات
اسے کھاتے تو پلیٹ تو اوندھ ہی رہتی۔ جنات کے لئے
کوئی کام مشکل ہے بھلا۔ ہفتے والے دن میٹرل نہ
ہونے کی وجہ سے وہ کام پر نہ جاسکے۔

شام کو وہ پھر گوشت لایا اور اسی طرح کمرے
میں رکھ دیا۔ رات کا نہ جانے کون سا وقت تھا جب اس
کی آنکھ کھلنے لگی۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کی
چارپائی کے نیچے سے کوئی چھوٹی بکری گزری ہے۔
اس نے تیزی سے نیچے جھک کر دیکھا مگر وہاں
بکری تو کیا بکری کا سایہ بھی موجود نہ تھا۔ اس نے
تیزی سے ادھر ادھر گردن گھمائی مگر کچھ بھی نہ تھا۔ چاند
کی چاندنی میں اسے ہر چیز واضح دکھائی دے رہی
تھی۔ وہ حقیقت میں ڈر گیا۔ اس کا دل زور زور سے
دھڑکنے لگا اور اس کے دماغ میں خوف کا سحر چھانے
لگا۔ اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جو بڑے آرام سے
چارپائی پر سو رہی تھی۔

وہ تیزی سے اٹھا اور گھڑے میں سے پانی
گلاس میں اٹھیل کر ایک ہی سانس میں لی گیا۔ چند
لمحے تک وہ اس واقعے پر غور کرتا رہا۔ کسی بھی حالت
میں اسے وہ ہم کا نام نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس نے
جائی آنکھوں سے بکری کے بچے کو دیکھا تھا کہ اچانک
چارپائی کو اوپر اٹھتا ہوا دیکھا پھر چارپائی نیچے آ گئی۔
اس کا دل حلق میں آ گیا تھا اور پسینہ اس کے ماتھے پر
نکل آیا تھا۔ ”اس سے پہلے ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔
اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ گوشت کا غائب ہونا اس
بات کی دلیل ہے کہ واقعی اس کمرے میں کوئی آسیب
موجود ہے۔“

انہی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اس

کی بیوی والی چارپائی تین سے چار فٹ اور پھر ہوا میں
بلند ہوئی اور تیزی سے ہوا میں ہی الٹ گئی۔ اس کی
بیوی دھڑام سے زمین پر گر گئی تو ایک بھیا نک چیخ اس
کے منہ سے نکلی۔ وہ تیزی سے بیوی کی جانب لپکا۔
چارپائی ابھی تک فضا میں اسی طرح معلق اور الٹی ہوئی
تھی۔ اس نے تیزی سے بھاگ کر بیوی کو زمین سے
اٹھایا اور ایک جھٹکے سے چارپائی سے دور لے آیا۔ اس
کی بیوی نے ایک فلک شکاف چیخ ماری اور اس سے
لپٹ گئی۔ وہ رونے لگی۔

اچانک چارپائی دھڑام سے زمین پر گر گئی تو ان
دونوں کے منہ سے چیخ نکلی۔ آصف نے بیوی کو اٹھایا
اور تقریباً دوڑتا ہوا مکان کے دروازے سے باہر
آ گیا۔ اس کا دل خوف سے ایسے اچھل رہا تھا کہ جیسے
ابھی باہر نکل آئے گا۔ پسینے سے اس کے سارے
کپڑے بھگ چکے تھے۔ وہ ہری طرح سے ایسے ہانپ
رہا تھا کہ جیسے وہ میلوں کا سفر دوڑ کر طے کر کے آیا ہو۔
اس کی بیوی کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہ
تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی پٹٹی پٹٹی نگاہیں دروازے
کی جانب مرکوز تھیں۔ اچانک ان کو برتنوں کے گرنے
کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ برتنوں کے گرنے کی
آواز خاصی بلند تھی اور برتن ایسے گر رہے تھے کہ جیسے
ان کو کوئی جان بوجھ کر زمین پر پٹ رہا ہو۔

آصف نے بیوی کا ہاتھ پکڑا اور اسے مکان
سے دور لے آیا۔ اس کے کانوں میں برتنوں کے ٹوٹنے
کی ہلکی ہلکی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ خوف سے وہ
خونچکاں بھونچکاں رہ گئے تھے۔ ان کی زبان جیسے گنگ
ہو گئی تھی۔ ”آؤ..... بچا کے گھر چلتے ہیں۔“ آصف
کے منہ سے بمشکل یہی الفاظ ادا ہوئے اور تکین اس سے
چٹ کر چلے گئے۔ وہ بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بچے کے گھر کے پاس تھے۔ وہ
تیزی سے گھر میں داخل ہو گئے۔ ان کی بدحوای دیکھ کر
گھر والے گھبرا گئے اور پھر چچا بولے۔

”آصف بیٹا..... تم اس وقت تکین کیا ہوا

خیریت ہے نا۔۔۔۔۔؟“

سین کرکین رونے لگی اور چچی کے گلے لگ گئی۔
تکین۔۔۔۔۔ تکین۔۔۔۔۔ بیٹی کیا ہوا۔۔۔۔۔ خیریت تو ہے نا۔۔۔۔۔
اتنی رات گئے۔۔۔۔۔ چچی اس کی پیٹھ پر چھکی دیتے ہوئے
اسے دلا سردیے لگیں۔

”کہیں تمہارا آپس میں جھگڑا تو نہیں ہوا۔۔۔۔۔“
اب کی بار اس کے چچا نے اس سے پوچھا تو آصف
بوللا۔۔۔۔۔ نہیں چچا۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔

”پھر کیا بات ہے، کچھ بتاؤ تو سہی۔“ اتنے میں
آصف کے چچا زاد بھی اٹھ گئے اور وہ بھی ان کو اس وقت
اور تکین کو روتا دیکھ کر فکر مند ہو گئے اور ان کے ارد گرد
آنکھیں ملنے ہوئے بیٹھ گئے سب نے ان سے اس
وقت آنے کی وجہ پوچھی تو آصف نے الف سے لے کر
ی تک ان کو سب کچھ بتا دیا۔

یہ سن کر سب سکتے میں آ گئے۔ چچی نے آصف
کو ڈانٹا کہ تم نے ہم کو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اگر تم لوگوں
کو کچھ ہو جاتا تو پھر۔۔۔۔۔

چچا نے آصف سے کہا۔ ”صبح ہی صبح ہم قاری
صاحب کے پاس جائیں گے۔“

رات سکون سے گزر گئی۔ صبح کی نماز پڑھ کر
چچا اور آصف قاری صاحب کے پاس منہ اندھیرے
پہنچ گئے قاری صاحب اس وقت ناشتہ کر رہے تھے۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر قاری صاحب نے ان سے اتنی
صبح آنے کا مقصد پوچھا تو آصف نے ان کو بتایا۔

آپ نے مجھے گھر میں گوشت رکھنے کا کہا تو میں نے
لگا تار تین دن گوشت رکھا۔ دو دن تو میں نے یہ سمجھا
کہ شاید کوئی بلی وغیرہ کھا گئی ہوگی کیونکہ ہمارے گھر
اکثر بلی بھی آتی رہتی ہے پھر تیسرے دن رات کو بارہ
بجے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ اور پھر اس نے سارا
واقعہ سنا دیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔! تم نے غلطی کی کہ متواتر تین دن
گوشت رکھا۔ اس سے جنات مشتعل ہو گئے اور انہوں
نے یہ حال کیا۔ شکر کرو کہ تم لوگ وہاں سے بھاگ گئے

ورنہ تم کو بھی نقصان کا اندیشہ تھا۔ اب معاملہ واقعی
ہے، تم گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ میں تمہاری ضرورت دور کر
گا۔ تم لوگ تھوڑی دیر بیٹھو۔۔۔۔۔ میں ساتھ چلا ہوں۔۔۔۔۔
”جی۔۔۔۔۔ جی ٹھیک ہے۔“ اس کے چچا نے
کہا۔ ”کافی نیک انسان ہیں۔۔۔۔۔ اور تم یہ نہیں
کرتے ہونا۔۔۔۔۔“

”جی چچا۔“ آصف بولا۔
تھوڑی دیر بعد قاری صاحب اپنی موٹر سائیکل
پر اور وہ اپنی موٹر سائیکل پر واپس گھر کی طرف
دینے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ آصف کے گھر کے پاس
تھے۔ قاری صاحب نے آصف سے آسپ والا
پوچھا اور ان سے کہا۔ ”دونوں ٹھیک دو گھنٹے بعد آ
مجھ سے ملنا۔۔۔۔۔ اب آپ لوگ جائیں مجھے پڑھنا
کرنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا اور انشاء اللہ تمام حالات
قابو میں آ جائیں گے۔“ آصف نے اس کمرے
نشاندہی کی اور وہ چچا کے گھر چلے گئے۔

قاری صاحب کمرے میں کچھ قرآنی آیات
پڑھتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے بتی آ
کر کے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر اک جگہ
دائرہ لگا کر بیٹھ گئے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ تک وہ لگا
الٹی پڑھتے رہے۔ پھر اچانک بلب جلنا اور کمرے
شروع ہو گیا اور چھت والا چلکھا بھی تیز رفتار سے
لگا۔ قاری صاحب جان گئے کہ اب جنات آ گئے
اور ان کو ڈرانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جنات
ہزار طریقے سے ان کو ڈرانے اور عمل سے باز رہنے
کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور پڑھنا
ہونے پر جنات مجرموں کی صورت بنائے قاری
صاحب کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

وہ تعداد میں کل چھ تھے۔ ایک مرد تھا ایک
عورت اور باقی چار بچے تھے۔ قاری صاحب نے ان
دیکھا اور پھر کمرے کی اس حال کو دیکھا۔ ان جنات
کمرے کی ہر چیز توڑ ڈالی تھی۔ برتن ہر جگہ پھیلے
پڑے تھے اور ٹوٹے ہوئے تھے۔ کمرے کو دیکھ کر

مگر ان لوگوں نے کمرے میں کچا گوشت رکھ کر
ہم کو مشتعل کر دیا۔ گوشت دیکھ کر مجھ کو میرے بچے کا مردہ
اور بچلا ہوا جسم نظر آتا اور میں انتقام لینے کے لئے بے
چین ہو جاتا۔ مگر میں نے صبر کیا۔
تیسرے دن مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں
نے ان کو صرف ہلکی پھلکی وارننگ دی کہ آئندہ اس
کمرے میں گوشت نہ رکھنا۔“

”مجھے انہوس ہے کہ کینوں کی نادانی کی وجہ سے
آپ کا بیٹا فوت ہوا مگر سلام ہے آپ کے جذبے کو کہ

لگتا تھا کہ جیسے کمرے میں کوئی بھیا تک طوفان آیا ہو
جس نے ہر چیز توڑ کر دی یا تھا۔
”کیوں تنگ کر رہے ہو ان کو؟ کیا بگاڑا ہے
ان لوگوں نے تمہارا؟“ قاری صاحب اونچی آواز میں
بولے۔

عورت بولی۔ ”قاری صاحب! ہم مسلمان جن
ہیں اور گھر کے مکین بھی ہیں۔ ہم ان کو بلا وجہ تنگ نہیں
کر رہے۔“

”تو پھر یہ سب کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ قاری
صاحب نے ان کی توجہ پھرے سامان کی طرف
مبذول کرا کے کہا۔

اتنے میں عورت کی آنکھ میں آنسو آ گئے اور مرد
بوللا۔ ”قاری صاحب آج سے ہفتہ پہلے کی بات ہے
کہ میرا بچہ چو لے میں کھیل رہا تھا کہ اس گھر میں موجود
عورت نے اس کے اوپر تھالی رکھ دی اور تھالی کے اوپر
اس نے اینٹیں رکھیں۔ میرا بچہ ایک سال کا تھا۔ جب
وہ اینٹیں اٹھانے لگی تو ایک اینٹ گر کر میرے بچے کے
سر پر لگی اور وہ اس کی ضرب سے مر گیا۔ ہم لوگوں نے
اسے خدا کی مرضی کہا اور ہم کو پتا تھا کہ ان میں ان کا
کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ یہ سب انجانے میں ہوا ہے۔

ہم نے ان کو اس بابت کچھ بھی نہ کہا کیونکہ ہم مسلمان
جنات ہیں۔ پھر ہم سر شام اس بچے کی یاد میں اگر بتیاں
جلانے لگے اس خوشبو سے یہ ڈرنے لگے تو ہم نے
اگر بتی جلانا بند کر دی۔

مگر ان لوگوں نے کمرے میں کچا گوشت رکھ کر
ہم کو مشتعل کر دیا۔ گوشت دیکھ کر مجھ کو میرے بچے کا مردہ
اور بچلا ہوا جسم نظر آتا اور میں انتقام لینے کے لئے بے
چین ہو جاتا۔ مگر میں نے صبر کیا۔

تیسرے دن مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں
نے ان کو صرف ہلکی پھلکی وارننگ دی کہ آئندہ اس
کمرے میں گوشت نہ رکھنا۔“

”مجھے انہوس ہے کہ کینوں کی نادانی کی وجہ سے
آپ کا بیٹا فوت ہوا مگر سلام ہے آپ کے جذبے کو کہ

آپ نے اسے اللہ کی رضا جانا۔۔۔۔۔ میں آپ سے ان کی
طرف سے دل کی گہرائی سے معذرت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔
آپ ان کو معاف کر دیں اور میری گزارش ہے کہ اس
کے بعد آپ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کو کوئی
نقصان پہنچے یا بدیریں۔“

”ٹھیک ہے قاری صاحب! ہم حضرت سلیمان
کی قسم کھاتے ہیں کہ اس کے بعد ان کو کوئی بھی گزند نہیں
پہنچائیں گے اور آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ
آپ ہم کو اس جگہ سے بے دخل نہ کریں کیونکہ ہم کافی
عرصے سے یہاں رہتے ہیں ہمارے خاندان کی یادیں
اس گھر سے وابستہ ہیں۔ خدا کے واسطے ہم پر اتنا کرم تو
لازمی کریں۔“

یہ کہہ کر سب بچے مرد اور عورتیں منت کرنے
لگے تو قاری صاحب کو ترس آ گیا۔ انہوں نے اس شرط
پر ان کو اس جگہ رہنے دی کہ وہ کبھی کسی بھی حالت
میں نہ تو ان کے سامنے آئیں گے اور نہ ہی ان کو اس
بات کی ہینک بھی پڑنے دیں گے کہ آیا وہ اس گھر کا
حصہ ہیں۔ ”قاری صاحب! اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔“
انہوں نے دعا دی اور پھر وہ سب نظروں سے اوجھل
ہو گئے۔

قاری صاحب کمرے سے باہر نکلے تو گیٹ پر
آصف اور اس کے چچا کو اپنا منتظر پایا۔ ”سنائیں قاری
صاحب۔۔۔۔۔ شکر ہے کہ آپ سلامت ہیں۔“ آصف
کے چچا نے بے صبری سے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ سارا مسئلہ حل ہو گیا، اب تم لوگ
آرام سے گھر میں رہ سکتے ہو۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم کو یہ
میرا وعدہ ہے اور ہاں یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے اسے بھول
جاؤ۔ اب یہ گھر ہر طرح محفوظ ہے۔“ قاری صاحب
آصف کو لمبی دے کر اور خوش خبری سنا کر چل دیئے۔ اس
کے بعد آصف اور اس کی بیوی اس گھر میں رہنے لگے۔
مگر کبھی بھی ان کو کچھ نہ ہوا۔



اچانک لڑکی کو عقب میں آٹھ محسوس ہوئی اس نے پلٹ کر دیکھا تو خوف سے اس پر کپکپی طاری ہو گئی کیونکہ عقب میں ایک انسانی ڈھانچہ کھڑا تھا، اس کی استخوانی کھوپڑی گردن کے بجائے اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔

دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی رات کے پرہول ماحول میں جنم لینے والی ایک خوفناک کہانی



مقامی اخبار کے دفتر میں کام کرتے ہوئے مجھے دوسرا سال تھا۔ میری رہائش چورجی کے قریب واقع آبادی شام گھر میں تھی جہاں میں کرائے کے ایک مکان میں تنہا رہتا تھا۔ تنہا اس لئے کہ میری ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور والدین ملتان میں رہتے تھے۔ بنیادی طور پر میں ایک کہانی نویس ہوں لیکن اس زمانے میں مصنف کو اس کی تخلیق کا اتنا معاوضہ نہیں ملتا تھا جس سے وہ آسودگی کی زندگی بسر کرتا جبکہ مجھے اپنی شادی کے لئے بھی کچھ رقم جمع کرنا تھی اور گھریلو اخراجات کے لئے والدین کو بھی روپے بھیجنے تھے۔ اخبار میں ڈیوٹی دینے کے بعد مجھے جتنا بھی وقت ملتا۔ اس میں ناول لکھتا تھا۔ ناول نویسی سے میں اپنے اخراجات پورے کرتا اور تنخواہ پوری کی پوری گھر بھیج دیا کرتا تھا۔

دفتر میں میری ڈیوٹی تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ دسمبر میں میری ڈیوٹی شام چھ بجے سے رات دو بجے تک کی ہو گئی۔ اخبار کا دفتر فاطمہ جناح روڈ پر شاہدین بلڈنگ کے پاس تھا۔ میرے پاس اپنی سواری نہیں تھی۔ میں منی بس کے ذریعے چورجی چوک سے مزنگ چوکی کے راستے دفتر جایا کرتا تھا لیکن اب مجھے

رات کے دو بجے دفتر سے واپس آتا رہتا تھا اور اس وقت منی بس دستیاب نہ ہوتی تھی۔ ٹیکسٹ خواہ میں، میں روزانہ رکشا ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اتفاق سے رات کی شفٹ کرنے والے ساتھیوں میں سے کوئی بھی چورجی کی طرف رہنے والا نہ تھا۔ ایک دوست فیروز پور روڈ پر شیشیا سے کچھ آگے رہتا تھا۔ اس کے پاس موٹر سائیکل تھی مگر اس نے مزنگ چوکی سے اچھرہ کی طرف جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ اکثر مجھے مزنگ چوکی پر چھوڑ دیا کرتا تھا وہاں سے میں پیدل ہی چورجی کی طرف چل دیتا۔ کبھی کبھی وہ موڈ میں ہوتا تو مجھے میرے گھر تک پہنچا دیا کرتا تھا۔

19 دسمبر کی وہ رات میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ اس رات فیاض ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ اس نے فون پر دفتر میں اطلاع کر دی تھی کہ اس کی والدہ شدید بیمار ہیں۔ میں پریشان ہو گیا کہ اب مجھے مزنگ چوکی تک پیدل جانا پڑے گا لیکن میں نے زیادہ دیر تک پریشانی کو ذہن پر مسلط نہ رہنے دیا۔ دفتر کے گرم کمرے میں مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ باہر موسم تبدیل ہو چکا ہے۔ دو بجے شفٹ ختم ہوئی۔ باہر آیا تو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں

نے سوچا کہ آج رکشا کروں لیکن اتفاق سے رکشا بھی نہ مل سکا اور میں پیدل ہی چل پڑا۔

سردھوا کے تھپڑوں سے بچنے کے لئے میں نے کوٹ کے کار کھڑے کر کے چہرے پر منظر لپیٹ لیا تھا جبکہ سر پر ادنیٰ ٹوپی بھی تھی۔ مزاح چوگی پر بھی کوئی رکشا نہ مل سکا۔ حالانکہ عام طور پر وہاں ایک دور کسے موجود رہتے تھے اور چائے کا ایک اسٹال بھی تین بجے تک کھلا رہتا تھا لیکن آج سردی کی شدت کے باعث اسٹال بھی بند تھا اور پولیس کے وہ سپاہی بھی غائب تھے جو روزانہ وہاں ڈیوٹی دیتے نظر آیا کرتے تھے۔ چوک سے میں چورجی جانے والی سڑک پر آ گیا۔ قبرستان کی حدود شروع ہوتے ہی ہلکی ہلکی بوند باندی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تاکہ بارش تیز ہونے سے پہلے پہل چورجی کے قریب پہنچ جاؤں اور وہاں بارش سے بچنے کے لئے کسی دکان کے شیعہ کا سہارا لے سکوں۔

سڑک کے دونوں جانب قبرستان تھا۔ ابھی میں نے نصف قبرستان بھی عبور نہ کیا تھا کہ بارش یکدم تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس علاقے کی بجلی بند ہو گئی۔ اسٹریٹ لائٹ بجھتے ہی وہاں بہت اندھیرا پھیل گیا۔ میں بائیں جانب کے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ فٹ پاتھ کی دوسری جانب قبریں تھیں۔ گہیں گہیں درخت بھی تھے۔ تیز بارش ہوا کے تھپڑوں کے ساتھ میرے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی۔ میں ایک اونچی قبر کے سر ہانے درخت کے نیچے رک کر بارش کا زور ٹھنسنے کا انتظار کرنے لگا۔ میری آنکھیں اندھیرے سے کچھ مانوس ہو گئی تھیں اور چند قدم تک میں دیکھ سکتا تھا۔

دفعتاً مجھے ہوا اور بارش کے شور میں رونے کی آوازیں سنائی دیں اور میں چوٹک پڑا۔ وہ آوازیں بائیں جانب قبرستان سے آرہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی عورتیں تین کر کے رو رہی ہوں۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ لیکن کچھ نہ دکھائی دیا۔ قبرستان میں گھنے درختوں کے سبب ادھر گہری تاریکی بھی میں نے

سوچا کہ رات کے ڈھائی بجے تاریک قبرستان میں عورتیں کیسے آئیں اور بارش کے دوران کیوں رو رہی ہیں جبکہ انہیں بارش سے بچاؤ کی تدابیر کرنی چاہئے۔ اگر وہ عورتیں کسی میت کے ساتھ وہاں آئی تھیں تو اس وقت میت کو لانے کی کیا وجہ تھی اور اگر یہ امر مجبوری اسی وقت ہی تدفین ضروری تھی تو عورتوں کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔

رونے کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں خیال آیا کہ رونے والی بدروہیں تو نہیں یہ خیال آتے ہی مجھ پر یکدم خوف طاری ہو گیا اور میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اتنے شدید موسم اور تاریکی میں رونے والی بدروہیں ہی ہو سکتی ہیں۔

بارش کم ہونے کی بجائے اور تیز ہوتی جا رہی تھی لیکن اب میں بدروہوں کے خوف سے وہاں ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ میرا لباس بارش سے بھیگ چکا تھا جوٹوں میں بھی پانی جمع ہو گیا تھا اوپر سے سردھوا کے تھپڑے میری فلفلی جمار ہے تھے۔ میں نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا اور اسی لمحے بدروہوں کے رونے کا شور یکدم ختم گیا جیسے کسی کھلونے کی چابی ختم ہونے پر کھلوا ہوا یکدم رک جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے عقب میں چھپاک چھپاک کی آواز سنائی دی جیسے کوئی پانی میں چل رہا ہو۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا اور چوٹک پڑا۔

پانچ چھ قدم پیچھے فٹ پاتھ پر پھیلے پانی میں چلا ہوا ایک آدمی میری طرف آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھتری تھی جو اس نے سر پر تان رکھی تھی۔ چھتری کے سائے میں اس کا چہرہ مکمل تاریکی میں پوشیدہ تھا۔ شاید اس نے میری طرح چہرے پر منظر بھی لپیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ اب میں وہاں تنہا نہیں۔ شاید وہ آدمی بھی مزاح چوگی کی طرف سے آرہا تھا اور اسے بھی کوئی سواری دستیاب نہ ہو سکی تھی۔ میں اس کے قریب آنے کا انتظار کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ بھی

چورجی کی طرف جا رہا ہے میں اس کے ساتھ چل دوں گا۔ اگر وہ چورجی چوک تک نہ بھی آئے تو قبرستان کے اختتام پر شروع ہونے والی آبادی میں تو جائے گا۔ وہ آدمی درخت کے نیچے میرے قریب آ رہا تو وہاں زیادہ اندھیرا تھا۔ اس نے شلوار میض کے اوپر سیاہ رنگ کی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ ”بہت سردی ہے آج۔“ وہ ایک لمحے بعد بولا جیسے مجھ سے مخاطب ہو۔ ”بجٹ بارش نے بھی آج ہی ہونا تھا۔“

”جی ہاں۔ اوپر سے تیز ہوا نے غضب ڈھا رکھا ہے۔“ میں نے اخلا کا مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میری تو فلفلی جی جا رہی ہے۔“ ”اوہ۔ آپ تو مکمل طور پر بھیگے ہوئے ہیں۔“ اس کی چوٹکی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”جانا کہاں ہے آپ نے؟“ ”شام نگر۔ اسلامیہ کالونی میں۔“ میں نے بتایا۔

”حیرت ہے کہ آپ چھتری لئے بغیر چل پڑے۔ کہیں آپ اخباری ملازم تو نہیں ہیں؟“ اس نے میری فلفلی میں دبا ہوا بھیگا اخبار دیکھ کر پوچھا۔ ”آپ کا خیال درست ہے۔ میں اخبار کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔ بنیادی طور پر اسٹوری رائٹر ہوں۔“ ”اچھا تو آپ کہانیاں لکھتے ہیں۔ کمال ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”مگر یہاں کھڑے کھڑے تو آپ کو نمونہ ہو جائے گا اور آپ کل نہ ڈیوٹی پر جا سکیں گے اور نہ کہانیاں لکھ سکیں گے۔ بارش کا کوئی بھروسہ نہیں کر سکتے۔ فی الحال تو تیز ہوتی جا رہی ہے۔“ ”آپ کہاں تک جا رہے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ مگر فی الحال میرے ساتھ آئیں۔ کسی قبر کے چھپڑے کے نیچے چل کر بیٹھتے ہیں۔“ اس نے چھتری میرے اوپر کرتے ہوئے کہا چونکہ بدروہوں کی آوازیں بند ہو چکی تھیں اور وہ شریف ہمدرد بھی میرے ساتھ

تھا، اس لئے میں بلا خوف اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ میرے پہلو میں چل رہا تھا۔ چھتری ہم دونوں کے سروں کو بارش سے بچا رہی تھی۔ ہم قبرستان میں داخل ہوئے تو بجی زمین پر کچھ ہو رہا تھا۔ تاریکی کے سبب مجھے وہ قدم سے زیادہ کی چیز نظر نہ آرہی تھی۔ دس بارہ قدم چل کر میں رک گیا۔

”یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔“ میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”کہاں بیٹھنا ہے۔“

”بس۔ وہ سامنے چھپر والی قبر ہے۔ آئیے۔ میرے پیچھے پیچھے آ جائیں۔“ وہ قدم بڑھاتا ہوا بولا۔ میں نے سامنے دیکھا لیکن مجھے چھپر والی قبر نظر نہ آئی۔ نہ جانے اسے کیسے نظر آرہی تھی۔ بہر حال میں احتیاط سے اس کے پیچھے قدم اٹھاتا رہا۔

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

”نہیں بیٹھے ہیں۔ پھر تلی سے تعارف کراؤں گا۔ ناصر صاحب!“ اس نے رکے بغیر کہا۔ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میرے ذہن کو حیرت کا جھٹکا لگا اور میرے قدم خود بخود رک گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے اب تک کی بات چیت کے دوران اسے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ میں نے بارش کے سبب جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ آدمی غائب تھا اور میں بلند چوڑے والی ایک قبر کے سر ہانے کھڑا تھا جس کا سفید سنگی کتبہ ہلکا ہلکا دھکا پی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ قبر کے پہلو سے گزر کر میری طرف پہنچ چکا ہے اور تاریکی کے سبب نظر نہیں آ رہا۔

”کہاں چلے گئے جناب۔۔۔۔۔“ میں نے اسے پکارا۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے گھبرا کر ذرا زور سے اسے آواز دی۔ ”بھائی صاحب۔ آپ کہاں ہیں؟“

اس بار بھی اس نے جواب نہ دیا اور دوسرے ہی لمحے ایک بار پھر مجھے بدروہوں کے رونے کا شور سنائی

دینے لگا۔ رونے اور بین کرنے کی براسر آوازیں سن کر مجھ پر ایک بار پھر دہشت طاری ہوئی اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ میں نے بدحواس لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن قریب کی قبروں کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میرے اندازے کے مطابق میں سڑک سے وہاں تک تقریباً تیس قدم اندر چکا تھا۔ بدروحوں کے رونے کی آوازیں میرے عقب سے برابر آ رہی تھیں۔ خوف سے میرا بدن لرزنے لگا اور شدید سردی کے باوجود مجھے پسینا آنے لگا۔

”بھائی صاحب.....!“ میں خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں زور سے چیخا۔

لیکن اس اجنبی ہمدرد کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ نجانے وہ مجھے قبرستان کے وسط میں چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔ میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بارش کی بوچھاڑ میں کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ بدروحوں کے رونے کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر دو منٹ بعد مجھے بائیں جانب کچھ فاصلے پر کسی چراغ کی لودکھائی دی جو تھر تھرا رہی تھی۔

”اس طرف آ جائیں مصطف صاحب.....“

”چراغ کی سمت سے اس آدمی کی آواز آئی۔ مجھے اس آواز سے کچھ حوصلہ ہوا اور میں چراغ کی لودی طرف بڑھنے لگا۔ اونچی نیچی قبروں کے آس پاس گزرتے ہوئے میں نے اچھے خاصے قدموں کا فاصلہ طے کر لیا لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ چراغ اب بھی مجھ سے اتنے ہی فاصلے پر تھا جتنے پہلی بار دکھائی دیا تھا۔ بدروحوں کے رونے کا شور مسلسل سنائی دے رہا تھا جیسے وہ بھی روتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہوں۔ یہ احساس ہونے پر خوف سے میرے قدم بھاری ہو گئے اور پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ میں چلا یا۔ ”ابھی کتنی دور ہو بھائی.....؟“

اس شخص کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اور اسی لمحے چراغ کی لو غائب ہو گئی۔ شاید ہوا سے بجھ گیا تھا۔ اب میں پھر اندھیرے میں تھا۔ میں نے تاریکی میں

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہاں میرے سامنے اور دائیں بائیں گئے درخت ہیں۔ میرے قدموں سے آگے ایک پختہ قبر تھی اور دائیں بائیں بھی قبریں تھیں۔ بدروحوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک بادل زور سے گر جا اور میرے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ میرے چیخنے پر بدروحوں کے رونے کا شور یکدم بند ہو گیا۔

”یہ نامر ادخواہ خواہ ہمارے درمیان آ چکا.....“ میرے عقب سے کسی کی غصیلی آواز ابھری۔

اور میری ٹانگیں لرزنے لگیں۔ میں نے پلیٹ کر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ یقیناً کسی بدروح کی آواز تھی جس نے مجھے نامراد کہا تھا۔ ”ہو سکتا ہے کسی کا مہمان ہو.....“ ایک اور آواز سنائی دی۔

اور خوف سے میری سانسیں رکنے لگیں۔ وہ آواز بھی میرے عقب سے ابھری تھی مگر مجھ میں پلٹ کر دیکھنے کی طاقت نہ تھی۔

”نامر صاحب۔ ادھر دائیں جانب آ جائیں۔“ ایک دلجوں بعد مجھے اجنبی ہمدرد کی آواز سنائی دی۔

میں نے دائیں جانب دیکھا لیکن ادھر بھی تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے دائیں جانب بڑھا۔ چند قدم ہی چلا تھا کہ اچانک زور سے بجلی چمکی اور ایک لمحہ کے لئے سارا قبرستان روشن ہو گیا۔ اس ثانیہ میں میری نظر دو قدم آگے کھڑے اجنبی ہمدرد پر پڑی اور خوف کے مارے پھر میری چیخ نکل گئی۔ اس شخص کے چہرے سے مظہر ہوا تھا لیکن اس کا چہرہ۔ خدا کی پناہ اتنا خوفناک چہرہ میں زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کسی مردے کا چہرہ تھا۔ گوشت پوست سے محروم وہ کسی انسانی ڈھانچے کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔

اس آدمی کے چہرے پر منہ ناک اور آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے تھے اور کھوپڑی کی ہڈی میں پیشانی سے ذرا اوپر دراڑ تھی۔ میں نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش

کی لیکن کچھ میں میرا پاؤں پھسل گیا اور میری پھر چیخ نکل گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ میں منہ کے بل کچھڑ میں گر جا، کسی نے مجھے کمر سے تھام کر گرنے سے بچالیا۔ یقیناً وہ اس اجنبی کے ہاتھ تھے جو مردہ تھا۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ ہاتھ کھڑے ہڈیوں کے نیچے تھے۔ ”گھبراؤ نہیں یار..... میں یہاں ہوں.....“ مجھے مردے کی آواز سنائی دی اور اس کے استخوانی ہاتھ میری کمر سے ہٹ گئے۔

”تت.....تم.....تم کون ہو.....!“ میں دہشت سے ہکلا یا۔

”میں تمہاری طرح انسان ہوں یار، کوئی بلا تو نہیں۔“ اندھیرے میں مجھے اس کی خوفناک ہنسی سنائی دی۔

”مم.....مگر.....تم.....تو.....تو.....!“ میں ہکلانے لگا۔

”ہاں! میں مردہ ہوں۔ لیکن ہوں تو انسان ہی نا۔“ وہ دوبارہ ہنسا۔ ”آؤ۔ یہ قریب ہی میرا گھر ہے۔“ ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا ہاتھ اس کے پنجے کی ہڈیوں میں آیا تو میں پوری قوت سے چیخا۔ ”نہیں.....نہیں.....“

اسی لمحے اس نے مجھے اپنی جانب کھینچا اور میرے حواس جواب دے گئے۔ شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا؟ اس کا اندازہ نہیں البتہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بڑی تاریکی میں پایا۔ ظاہر ہے تاریکی میں گھڑی پر وقت نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ دل و دماغ پر چھائی ہوئی دہشت کے سبب مجھے وقت دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ خود کو اندھیرے میں نرم زمین پر پا کر مجھے گزشتہ واقعات یاد آ گئے تھے اور میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ میں اپنی طرف تک نہ دیکھ سکتا تھا۔ پھر یہ محسوس کر کے میرا خوف اور بڑھ گیا کہ میں خشک زمین پر لیٹا تھا جبکہ قبرستان میں

میرے آس پاس بارش کا پانی اور کچھڑ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے لباس پر ہاتھ پھیرا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرا لباس بالکل خشک تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے نہ بارش ہوئی تھی اور نہ ہی بھیگا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن میرے دل نے کہا کہ خواب ہوتا تو میں اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا سو رہا تھا جبکہ میں کچی زمین پر دراز تھا اور وہاں اندھیرا بھی تھا۔ البتہ مجھے کسی قسم کی کوئی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ نہ بارش اور ہوا کا شور اور نہ بدروحوں کے رونے کی آوازیں۔ وہاں موت کا سا سکوت طاری تھا۔ میں زمین پر ہتھیلیاں لگا کر اٹھ بیٹھا۔

ٹھیک اسی لمحے بائیں جانب روشنی ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس جانب دیکھا اور خوف سے تھر تھرا کا پٹنے لگا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چراغ زمین سے پانچ چھ فٹ کی بلندی پر معلق تھا۔ وہ تیل کا دیا تھا جس کی لوساکت تھی اور وہ تیرتا میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا تو دہشت کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ میں اس وقت ایک گہرے اور کشادہ غار میں موجود تھا اور دائیں جانب ایک مردے کا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ اس کی استخوانی کھوپڑی سے میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی مردہ تھا جس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا اور میں خوف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

”ہوش کرو مسٹر ناصر.....!“ اس مردے کے چہرے نے حرکت کی اور آواز سنائی دی۔ ”محموظ جگہ پر ہو.....“

”یہ..... یہ..... کون سی جگہ ہے.....؟“ میں نے یہ مشکل پوچھا۔

”یہ میرا گھر ہے۔ میری آخری آرام گاہ.....“ مردے نے ہنس کر کہا۔

”مم.....مگر.....تم.....تم کون ہو.....“ میں ہکلا یا۔

”آج سے چالیس برس پہلے مجھے آصف کے نام سے پکارا جاتا تھا۔“ مردے کی آواز میں حسرت تھی۔ میں نے خوف کے باوجود حیرت محسوس کی۔ چالیس برس پہلے 1940ء تھا۔ گویا وہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر چراغ کی طرف دیکھا اور میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ چراغ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رکھا ہوا تھا لیکن اب وہ ہوا میں معلق نہیں تھا بلکہ ایک کفن پوش عورت کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ اس نوجوان عورت کا چہرہ برف کی مانند سفید تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی مگر بے جان تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں اور وہ خود بھی ساکت کھڑی تھی۔ یقیناً وہ کوئی بدروح تھی۔ اسے دیکھ کر ایک بار پھر دہشت کے مارے مجھ پر کچکی طاری ہو گئی۔

”یہ..... یہ..... کون..... ہے.....؟“ میں مردے کی طرف دیکھ کر خوف سے گھگھایا جس نے اپنا نام آصف بتایا تھا۔

مردہ حرکت میں آیا اور اس کی ہڈیاں کھڑکھڑانے لگیں۔ وہ بائیں جانب ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور مجھے اس کا گہرا سانس سنانی دیا۔ پھر اس کی آواز گونجی۔

”اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں دوست۔ یہ ایک روح ہے جو بہت مدت سے خون کی پیاسی ہے۔“ ”کک..... کیا.....!“ میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز خارج ہوئی۔

”گہراؤ مت یار..... یہ تمہارا خون نہیں پیئے گی۔“ مردے نے ہنس کر کہا۔ ”یہ تو اپنے دشمن کے خون کی پیاسی ہے جس نے اسے ہلاک کرنے کے بعد چتا میں جلانے کی بجائے یونہی زمین میں بدایا تھا مگر چیلوں اور گیدھوں نے اسے مٹی سے نکال کر اپنی غذا بنالیا تھا کیونکہ اسے صرف ایک فٹ کی گہرائی میں دفن کیا گیا تھا اور پہلی رات ہی بارش سے اوپر کی مٹی بہہ گئی تھی بہر حال اس کے بارے میں تمہیں میں بعد میں بتاؤں گا.....“

اس کی بات سن کر میرا خوف کم ہو گیا اور مجھے حیرت ہونے لگی۔ میں نے ایک بار پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا اور مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ اسے غار سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آ رہا تھا۔ چھت فرش سے آٹھ دس فٹ بلند تھی اور اس میں جابجا مکڑیوں کے جالے تھے ہوئے تھے۔ کہیں بھی کوئی سوراج یا شگاف نہ تھا اس کے باوجود وہاں بالکل ٹھن تھی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اسی بات پر تھی کہ میرا بارش میں بھیگا ہوا لباس کیوں کر خشک ہوا تھا۔

”تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے۔“ میں نے ہمت کر کے مردے سے پوچھا۔ ”تمہیں میرے نام کا کیسے علم ہوا۔؟“

”صرف نام.....!“ وہ خوفناک انداز میں ہنسا اور میں کانپ کر رہ گیا۔ ”میں تو تمہارے والدین تک کا نام جانتا ہوں ناصر۔“ مجھے عرصہ سے کسی کہانی نویس کا انتظار تھا۔ تم گزشتہ کئی راتوں سے اس سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ میں نے سوچا کیوں نہ تمہاری خدمات حاصل کی جائیں۔“

مردے کی بات سن کر میری حیرت بڑھ گئی اور میں سوچنے لگا کہ وہ مردہ مجھ سے کسی قسم کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں کتنی دیر سے وہاں موجود ہوں۔ یہ دیکھنے کے لئے میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی لیکن اس کی سوئیاں ساکت تھیں۔ وہ پونے تین بجے سے بندھی۔ میں نے مردے سے وقت کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن وہ خود ہی بول پڑا۔ ”مرنے کے بعد وقت کی کوئی پہچان اور اہمیت نہیں رہتی مسٹر ناصر..... اس لئے تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہئے۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

”تم کیا چاہتے ہو.....؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم میری آپ بیتی لکھو اور شائع کراؤ تاکہ پڑھنے والوں کو عبرت حاصل

ہو۔“ مرد نے کہا۔ ”اوہ! میرے پاس تو کاغذ نہیں ہے۔“ میں نے چونک کر ہوئے کہا۔ ”گھر جا کر لکھ لینا یار.....!“ اس نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ ”فی الحال یہ توجہ سے سن لو۔ پھر کاغذ پر منتقل کر لینا۔“

”کیا تمہاری آپ بیتی کا شائع ہونا ضروری ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”کیوں نہیں۔ اس کی اشاعت تمہارے لئے مشکل تو نہیں ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”جب تمہارے جھوٹے ناول کہانیاں شائع ہو سکتی ہیں تو میری آپ بیتی تو پھر بھی سو فیصد سچی ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو مطمئن رہو۔ میں تمہارے وقت کی پوری پوری قیمت ادا کروں گا۔ پبلیشر سے ملنے والے معاوضہ سے کئی گنا زیادہ معاوضہ دوں گا۔ لیکن تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تم کسی قطع برید اور اضافے کے بغیر صرف وہی لکھو گے جو میں تمہیں بتاؤں گا۔ ورنہ تمہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔؟“

اس کی دھمکی سن کر میرا دل لرزنے لگا۔ میں نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”بہت بہتر۔ لیکن میرا لباس کیسے خشک ہوا.....“

”ان پیکروں میں دماغ مت الجھاؤ میا۔“ اس کے لمبے سے ناگواری مترشح تھی۔ ”توجہ سے میری بات سنو اور دماغ میں محفوظ کرتے جاؤ۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے چراغ والی کفن پوش بدروح کی طرف دیکھا اور خوف زدہ ہو کر دوبارہ مردے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کہنے لگا۔

”آج سے چالیس سال پہلے میری عمر تیس برس تھی اور میں سنت گھر میں رہتا تھا۔ ہمارے پڑوس میں کئی ہندو خاندان آباد تھے۔ محلے میں ان کی دکانیں تھیں۔ میں کنوارہ تھا اور محلے کی ایک ہندو شہزادہ راکھی سے بیاہ کرنا تھا۔ راکھی بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میرے

والدین بھی راکھی کو پسند کرتے تھے لیکن راکھی کے والدین کو قسم کے ہندو تھے۔ اس لئے جب انہیں راکھی اور میری محبت کا علم ہوا تو وہ میرے دشمن بن گئے لیکن علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت کے سبب وہ مکمل کردہشتی نہ کر سکتے تھے۔ میں ان دنوں پنجاب لاہریری میں کلرک تھا اور راکھی گلزن کالج میں ایف اے کی طالبہ تھی۔ ہم دونوں کی ملاقات بس اسٹاپ پر ہوتی تھی۔

لیکن راکھی اور میری محبت کا علم ہونے پر اس کے والدین نے راکھی کو کالج سے ہٹالیا اور اس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی بہانے دوسرے تیسرے روز مجھ سے مل لیتی۔ ان خفیہ ملاقاتوں کا بھی اس کے والدین کو علم ہو گیا۔ تب انہوں نے شام لال سے ساز باز کر کے مجھ سے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ شام لال سنت گھر میں ہندوؤں کے مندر کا پروہت تھا۔ اس کے پاس بڑی شیطانی طاقتیں تھیں اور ہندو اسے بہت بڑا جادوگر سمجھتے تھے۔

ایک دن راکھی کا والد میرے دفتر آ کر مجھ سے ملا۔ میں نے اخلاقیات اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ وہ بڑی مکاری سے کہنے لگا۔

”آصف۔ تم بہت اچھے نوجوان ہو۔ میں تمہارے اخلاق سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ راکھی تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن میں اپنے مذہبی اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اگر تم اس سے شادی کرنا چاہتے تو تمہیں تھوڑی سی قربانی دینا پڑے گی۔“

میں نے جوش میں آ کر کہا کہ۔ ”میں راکھی کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ جان دے کر تم کیسے شادی کر سکو گے۔ اس کے لئے تمہیں اپنے مذہب کی قربانی دینا پڑے گی۔ تمہیں ہندو بننا ہوگا۔“

میں نے دل میں سوچا۔ اگر میں کچھ دنوں کے لئے ہندو بن جاؤ تو کیا حرج ہے۔ شادی کے بعد دوبارہ مسلمان بن جاؤں گا۔

”ٹھیک ہے۔ میں راکھی کی خاطر مذہب تبدیل کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ میں نے ایک لمحہ بعد کہا۔ ”مگر کیسے تبدیل ہو سکے گا۔“

”کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں نے مندر کے پروہت سے بات کی ہے۔ تمہیں اس کے پاس جانا ہوگا لیکن اس طرح کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کیونکہ تمہارے والدین اور رشتہ دار کبھی بھی پسند نہیں کریں گے کہ تم اپنا دین تبدیل کرو۔“

”آپ بے فکر ہیں۔ میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے جواب کہا۔ ”کیا مذہب تبدیل کرنے کے لئے کوئی خاص طریقہ کار ہے۔؟“

”ہاں..... اسی میں ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ تم یوں کرو کہ دفتر سے آج ہی ایک ہفتے کی چھٹی لے لو۔ رات دس بجے تم مندر چلے جانا اور وہاں شام لال پروہت سے ملنا۔ لیکن اپنے گھر میں یہ بتانا کہ تم سرکاری کام سے ایک ہفتے کے لئے پشاور جا رہے ہو.....“

یہ ہدایات دینے کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ آخر کار میری دلی تمنا پوری ہوئی گی اور راکھی کے والدین راضی ہو گئے۔

میں نے اسی روز دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی اور گھر آ کر بتایا کہ میں سرکاری کام سے ایک ہفتے کے لئے پشاور جا رہا ہوں۔ پھر رات کے ساڑھے نو بجے میں ایک بریف کیس میں کپڑوں کے دو جوڑے رکھ کر گھر سے نکل آیا۔ سردیوں کا موسم تھا اور نگلیاں سنسان پڑی تھیں۔ میں ہندوؤں کے مندر پہنچا تو مندر کا دروازہ بند تھا۔ دستک دینے پر ایک پجاری نے دروازہ کھولا۔

”مجھے مہاراج شام لال سے ملنا ہے۔ میرا نام آصف ہے۔“ میں نے پجاری کو بتایا۔

”آؤ..... وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ پجاری نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

میں اندر داخل ہوا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

مندر میں اس وقت مکمل خاموشی طاری تھی۔ پجاری مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ پوجا والے ہال کمرے کے بائیں جانب مڑنے کے بعد ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں مندر کا بڑا پجاری یا پروہت شام لال موجود تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پجاری کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔

”ہاں! تو تم راکھی سے شادی کرنا چاہتے ہو.....“ پجاری نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”مذہب کی تبدیلی کے لئے تمہیں چھوٹا سا سفر کرنا پڑے گا۔ کیا تم تیار ہو.....؟“

”میں اسی مقصد کے لئے تو آیا ہوں پنڈت جی.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کہاں جانا ہوگا؟“

”کوٹ رادھا کشن.....!“ وہ بولا۔ ”وہاں سونا گھاٹ پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔“

”سونا گھاٹ؟ کیا وہاں دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں بالکل۔ وہ ہندوؤں کا بہت پرانا مرگھٹ ہے۔ کوٹ رادھا کشن کی مغربی سمت میں آبادی سے ایک میل کے فاصلے پر۔“ اس نے بتایا۔

”بہت بہتر..... آپ کب آئیں گے اور مجھے کس وقت جانا چاہئے؟“

”تم ابھی روانہ ہو جاؤ۔ بارہ ایک بجے تک پہنچ جاؤ گے۔ رات وہاں کے مندر میں گزار لیٹا یا کسی مسجد میں۔ مندر میں جاؤ تو وہاں کے مہا پجاری کو میرا حوالہ دینا، وہ تمہیں مندر میں ٹھہرائے گا۔ کل رات ٹھیک نو بجے سونا گھاٹ کے مرگھٹ پہنچ جانا۔ میں سیدھا وہیں آؤں گا۔“

میں اس کی ہدایات لے کر وہاں سے چل پڑا۔ لاری اڑے پہنچ کر میں نے کوٹ رادھا کشن جانے والی بس پکڑی جس نے ساڑھے بارہ بجے مجھے

منزل پر پہنچا دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مندر کہاں ہے۔ اس وقت سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے اور نگلیاں سرخیں سنسان پڑی تھیں۔ وہاں مجھے کوئی شخص نہ ملا جس سے میں مندر کا پتہ پوچھتا۔ چنانچہ میں نے مسجد میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا جو مجھے اتفاقاً نظر آگئی تھی۔ مسجد میں اس وقت پیش امام کے سوا کوئی نہ تھا اور وہ بھی اپنے حجرے میں سو رہا تھا۔

میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور مسجد کے ایک کونے میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔ صبح ساڑھے پانچ بجے مجھے پیش امام نے جگایا اور مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں اپنے ایک عزیز سے ملنے آیا تھا لیکن تاریکی کے سبب اس کا گھر تلاش نہیں کر سکا تھا اس لئے یہاں آ کر سو گیا۔ اب دن کے اجالے میں ان کا گھر تلاش کرنے کی کوشش کروں گا.....“

اسے مطمئن کرنے کے بعد میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ میرا بریف کیس امانتاً اپنے پاس رکھ لے، عزیز کا گھر تلاش کرنے کے بعد لے جاؤں گا۔ بریف کیس پیش امام کے حوالے کرنے کے بعد میں مسجد سے روانہ ہونے لگا تو پیش امام نے کہا۔

”بیٹا۔ اب نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ نماز تو پڑھ لو۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں ہر نماز یہ سوچ کر ادا کرتا ہوں کہ شاید یہ میری آخری عبادت ہو۔“

میں رک گیا۔ میں نے وہاں جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی لیکن نماز کے دوران میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا کہ میں اپنے خدا کو چھوڑ کر ہندوؤں کے دیوتاؤں کا پجاری بننے والا ہوں۔ بہر حال نماز کے بعد میں مسجد سے لاری اڑے پر آیا۔ وہاں ہوٹل کھل چکے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نو بجے تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر سارا دن آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارا۔ رات آٹھ بجے میں نے ہوٹل سے کھانا کھایا اور قصبے سے باہر نکل آیا۔

میں مغرب کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک میل کے فاصلے پر سونا گھاٹ کا قدیم مرگھٹ تھا۔ دن کے وقت میں نے قصبے کے ایک ہندو کا کنارہ سے اس مرگھٹ کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ وہ سوڑیڑھ سو سال پرانا مرگھٹ تھا جہاں ہندو اپنے مردے جلایا کرتے تھے مگر پچیس چھپیس برس پہلے قصبے کے قرب مشرق کی طرف نیا مرگھٹ بن گیا تھا۔ اس کے باوجود مغربی سمت جتنے گاؤں سونا گھاٹ کے قریب پڑتے تھے، وہاں کے ہندو اب بھی اسی مرگھٹ پر اپنے مردوں کی چتا جلاتے تھے۔

میں آرام آرام سے چلتا ہوا ساڑھے آٹھ بجے ہی سونا گھاٹ کے مرگھٹ پہنچ گیا۔

سردیوں کی تاریک رات میں سونا گھاٹ کا مرگھٹ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں چلتا ہوا میں اس چوتھے کے قریب جا پہنچا۔ جہاں مردے کے لئے چتا جلائی جاتی تھی۔

میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور میرے اعصاب پر اجماعاً سا خوف طاری ہونے لگا۔ میرے چاروں طرف دور تک جلی ہوئی ہڈیوں کے اونچے نیچے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے، فضا میں عجیب سی بدبو بچی ہوئی تھی۔ شاید ایک دو دن پہلے وہاں کسی کی چتا جلائی گئی تھی جس کی سڑاؤ ابھی تک باقی تھی۔ میں نے ناک پر رومال باندھ لیا اور سردی سے ہاتھوں کو ٹھہرنے سے بچانے کے لئے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔

شام لال نے نوبے وہاں آنا تھا اور ابھی ساڑھے آٹھ بجے تھے وہاں بیٹھنے کے لئے کوئی مناسب جگہ نہ تھی چنانچہ میں وقت گزارنے اور سردی کا احساس زائل کرنے کے لئے ٹیلے لگا لیکن پندرہ بیس منٹ بعد ہی شلوار میں میری ٹانگیں بری طرح ٹھٹھری گئیں اور میں تھکاوٹ محسوس کرنے لگا نوبے تو میں بے تاب سے قصبے کی طرف دیکھنے لگا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ ساڑھے نو بج گئے اور شام لال نہ آیا تو مجھے

خیال آیا کہ اس نے اپنے آنے کا وقت نہیں بتایا تھا بلکہ مجھے نوجبے یہاں پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

میں تھک گیا اور چند قدم پر پڑے ایک پتھر کی طرف بڑھ گیا۔ میں پتھر پر بیٹھا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میرے نیچے کوئی چیز چنچنی ہے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر پتھر کی طرف دیکھا اور ہولکا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ پتھر کی بجائے ایک جلی ہوئی کھوپڑی تھی ٹھیک اسی لمحے مجھے اپنے آس پاس سے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے گرد کچھ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہوں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور خوف سے میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا لیکن ناقابل فہم سرگوشیاں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

میں حواس باختہ ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ یقیناً وہ آوازیں جلائے جانے والے مردوں یا ان کی روحوں کی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی خوف کا احساس گہرا ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ مجھے مرگھٹ سے باہر جا کر شیاام لال کا انتظار کرنا چاہئے۔ میں واپس چلا لیکن دو قدم ہی چلا تھا کہ ہڈیوں کے ایک ڈھیر سے ایک انسانی کھوپڑی بلند ہوئی اور میرے سامنے آ کر فضا میں ٹھہر گئی۔ اس کھوپڑی کو دیکھ کر خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں اپنی جگہ اس طرح رک گیا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔

”شیام لال کے آنے تک تم مرگھٹ سے باہر نہ جا سکتے آہ صف“ اس کھوپڑی سے ایک آواز بلند ہوئی۔

اور میں بے ساختہ اچھل پڑا۔ کھوپڑی سے اپنا اور شیام لال کا نام سن کر وہ دشت سے میری ٹانگیں کا پھنے لگیں اور خوف کی ایک تیز لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

”قت..... تم..... تم..... کون..... ہو.....؟“

میرے منہ سے ہلکا ہٹ خارج ہوئی۔

”شیام لال کا ادنی غلام.....“ کھوپڑی سے

آواز آئی۔ ”وہ میرا آقا ہے.....“ میرا نام موہن ہے۔“

میرے ذہن کو جھکا لگا۔ یقیناً شیام لال پر اسرار توں کا مالک تھا لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے غلام موہن کی کھوپڑی وہاں کب سے موجود تھی۔

”میں..... میں مرگھٹ سے باہر جا کر اس کا انتظار کرتا ہوں۔“ میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”ہرگز نہیں..... میں تمہیں باہر نہیں جانے دوں گا۔ تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھا یا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“ کھوپڑی نے سخت لہجے میں دھمکی دی اور خوف سے میرے پسینے پھوٹنے لگے۔ گویا میں مرگھٹ کی حدود میں قید ہو چکا تھا۔ کھوپڑی مجھے حکم دینے کے بعد وہاں تیرتی ہوئی واپس ہڈیوں کے ڈھیر میں جا کر غائب ہو گئی۔ میں خوف سے لرزتا ہوا سوچنے لگا کہ شیام لال نے مجھے یہاں کیوں قید کیا ہے جبکہ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں پر اسرار سرگوشیاں دوبارہ سنائی دینے لگیں اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ آوازیں میرے دائیں بائیں چلی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر سے آرہی ہیں۔ یہ احساس ہوتے ہی خوف سے میرا دل بیٹھنے لگا۔

ٹھیک اسی لمحے مجھے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ ”آہ صف۔“

میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا اور بے اختیار اچھل پڑا۔ میرے عقب میں ہڈیوں کے ڈھیر پر شیام لال بیٹھا تھا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ وہ اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا جبکہ میں قصبہ کو جانے والی سمت منہ کئے کھڑا تھا اور وہ مجھے ادھر سے آتا ہوا نہ دکھائی دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آسمان سے اتر آہو۔ کیوں کہ میں نے اس کے قدموں کی آئیں بھی نہیں سنی تھیں۔

”آپ..... آپ کب آئے پنڈت جی.....؟“ میں نے پوچھا۔

”نوجبے.....“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ.....“

اس کے جواب پر میں چکر کر رہ گیا۔ وہ نوجبے

سے وہاں موجود تھا لیکن مجھے اب نظر آیا تھا۔ نہ جانے وہ اتنی دیر کہاں اور کیوں چھپا رہا تھا۔

شیام لال مرگھٹ کے وسط میں سے چوتھے کی طرف بڑھا اور میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ لیکن اس کی چپلوں کی کھٹ کھٹ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے اس کے آنے کی آہیں کیوں نہیں سنی تھیں جبکہ میں ساڑھے آٹھ بجے سے وہاں موجود تھا اور وہ نوجبے آیا تھا۔ میں سوچتا ہوا اس کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ چوتھے کی دوسری جانب پہنچا۔ اس طرف جلی ہوئی ہڈیوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر ٹیلے کی شکل میں موجود تھا۔ اس ٹیلے کے پاس پہنچ کر شیام لال رکا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑوانے لگا۔ شاید وہ کوئی عمل کر رہا تھا۔

دومنٹ بعد ہی اس ٹیلے سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں بدروحیں مل کر رو رہی ہوں۔ مجھ پر ایک بار پھر خوف طاری ہونے لگا۔

شیام لال نے اپنا دایاں ہاتھ ٹیلے کی طرف دراز کیا اور دوسرے ہی لمحے ٹیلے سے ایک انسانی کھوپڑی فضا میں بلند ہو کر شیام لال کے سامنے معلق ہو گئی۔ اس کھوپڑی کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ وہ شیام لال کے غلام موہن کی کھوپڑی تھی جس نے مجھے مرگھٹ سے باہر جانے سے روکا تھا۔ شیام لال نے اس پر پھونک ماری اور کھوپڑی کی آنکھوں کے گڑھے روشن ہو گئے اس کی آنکھوں سے نکلتی روشنی کی شعاعیں ٹیلے پر پڑی تھیں۔ اس جگہ ایک کافی بڑا شگاف تھا جیسے غار کا دہانہ ہوتا ہے۔ اس غار کے اندر گہری تاریکی تھی اور بدروحوں کے رونے کی آوازیں اسی سے خارج ہو رہی تھیں۔

کھوپڑی غار کے دہانے کی طرف بڑھی اور شیام لال اس کے پیچھے چل دیا۔ غار کے دہانے میں قدم رکھتے ہی بدروحوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ شیام لال نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”آؤ نا.....“

میں اس کے پیچھے غار میں داخل ہوا۔ کھوپڑی کی آنکھوں سے نکلنے والی شعاعیں وہاں روشنی بکھیر رہی تھیں۔ غار کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہ تھی مگر وہاں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی جس سے میرا دماغ سڑنے لگا۔ میں نے ناک پر بندھے رومال پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کے باوجود بدبو میرے دماغ میں کھسکی جا رہی تھی۔ شیام لال مجھ سے دو قدم آگے اطمینان سے چل رہا تھا مگر دیواروں سے جھانکتی انسانی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کو دیکھ کر خوف سے میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ موہن کی کھوپڑی سے خارج ہونے والی روشنی ہماری رہنمائی کر رہی تھی جو چند قدم آگے فرش پر پڑ رہی تھی مگر فرش پر بھی ادھ جلی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں جو میرے پاؤں تلے کرا کر چرامتیں تو عجیب سی آواز پیدا ہوئی اور میرا جسم کانپ کر رہ جاتا۔

باہر سے پندرہ بیس گز لمبے چوڑے ٹیلے کا غار شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوا جا رہا تھا۔ پندرہ منٹ گزر گئے مگر سفر ختم نہ ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ مزید دس بارہ منٹ بعد تازہ ہوا کا جھوکا محسوس ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ ہم غار کے اختتام پر پہنچ گئے ہیں دومنٹ بعد ہم ہڈیوں کے غار سے باہر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی موہن کی کھوپڑی کی آنکھیں بھگ گئیں اور وہ اس طرح غائب ہو گئی جیسے کسی ہی نہیں۔ میں نے سامنے دیکھا اور مجھے حیرت کا جھکا لگا۔ ہم ایک مندر نما عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔

ستاروں کی مدد ہم روشنی میں وہ بہت قدیم طرز تعمیر کی مخروطی عمارت معلوم ہوئی تھی۔ عمارت کا چوٹی دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔ اور وہاں مکمل سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے شیام لال کی طرف دیکھا تو اس کا منہ حرکت کر رہا تھا۔ شاید وہ زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ عمارت کے آس پاس گھنے درخت اور خوردو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ چند لکھوں بعد اس مندر نما عمارت کا

دروازہ کھل گیا اور اندر ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دی لیکن دروازہ کھولنے والا کوئی نہ تھا۔ شام لال نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

”تم اندر جاؤ۔۔۔۔۔ تین کمرے چھوڑ کر چوتھے کمرے میں داخل ہو جانا۔ وہاں تمہیں جو کچھ پینے کو دیا جائے، خاموشی سے پی لیتا۔ پھر دیوی کے پاؤں پر سر رکھ کر اپنے پیچھے گناہوں کی معافی مانگنا۔ جب تک دیوی تمہیں معاف نہ کر دے کمرے سے باہر نہ آنا۔“

اس کی ہدایت سن کر میں سمجھ گیا کہ اب میرا مذہب تبدیل ہونے والا ہے۔ دیوی سے گناہوں کی معافی مانگنے کا مطلب تھا کہ میں اس کا پجاری بن گیا ہوں اور اسے خدا تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے شام لال سے کہا۔

”پنڈت جی۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں تاکہ مجھ سے کوئی غلطی ہو تو آپ اصلاح کر دیں۔“

”بے فکر ہو جاؤ۔۔۔۔۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں گا۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”لیکن چونکہ مذہب تم نے تبدیل کرنا ہے۔ اس لئے پہلے تم تنہا اندر جاؤ گے۔ مندر کا پجاری تمہاری رہنمائی کرے گا۔“

”وہ اندر کس جگہ ملے گا۔۔۔۔۔؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”پوچھا پاؤں والے کمرے کے باہر وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ شام لال جاؤ۔۔۔۔۔“

میں نے طویل سانس لیا اور پلٹ کر اس غار کی طرف دیکھا جس سے گزر کر ہم یہاں پہنچے تھے لیکن مجھے شدید حیرت ہوئی۔ وہاں کوئی غار یا نیلہ نہیں تھا۔ دور تک ناہموار میدان دکھائی دے رہا تھا۔ نہ جانے وہ غار کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اسی لمحے شام لال نے سختی سے کہا۔

”جاؤ نا۔ دیر ہو رہی ہے۔“

میں حیرت و خوف میں مبتلا آگے بڑھا اور مندر کے زینے چڑھ کر دروازے پر پہنچ گیا۔

مندر میں داخل ہو کر میں دو قدم ہی چلا تھا کہ

پیچھے سے دروازے کی چڑا ہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور گھبرا گیا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور وہاں ایک انسانی ڈھانچا کھڑا حرکت کر رہا تھا۔ شاید اسی نے

دروازہ بند کیا تھا۔ اسے دیکھ کر خوف سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے بہم کر سامنے دیکھا۔ یہ

ایک راہداری تھی جس میں دائیں بائیں کمروں کے دروازے بند نظر آ رہے تھے۔ آگے جاکر راہداری

بائیں جانب مڑتی تھی۔ میں لرزے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ راہداری کے موڑ پر ایک طاقتور میں دیا جل

رہا تھا کمرہ موڑ کی دوسری جانب تھا۔ میں خوف زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا موڑ کی دوسری جانب

پہنچا لیکن ادھر کا منظر دیکھتے ہی خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ سامنے ایک بڑے سے دروازے کے باہر

کف نما لباس میں ایک انتہائی کمزور شکل کا بوڑھا کھڑا میری طرف سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس

کے گنجے سر پر بالوں کی پتلی سی لٹ اس کے دائیں کان کے قریب لٹک رہی تھی اور گلے میں سیاہ رنگ کا پتلا

مگر لباس ناچاری طرح موجود تھا لیکن وہ سانپ زندہ تھا اور کلبار رہا تھا۔

شام لال نے کہا تھا کہ مندر کا مہا پجاری میرا منتظر ہوگا۔ یقیناً وہی مہا پجاری تھا۔ میں خوف زدہ ہو کر رکتا گیا۔

”آؤ سنے پجاری۔ نیا دھرم مبارک ہو۔“ اس کے کمزور ہونٹوں پر شیطانی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

میں خوف سے لرزتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے پلٹ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوا اور پلٹ کر

مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈگمگاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ہال کمرہ تھا۔ طاقتور میں دیئے جل

رہے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی سنہری کرسی پر دیوی کا بت رکھا تھا جس کے کئی ہاتھ تھے۔

کمرے میں لوہان کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بائیں جانب ایک گائے کا مجسمہ کھڑا تھا۔ اس کی پچھلی دونوں

ناٹگوں کے درمیان فرش پر مٹی کا ایک پیالہ رکھا تھا۔

میرے اندر آتے ہی پراسرار قسم کی آوازیں بلند ہوئی۔ وہ آوازیں چاروں طرف سے آرہی تھیں۔

گلتا تھا بہت سے لوگ بھجن گارہے ہیں لیکن وہاں مہا پجاری اور میرے سوا کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔

میں دہشت زدہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مہا پجاری گائے کے بچھے کے قریب پہنچا

اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی۔ پتھر کی بنی ہوئی

گائے پیشاب کر رہی تھی اور وہ پیشاب نیچے رکھے ہوئے پیالے میں گر رہا تھا۔ پیالہ بھر گیا تو پجاری نے

گائے کی پشت سے ہاتھ ہٹا لیا اور اس کا پیشاب گرتا بند ہو گیا۔ پجاری نے جھک کر پیشاب سے بھرا پیالہ اٹھایا

اور میرے قریب آ گیا۔

”پجاری! یہ پاک امرت پی لو اور دیوی کے قدموں میں جھک جاؤ۔“ اس نے پیالہ میری طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔

مجھے گھن آنے لگی۔ گائے کا پیشاب میں کیسے پی سکتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ نکلوں۔ میں

نے دروازے کی طرف رخ کیا لیکن ادھر دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی شدید سر دہر دوڑ گئی۔ وہاں

ایک انسانی ڈھانچہ کھڑا تھا۔ اس کے استخوانی ہاتھ میں ایک زندہ سیاہ ناگ کلبار رہا تھا۔ آنکھوں کے گڑھے

تاریک تھے لیکن اس کا چہرہ میری جانب تھا جیسے وہ مجھے دیکھ رہا ہو۔

”پجاری۔ پاک امرت پی لو۔ اس سے تمہاری نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔“ مہا پجاری نے دوبارہ کہا۔

لیکن میں نے اب بھی کوئی حرکت نہ کی۔ خوف سے میرا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ میں گائے کا پیشاب

نہیں پیتا چاہتا تھا۔ میں نے صرف راہی کو حاصل کرنے کے لئے مصنوعی طور پر مذہب تبدیل کرنے کا سوچا تھا لیکن گائے کا پیشاب پینے سے میں مستقل طور پر

ہندو بن جاتا۔

”لو۔۔۔۔۔ تم اسے اپنے ہاتھوں سے پلاؤ۔۔۔۔۔“

پجاری نے پیالہ ڈھانچہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پجاری!“ اس ڈھانچے کی کڑکٹی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ”پاک امرت پینے سے انکار کرنا پاپ ہے۔

نہیں پیو گے تو میرے جیسا بن جاؤ گے۔ خوی خوشی پی جاؤ ورنہ دیوی تم سے ناراض ہو کر تم پر اپنا قہر نازل

کر دے گی۔۔۔۔۔“

مہا پجاری نے دوبارہ پیالہ میرے چہرے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”پی لو نا میرے بچے!“

میں نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اس پر ڈھانچہ میری طرف بڑھتا ہوا غرایا۔ ”ٹھہرو! میں اس کی گردن دو پوتا ہوں۔۔۔۔۔“

اس کے ساتھ ہی وہاں روشنی پھیل گئی۔

ایک لمحہ کے لئے میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ پھر مجھے آس پاس کا منظر دکھائی دینے لگا میری

حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں اس وقت ایک کمرے میں موجود تھا اور سنت مگر کے مندر کا مہا پجاری شام لال

میرے سامنے کھڑا کمزور انداز میں مسکرا رہا تھا۔ کمرے میں اس کے غلام موہن کی کھوپڑی ہوا میں معلق تھی اور اس کی آنکھوں سے خارج ہونے والی روشنی میرے

سینے پر پڑ رہی تھی۔

”تم ہندو بن چکے ہو صف!“ شام لال نے مجھے مخاطب کیا۔ ”آج سے تمہارا نام شکر ہے۔“

”کیا اب راہی سے میری شادی ہو جائے گی پنڈت جی۔۔۔۔۔“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔ لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔۔۔۔۔ ”راہی کو حاصل کرنے کے لئے تمہیں کچھ عرصہ یہاں گزارنا ہوگا۔“

”یہ کیوں کی جگہ ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ سنت مگر کا مندر ہے۔ دیوتاؤں نے تمہیں اپنی طاقت سے یہاں پہنچایا ہے۔“ اس نے بتایا۔

اور میں حیرت سے اچھل پڑا۔۔۔۔۔ ”کیا واقعی؟“

”میری بات پر شک کرنا گناہ ہے شکر۔۔۔۔۔“

شام لال نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ دیوی نے

تمہیں میری غلامی میں دیا ہے۔“ میں نے اس سے معذرت کی اور کہا۔ میں راکھی سے ملنے کیلئے بے قرار ہوں پنڈت جی، مجھے اس سے ایک بار تو ملنا دیں۔“ انتظار کرو۔؟ وہ بولا۔“

”اس کمرے میں تمہیں جلد کاٹنا ہے۔ چالیس دن تک تم یہاں سے باہر نہیں جاسکو گے۔ اس دوران اگر تم نے کمرے سے نکلنے کی کوشش کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ تمہیں یہاں کھانا ملتا رہے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے موہن کی کھوپڑی کی طرف دیکھا اور حکمانہ لہجے میں بولا۔ ”موہن!“

”کیا حکم ہے میرے آقا۔؟“ کھوپڑی سے آواز خارج ہوئی۔

”شکر اب تمہاری تحویل میں ہے۔ اس کی نگرانی کرنا اور اسے باہر نہ جانے دینا۔“ شیام لال نے اسے حکم دیا۔

”بہت بہتر میرے آقا۔۔۔۔۔۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔“ کھوپڑی سے آواز آئی۔

تب شیام لال پلٹا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ کمرے کے فرش پر ایک دری پھٹی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ موہن کی کھوپڑی سے نکلنے والی روشنی میں میں نے وقت دیکھنے کے لئے اپنی رسٹ وائچ پر نظر ڈالی تو وہ بندی تھی۔ اسی لمحے کھوپڑی کی آنکھیں مجھ لگیں اور کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ مجھے بیٹھے بیٹھے نیند آنے لگی اور میں دری پر لیٹ کر سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میرے قریب ہی کھانا اور پانی کا پیالہ رکھا تھا۔ کھانا دیکھ کر مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ کمرے میں ہلکا ہلکا آلا تھا۔ شاید باہر دن ہو چکا تھا۔ میں نے کھانا کھایا اور پانی پیا۔ لیکن نہ جانے کھانے میں کیا اثر تھا کہ دو منٹ بعد مجھے دوبارہ نیند آنے لگی اور میں پھر سو گیا۔ دوبارہ بیدار ہوا تو میرے قریب تازہ کھانا رکھا تھا۔ میں نے کھانا کھایا جس سے مجھے دوبارہ نیند آ گئی۔

نجانے کتنا عرصہ گزر گیا۔ میں جب بھی بیدار ہوتا۔ تازہ کھانا موجود ملتا اور اسے کھانے سے مجھے دوبارہ نیند آ جاتی۔ میری گھڑی بندی تھی اور مجھے ہمیشہ یہی احساس ہوتا کہ باہر دن کا وقت ہے جس کے سبب کمرے میں ہلکا ہلکا اجالا ہے۔ ایک بار بیدار ہونے پر میں نے کمرے سے نکلنے کا ارادہ کیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن اسی لمحے دروازے کے پاس موہن کی کھوپڑی نمودار ہو گئی۔

”خبردار شکر۔ باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں رحم نہیں کروں گا۔“ اس سے آواز خارج ہوئی۔ اور میں خوف زدہ ہو کر واپس دری پر جا بیٹھا۔ موہن کی کھوپڑی غائب ہو گئی۔ میں اپنی بے بسی پر کڑھتا ہوا کھانا کھانے لگا۔

میں نے دوبارہ کمرے سے باہر جانے کی کوشش نہ کی۔ میری شیو بڑھتی جا رہی تھی اور جب میری داڑھی میرے سینے تک لمبی ہو گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کمرے میں مجھے کئی ماہ گزر چکے ہیں میں نے ایک بار پھر کمرے سے نکلنے کی کوشش کی لیکن موہن کی خوفناک کھوپڑی نمودار ہو گئی اور اس کی دھمکی سن کر میں مزید کئی ماہ تک باہر نکلنے کی کوشش نہ کر سکا۔ اس دوران مسلسل وہاں قید رہنے سے میرا جسم کمزور ہوتا چلا گیا۔ ہڈیاں نکل آئیں لیکن اعصابی کمزوری محسوس نہ ہوئی۔ شاید اس کھانے کی تاثیر تھی جو مجھے کمرے میں ملتا تھا۔

ایک دفعہ میں بیدار ہوا تو حسب معمول کمرے میں کھانا موجود نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ اسی لمحے مجھے ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں کفن میں لپیٹی ہوئی ایک روح کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا اور پھر میرے حواس پر خوف طاری ہونے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ بدروح کمرے میں کیوں آئی ہے۔ بدروح میری طرف بڑھی تو میں خوف سے چیختا ہوا اٹھ کر بھاگا اور کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ میرے بدن پر دہشت کے مارے کچھ طاری تھے۔

”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں میرے محبوب۔“ بدروح نے اپنی جگہ رک کر بڑے پیار سے مجھے مخاطب کیا۔

اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ آواز مجھے شناسا محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کفن میں پوشیدہ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ دوبارہ میری طرف بڑھی۔

”ٹھٹھ۔۔۔۔۔۔ ٹھٹھ۔۔۔۔۔۔!“ میں چیخا۔ ”کون۔۔۔۔۔۔ ہوتم۔۔۔۔۔۔!“

”میں تمہاری راکھی ہوں آصف۔“ بدروح نے رک کر کہا۔ اور چہرے سے کفن کا پلو ہٹا دیا۔ اس کی شکل دیکھ کر میں چکرا گیا۔ وہ خوبصورت چہرہ راکھی کا ہی تھا۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ شیام لال کی کوئی شیطانی حرکت نہ ہو۔ وہ دوبارہ میری طرف بڑھی۔

”تم راکھی نہیں ہو۔۔۔۔۔۔ وہ تو زندہ ہے۔ تم بدروح ہو۔۔۔۔۔۔ میں چلایا۔“

”تم دو سال سے یہاں قید ہو۔ تمہیں کیا پتہ کہ باہر کیا کچھ ہو چکا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”شیام لال نے تمہیں دھوکا دیا۔ تمہاری گمشدگی کے ایک ہفتہ بعد مجھے میرے والدین نے بتایا کہ تم ہندو بن چکے ہو اور شیام لال کی قید میں ہو۔ اس پر میں بہت چیختی چلائی میرے والدین نے بتایا کہ تم نے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کیا ہے تاکہ میرے ساتھ شادی کرنے کے لئے انہیں راضی کر سکو، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے والدین تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لئے کوئی چکر چلایا ہے۔ میں نے ان سے بغاوت کر دی کہ وہ جب تک مجھے حقیقت نہیں بتائیں گے، میں ان کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔ وہ میری شادی اپنے خاندان کے ایک لڑکے سے کرانا چاہتے تھے جو بہت بڑا تاجر تھا میری ضد دیکھ کر میری ماں نے یہ راز بتایا کہ میرا باپ تم سے ملنے تمہارے دفتر گیا تھا اس نے مہا پجاری شیام لال کو بھاری نذرانہ دے کر اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ

آصف کو کچھ عرصہ کے لئے غائب کر دے۔

میں نے اپنے باپ سے کہا کہ مجھے اس کی سازش کا علم ہو چکا ہے اور میں شادی کروں گی تو آصف سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔ میں تمہارے والدین کو حقیقت حال سے باخبر کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے مکمل طور پر گھر میں قید کر دیا گیا۔ ادھر میرے رشتے کے امیدوار تاجر کا تقاضہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جلد شادی کی جائے۔ میرے والد تاجر کی دولت حاصل کرنے کے لئے بے چین تھے۔ انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا اور پھر تشدد کرنا شروع کر دیا۔ تب میں نے اپنی نئی شرط بتائی کہ مجھے ایک ہفتہ کے لئے آزادانہ سوچنے کی مہلت دی جائے اور میری نظر بندی ختم کر دی جائے۔ والد کو خدشہ تھا کہ بھاگ جاؤں گی یا تمہارے والدین کو صورت حال سے مطلع کرنے کی کوشش کروں گی لیکن میں نے انہیں یقین دلانے کے لئے دیوی کی قسم کھائی۔ والد کسی حد تک مطمئن ہو گئے اور انہوں نے اس شرط کے ساتھ میری نظر بندی ختم کر دی کہ میں ان کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جاؤں گی اور کسی اہم ضرورت سے باہر جانا لازمی ہو گیا تو ایک مسلح محافظ میرے ساتھ ہوگا۔

دو دن بعد میں نے خریداری کا بہانہ کر کے والد سے باہر جانے کی اجازت مانگی اور انہوں نے اپنا ایک آدی میری نگرانی کے لئے ساتھ بھیج دیا۔ میں تانگے میں انارکلی کی طرف روانہ ہوئی لیکن میرے ارادے اور تھے۔ انارکلی چوک پر اترتے ہی میں دوڑ کر مسلم مسجد میں گھس گئی اور پیش امام سے درخواست کی مجھے مسلمان بنادے۔ اس نے مجھے کلمہ پڑھایا اور میں مسلمان ہو گئی۔ اتنے میں میرا محافظ بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں اس کے ساتھ واپس گھر آئی۔ والد نے پوچھ گچھ کی تو میں نے کہا۔

”میں مسلمان ہو چکی ہوں۔ اب میں کسی ہندو سے شادی نہیں کر سکتی۔“

میرے والد نے کہا کہ مذہب صرف کلمہ پڑھ

لینے سے تبدیل نہیں ہو جاتا اور مسلمان ہو جانے کے باوجود میری آصف سے شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ہندو بن چکا ہے۔ میرے امیدوار تاجر کے والدین کو میرے مسلمان ہونے کا پتہ چلا تو انہوں نے میرا رشتہ لینے سے انکار کر دیا اور اپنے بیٹے کی کہیں اور شادی کر دی۔ میرے والد نے مجھے اپنے مذہب پر لانے کے لئے شیام لال سے بات کی اور شیام لال نے ان سے کہا کہ ایک ہفتے کے لئے مجھے اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ چنانچہ مجھے مندر پہنچا دیا گیا یہاں شیام لال نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی کوشش نامکام بنادی۔

شیام لال نے مجھے مندر کے تہہ خانے میں قید کر دیا اور اپنی شیطانی خواہشات پوری کرنے کے لئے مجھے اپنی پراسرار طاقتوں سے ڈراتا دھمکانا شروع کر دیا لیکن میں نے تہہ کر لیا تھا کہ اس کے ناپاک عزائم پورے نہیں ہونے دوں گی۔ مسلمان ہونے کے بعد میں نے گھر کی ایک نوکرانی کے ذریعے نماز کی کتاب منگوائی تھی پاکٹ سائز کی وہ کتاب میں نے اپنے لباس میں چھپا رکھی تھی اس میں نماز کے علاوہ چند صورتیں اور کچھ دعائیں بھی تھیں۔ تہہ خانے کی تنہائی میں پوری کتاب میں نے یاد کر لی اور میرا خوف دور ہو گیا۔ میں وقت بے وقت نماز پڑھتی رہتی مجھے رات اور دن کا پتہ نہ تھا۔

شیام لال دوسرے تیسرے روز آتا اور مجھے گناہ کی ترغیب دیتا لیکن میں نفرت سے تھوک دیتی۔ مجھے ڈرانے دھمکانے کے لئے اس نے انسانی ڈھانچوں اور مردوں کو بھیجے کا سلسلہ شروع کیا لیکن میں خوف زدہ ہونے کی بجائے کوئی سورت یا کلمہ شریف پڑھ کر خود پر دم کھیتی اور وہ میرے قریب آنے سے باز رہتے۔ مندر کا ایک پجاری مجھے تین وقت کھانا دینے آتا تھا لیکن نہ تو وہ مجھ سے کوئی بات کرتا اور نہ میرے کسی سوال کا جواب دیتا۔ ایک دن میں لیٹی ہوئی تھی اور گرمی کے سبب

میں نے بلاؤڑ اتار کر ساڑھی کے پلو سے سینہ ڈھانپا ہوا تھا لیکن میری بے خیالی میں کسی طرح میرا سینہ نکلا ہو گیا۔ جس کا مجھے علم نہ ہوا تھا۔ اس دوران پجاری کھانا لے کر تہہ خانے میں آیا تو اس کی نظر میرے سینے پر پڑ گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں چمک محسوس کی اور مجھے احساس ہوا کہ اس کی نگاہیں میرے سینے پر جمی ہیں۔ تب مجھے پتا چلا کہ میرے سینے سے ساڑھی کا پلو ہٹا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے سینہ ڈھانپا اور اٹھ بیٹھی۔ ”کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیا کرو۔۔۔۔۔“ وہ پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں سمجھ گئی کہ میرا شائبہ دیکھ کر اس میں یہ تبدیلی آئی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس پجاری سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ اگلی بار وہ کھانا لایا تو میں نے ہنس ہنس کر اس سے باتیں کیں۔ وہ بھی بہت خوش ہوا۔ باتوں باتوں میں میں نے اس سے کچھ معلومات حاصل کر لیں۔ شیام لال نے میرے وہاں آنے کے تیسرے دن ہی میرے والدین کو اس پجاری کے ہاتھوں اطلاع بھجوئی تھی کہ میں نے مندر میں دیوبی کی موٹی کو گرا دیا تھا اور دیوبی نے ناراض ہو کر مجھ پر اپنا قہر نازل کر دیا جس سے میں جل کر راکھ ہو گئی۔ میرے والدین نے رودھو کر صبر کر لیا اور اپنی عزت کے خوف سے معاملہ پولیس میں لے جانے سے گریز کیا۔

دوسرے روز میں نے پجاری سے کہا کہ میں اسے پسند کرنے لگی ہوں۔ اگر وہ مجھے کسی طرح وہاں سے نکال لے جائے تو میں اس سے شادی کر لوں گی۔ پجاری پہلے تو شیام لال اور اس کی پراسرار قوتوں کے خوف سے آمادہ نہ ہوا۔ لیکن میں اگلے دو دن اسے اپنے ناز و انداز دکھانے اور ہلکی پھلکی جھلکیوں سے اسے لہجایا تو وہ راضی ہو گیا۔ اس پجاری کا نام رمیش تھا۔

ایک دن شیام لال تہہ خانے میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور وہ بہت نشے میں تھا۔ اس نے مجھ پر بحرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے شراب کی بوتل اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری اور وہ بے

ہوش ہو گیا۔ اس کی چیخ سن کر وہ پجاری کمرے میں آیا۔ شیام لال کو بے ہوش دیکھ کر بولا۔ ”راکھی موقع اچھا ہے۔ تم فرار ہو جاؤ۔ بعد میں میں بھی آ جاؤں گا۔ اس طرح شیام لال کو بھی علم نہ ہو سکے گا کہ میں نے تمہاری مدد کی ہے اور تم میرے گھر میں چھپی ہوئی ہو۔ لیکن تم اوپر کے راستے سے نہیں جا سکتی کیونکہ وہاں دوسرے پجاری تمہیں دیکھ لیں گے۔“

رمیش کا گھر قلعہ دیدار نگہ میں تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں دریائے راوی کے بند پر اس کا انتظار کروں، اس وقت رات کے دس بجے ہیں اور وہ بارہ بجے تک میرے پاس پہنچ جائے گا۔ مجھ کو کمرے سے نکال کر تہہ خانے کے ایک خفیہ دروازے پر لایا۔ یہ ایک طویل اور اندھیرا عمارت تھا جس کا اختتام مندر کی مغربی جانب شیام لال کے ذاتی مکان میں ہوتا تھا جس میں اس کا چھوٹا بھائی رہتا تھا۔ میں اس غار میں داخل ہوئی اور خدا کو یاد کرتی ہوئی چلنے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد میں غار کے اختتام پر پہنچی۔ آگے زینے تھے۔ میں زینے چڑھ کر ایک دروازے تک جا پہنچی۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔

اب میں ایک نیم تاریک کمرے میں تھی جو خالی تھا۔ دوسرے کمرے کی روشنی دیوار میں واقع کھڑکی کے ذریعے اندر آ رہی تھی۔ جو نصف کھلی تھی۔ کمرے کا دروازہ بھی تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں کمرے سے باہر آئی یہاں برآمدہ تھا۔ برآمدے سے آگے صحن ویران پڑا تھا اور صحن کا دروازہ بند تھا۔ میں نے صحن کا دروازہ کھولا اور خاموشی سے چلنے لگی گلی کا اختتام کیا راوی روڈ پر ہوا۔ پجاری رمیش نے مجھے راستہ سمجھا دیا تھا۔ یہ سڑک ساندھ کلاں سے ہوتی ہوئی بندر روڈ پر پہنچتی تھی۔ اس وقت سڑک سنسان پڑی تھی۔ کچرا راستہ تھا میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ مجھے اپنے والدین سے شدید نفرت ہو چکی تھی اور میں جانتی تھی کہ اگر میں گھر گئی تو

شاید شیام لال وہاں پہنچ جائے۔ رمیش سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ میں نے صرف شیام لال کی قید سے آزاد ہونے کے لئے اسے محبت کا فریب دیا تھا اور اب میں عارضی طور پر اس کی پناہ حاصل کرنا چاہتی تھی میرا ارادہ تھا کہ اس کی مدد سے ہمیں شیام لال کی قید سے آزاد کراؤں گی یا تمہارے والدین کو مطلع کروں گی تاکہ وہ پولیس کی مدد سے ہمیں آزاد کر سکیں۔

میں ساندھ جانے والی سڑک پر آ کر بندر روڈ کی طرف روانہ ہو گئی جہاں راوی کے کنارے مجھے رمیش کا انتظار کرنا تھا۔ ساندھ کلاں سے گزر کر میں بندر روڈ پر پہنچی۔ راستے میں مجھے کسی نے نہ دیکھا۔ ایک تو کافی رات ہو چکی تھی۔ میں نے سڑک کر اس کی اور بند پر چڑھ کر دوسری جانب اتر گئی جہاں راوی بہہ رہا تھا۔ سردی کا موسم تھا اور پانی کافی فاصلے پر تھا۔ میں بندے اتر کر مزید آگے جانے کی بجائے وہیں ایک پتھر پر بیٹھ کر رمیش کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا میرے اندازے کے مطابق بارہ بج چکے تھے لیکن رمیش ابھی تک نہیں آتی تھی۔ میں اٹھ کر بے تاب سے ٹپٹپٹ لگی۔ میرے پاس کوئی گرم لباس نہ تھا۔ بدن برصغیر ایک ساڑھی تھی جس میں میرا جسم ٹھہرتا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے عقب میں ایک انسانی ڈھانچا کھڑا تھا۔ اس کی استخوانی کھوپڑی گردن کی بجائے اس کے ہاتھ پر رکھی تھی اور کھوپڑی کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ میں خوف زدہ ہو گئی۔ یہ وہی ڈھانچا تھا جو تہہ خانے میں مجھے ڈرانے آتا تھا۔

”رمیش کا انتظار فضول ہے راکھی۔۔۔۔۔“ اچانک کھوپڑی سے ایک آواز خارج ہوئی۔ ”وہ نہیں آئے گا۔“ ”کک۔۔۔۔۔ کیوں؟“ میں خوف سے ہٹاؤں۔

اسی لمحے میرا پاؤں عقب میں کسی پتھر سے
 ٹکرایا۔ میں نے نیچے دیکھا تو ایک بھاری پتھر پڑا تھا
 میں پتھر کی دوسری جانب گر گئی۔ ڈھانچہ میری طرف

میں نے دل ہی دل میں خدا کا نام لیا اور ٹٹولی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک طرف بڑھنے لگی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ جس طرف میں چل رہی تھی ادھر

”شیام لال کے ہاتھوں سے بچنا ناممکن ہے
 ”اکی۔“ وہ غمراہ۔ ”تمہاری آخری وقت آپہنچا ہے۔“
 میں سمجھ گئی کہ اب وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

چند منٹ بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو شیام لال نظر نہ آیا۔ میں نے رک کر اس کے قدموں کی آہٹیں سننے کی کوشش کی لیکن فضا پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ میں دوڑنے کی بجائے ہانپتی ہوئی تیز قدموں سے چلنے لگی۔ چند منٹ بعد میں نے رک کر آس پاس کا جائزہ لیا تو حیران رہ گئی۔ میرے سامنے وہی مرگھٹ تھا جہاں سے میں نے دوڑنا شروع کیا تھا۔ تقدیر مجھے بھٹکا کر پھرویں لے آئی تھی۔ میری ہمت جواب دینے لگی اور میں قدرت کی ستم ظریفی پر بے اختیار رونے لگی۔ مگر اسی لمحے مجھے عقب سے ایک شفقت آمیز آواز سنائی دی۔

”ہمت نہ ہارو ناری..... یہ بزدلی ہے.....“

میں نے پلٹ کر دیکھا اور چونک پڑی۔ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر ایک سادھو کھڑا تھا۔ وہ بے حد بلا تپلا اور کمزور سا تھا۔

”میرے پیچھے آؤ۔ میں تمہیں محفوظ جگہ پر پہنچا دوں گا.....“ وہ دوبارہ نرم لہجے میں بولا۔

مصیبت کی اس گھڑی میں مجھے وہ سادھو ایک بڑا سہارا محسوس ہوا اور میں اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کا رخ مرگٹ کی مغربی جانب تھا۔ اس کی موجودگی سے میری ڈھارس بندھی۔ شاید قدرت کو میری حالت پر رحم آ گیا تھا اور اس نے میری امداد کے لئے اس سادھو کو بھیج دیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ فرلانگ چلنے کے بعد وہ ایک اونچے سے ٹیلے کے پاس پہنچا۔

”اس ٹیلے کی دوسری طرف میری لکیر ہے۔“ وہ چلتے چلتے بولا۔

میں اس کے پیچھے قدم اٹھاتی ہوئی ٹیلے کی دوسری جانب پہنچی۔ وہاں چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس میں چراغ جل رہا تھا۔

”چلو..... اندر جا کر آرام کرو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ سادھو نے جھونپڑی کے دروازے کے سامنے رک کر کہا۔

میں جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اندر فرش پر گھاس پھوس بچھا ہوا تھا۔ بائیں جانب ایک چراغ لکڑی کی تختی پر کھرا جل رہا تھا۔ وہ تختی دیوار میں تھسی ہوئی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور گھاس پر لیٹ گئی۔ چند منٹ میں ہی میرے اعصاب پرسکون ہو گئے اور مجھے نیند آ گئی۔ ابھی میری پوری طرح آنکھ نہ لگی تھی کہ مجھے باہر سے سادھو کی چیخ سنائی دی اور میں اچھل پڑی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر باہر جھانکا تو خوف سے کانپ اٹھی۔ باہر چند گز کے فاصلے پر سادھو زمین پر گر ہوا چیخ رہا تھا اور سیاہ رنگ کا ایک رینگہ اسے چیرنے پھاڑنے میں مصروف تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا کہ میں اس مہربان سادھو کو پیچھے سے بچائی۔ میں لرزتی

ہوئی دیکھتی رہی اور میری آنکھوں کے سامنے سادھو نے ترپتے ہوئے دم توڑ دیا۔ خونخوار رینگہ نے اسے بری طرح چیر پھاڑ ڈالا تھا۔ میں پیچھے ہٹنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے رینگہ کو جھونپڑی کی سمت بڑھتے دیکھا اور خوف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔ یقیناً وہ رینگہ اب مجھے شکار کرنا چاہتا تھا۔ جھونپڑی میں اپنا بچاؤ نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں باہر نکل کر ایک طرف دوڑ پڑی۔

اس خون خیاں نے رخ بدلا اور میرے پیچھے دوڑنے لگا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں دوڑتی ہوئی مدد کے لئے چلائی گئی۔

”یہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا کیا۔“ پیچھے سے شام لال کی غضب ناک آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے میرے قریب آچکا تھا۔ میں دہشت سے بے جاں ہو کر گر پڑی۔ میں نے شام لال کی قہر آلودہ آواز سنی۔

”فاحش! اپنا دھرم تبدیل کر کے تو سمجھتی تھی کہ میری روحانی طاقتوں کا مقابلہ کر کے اسے محبوب کو میری قید سے آزاد کرالے گی۔ میں تجھے نفٹ کر ڈالوں گا۔“

میں نے تیزی سے سنبھل کر رینگہ کی طرف دیکھا اور میرے حواس جواب دے گئے۔ شام لال کی آواز یقیناً رینگہ کے منہ سے نکلی تھی کیونکہ اس وقت وہی میرے قریب کھڑا ہانپتا ہوا مجھے اپنی خونخوار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ میں اب مزید بھاگنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کے اگلے دوؤں پنچے میرے بدن سے صرف چھ انچ کے فاصلے پر تھے۔ مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس رینگہ کے گرد سفید دھواں سا پھیل گیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ رینگہ دھوئیں میں گم ہو گیا۔ پھر دھواں غائب ہو گیا اور وہاں رینگہ کی بجائے شام لال کا ناپاک وجود دکھائی دینے لگا جس کے ہاتھ میں کرپان نظر آ رہی تھی۔ اس نے کرپان والا ہاتھ بلند کیا اور میں نے انفرادی طور پر بچنے کے لئے کروٹ لینے کی کوشش کی مگر اس نے فوراً ہی وار کر دیا۔

میرے پہلو میں گہرا گھاؤ آیا میں درو کی شدت سے چیخنے اور ترپنے لگی اور شام لال وحشیانہ انداز میں بار بار وار کرنے لگا۔ جھپٹے یا ساتویں وار کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ شام لال کرپان سے زمین کو دھرا رہا تھا اور قریب ہی میرا خون آلودہ جسم پڑا تھا۔ میں نے شام لال کو لٹکا کر لیکن اسے میری آواز نہ سنائی دی۔ مجھے اب اس سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں اس سے انتقام لینے کے لئے بے تاب تھی مگر میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا کہ میں اس پر وار کر سکتی۔ اس نے زمین پر چھ سات انچ گہرا گڑھا کھودا اور میرے زخمی جسم کو اس میں لٹکا کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ پھر وہ ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن کوئی قوت مجھے وہیں رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

اسی لمحے مجھے بوڑھا سادھو دکھائی دیا جو میرے قریب کھڑا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ”بابا..... کیا تم زندہ ہو.....؟“

”نہیں..... تمہاری طرح میں بھی اب صرف روح ہوں۔“ سادھو نے کہا۔ ”شام لال نے میرے جسم کو ہلاک کر دیا ہے۔“

”میں اس شیطان سے انتقام لینا اور اس کی قید سے اپنے محبوب کو آزاد کرانا چاہتی ہوں بابا۔“ میں نے خواہش ظاہر کی۔

”صبر کرو بیٹی.....!“ سادھو نے شفقت سے کہا۔ ”شام لال شیطانی طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ جب تک زندہ ہے تم اپنے محبوب کو آزاد نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنی طاقت کا ماورائی انتظام کر رکھا ہے۔ تمہیں اس کے مرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔“

سادھو مجھے اپنی لکیر میں لے گیا۔ اس کا جسم لکیر کے باہر پڑا تھا۔ رات کا اندھیرا ہونے کے باوجود مجھے دن کا سا اجالا محسوس ہو رہا تھا اور میں ہر شے دیکھ سکتی

تھی۔ میں نے سادھو سے کہا کہ ”میں شام لال کے مرنے کا انتقام نہیں کر سکتی اور ابھی اس کے پیچھے جانا چاہتی ہوں۔“ سادھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پاس جسم نہیں ہے۔ جسم کے بغیر تم اس کی شیطانی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ تمہارے محبوب کی نگرانی پر مامور موہن کی کھوپڑی تمہیں مندر کے اس کمرے میں داخل نہیں ہونے دے گی جہاں وہ قید ہے۔ اگر تو وہاں گئی تو ہو سکتا ہے کہ شام لال تجھے ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنالے۔“

مجبوراً مجھے صبر کرنا پڑا۔ اسی رات بارش ہو گئی۔ صبح ہوئی تو میں اس ویرانے میں گئی جہاں شام لال نے میری لاش دبا لی تھی لیکن اب وہاں چیلیں اور کوئے میری لاش پر موج اڑا رہے تھے۔ بارش نے میری لاش سے مٹی بہادی تھی سادھو کا جسم بھی مردار خور پرندوں کی غذا بن چکا تھا۔ میں ڈیڑھ سال تک اس ویرانے میں سادھو کی روح کے ساتھ تھکتی رہی۔ میں تم سے ملنے کے لئے بے تاب تھی لیکن مجبور تھی۔

آج صبح سادھو نے مجھے خوشخبری سنائی کہ شام لال مر گیا ہے اور میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ چنانچہ میں یہاں آ گئی۔ آؤ باہر چلیں۔“ راہی کی بات ختم ہوئی تو میں نے فرط مسرت سے بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگانا چاہا لیکن وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”نہیں میرے محبوب! تم مجھے اپنے ناپاک ہاتھ مت لگاؤ۔ تم ہندو ہواور میں مسلمان۔ اب تمہارا میرا ملاپ تمہاری موت کے بعد ہی ہو سکے گا۔“ اس نے کہا۔ راہی کی بات سن کر میرے دل پر خوف سا لگا اور شدت غم سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”راہی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے صرف تمہیں پانے کے لئے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے، تمہاری خاطر ہی ساری مصیبتیں جھیلی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے اور تمہارے اسی جذبے نے مجھے اب تک تمہارے پیار کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ مگر میں کیا کروں میرے

محبوب! میرے دین میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی بے دین اور مشرک کو اپنا بدن چھونے کی اجازت دوں۔ میں نے تو شیام لال کا ہاتھ بھی اپنے جسم سے مس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کی آواز بھر گئی۔ ”آصف! یہ نہ سمجھو کہ مجھے تم سے محبت نہیں رہی۔ میں اب بھی تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں کیونکہ محبت جسموں کا نہیں، روحوں کا ملاپ کا نام ہے اور تم ابھی زندہ ہو۔ تم اپنے گھر جاؤ اور دنیاوی دلچسپیوں میں حصہ لو۔ میں ہمیشہ تمہارے قریب رہوں گی۔“

”میں اب جی کر کیا کروں گا راکھی۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔ ”تمہارے بغیر میرے لئے اپنے میں کوئی کشش نہیں ہے۔ میں خود کو ہلاک کر کے تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

”نہیں آصف۔ خودکشی حرام ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”مرنے کے بعد بھی صرف اسی صورت میں تم مجھے پاسکو گے کہ تمہارا خاتمہ ایمان پر ہو اور تمہاری موت حرام نہ ہو۔ جاؤ دوبارہ مسلمان ہو کر خدا تعالیٰ سے توبہ استغفار کرو اور اپنی طبعی زندگی پوری کرو۔“

اس نے دروازہ کھولا اور میں باہر نکل آیا۔ نصف رات کا عمل تھا اور مندر پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ باہر کوئی پجاری موجود نہ تھا۔ میں اس کے ساتھ مندر سے باہر آیا۔ وہ مجھے میرے گھر تک چھوڑنے آئی۔

”آصف! میں اب چلتی ہوں لیکن میری التجا ہے کہ مجھ تک پہنچنے کے لئے حرام موت کا سہارا مت لیتا۔“

اتنا کہہ کر وہ گلی میں پھیلی تاریکی میں روپوش ہو گئی۔ میں گھر جانے کی بجائے وہیں سے پلٹا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ مسجد کا دروازہ بند تھا۔ میں امام مسجد کے انتظار میں بیٹھنے لگا۔ فجر کی اذان کا وقت ہوا تو امام مسجد وہاں آ پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو کر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔

”مولوی صاحب! کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں! میں آصف ہوں۔ دین محمد کا بیٹا۔ تیسری گلی میں ہمارا گھر ہے۔“

”م..... مگر..... مگر تم تو مر گئے تھے شاید.....“ وہ ہٹکایا۔ ”تمہاری غائبانہ نماز جنازہ میں نے ہی پڑھائی تھی۔“

”نہیں! میں زندہ تھا۔ دو سال تک میں ایک شیطان کی قید میں رہا۔ اب آزادی نصیب ہوئی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ اندر چلیں۔ میں آپ کو اصل بات بتا ہوں۔“

مولوی کو کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے مسجد کا دروازہ کھولا اور میں اس کے ساتھ مسجد میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ مجھے کوئی خیال آیا اور میں رک گیا۔

”مولوی صاحب۔ میں اندر نہیں آ سکتا۔ میں ناپاک ہوں۔“ میں نے اس سے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ اس نے پلٹ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”جی ہاں..... میں نے دو سال پہلے اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیا تھا۔ اب میں مسلمان ہونے آیا ہوں۔“

مولوی ایک لمحے کے لئے پریشان ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”اچھا..... تم اندر آؤ۔ وضو کرو۔ پھر میں تمہیں کمرے پڑھاتا ہوں۔“

وہ وضو کر کے مسجد کے صحن میں ہی بیٹھ گیا۔ میں نے بھی وضو کیا۔ پھر اس کے سامنے خدا کی وحدانیت کا اقرار اور حضور پاک ﷺ کی نبوت کی گواہی کے لئے کلمہ پڑھا۔

”لو۔ خدا کے فضل سے اب تم مسلمان ہو۔“ مولوی نے کہا۔ ”لیکن تم اب تک کہاں تھے اور ہندو کیوں بنے تھے۔“

میں نے مختصر آٹھیں شیام لال کے بارے میں بتایا۔ مولوی کے ساتھ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں گھر پہنچا۔ مولوی سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میری ماں میری جدائی کے صدمے سے ایک سال پہلے فوت ہو گئی تھی۔ صرف باپ زندہ تھا۔ والد صاحب نے مجھے دیکھا تو مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میں بھی رورہا تھا۔

پڑوس والے بھاگے آئے۔ وہ سب مجھے زندہ پا کر حیران تھے۔ میں نے کسی سے شیام لال یا راکھی کا تذکرہ نہ کیا۔ سب سے یہی کہا کہ پشاور میں مجھے پولیس نے چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ دو سال کی سزا ہوئی اور میں جیل میں رہا۔

والد صاحب سے پتا چلا کہ راکھی کے والدین ترک سکون کر کے ہریانہ چلے گئے تھے۔ میں اسی شام بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا سبب غالباً غذا اور آب و ہوا کی تبدیلی تھی۔ دو برس تک میں مندر کے تنگ تاریک کمرے میں ایسی مخصوص غذا کھاتا رہا تھا جس میں خواب آدردو شامل ہوتی تھی اور وہ غذا کھاتے ہی مجھے نیند آ جاتی تھی۔ غذا کی تبدیلی سے میں بیمار پڑا تو مرض بڑھتا گیا۔ والد صاحب نے اپنی بساط سے بڑھ کر میرا علاج کرایا لیکن کوئی افادہ نہ ہوا۔ ایک مہینے میں ہی ہڈیوں کا پیچر بن کر رہ گیا اور پھر ایک دن میری روح نے میرے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے یہاں دفنایا گیا۔

پہلی رات ہی راکھی کی روح آ گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ بہت جذباتی ملاقات ہوئی۔ میری موت قدرتی تھی لیکن اسے شیام لال نے قتل کیا تھا۔ وہ روزانہ یہاں مجھ سے ملنے آتی ہے لیکن اب تک وہ اپنے قاتل سے انتقام لینے کے لئے بے چین ہے اور اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب روز محشر تمام مردے زندہ کئے جائیں گے۔“

مردے کی آبِ بقی سن کر میں نے کفن پوش عورت کی طرف دیکھا جس نے چراغ اٹھا رکھا تھا۔

میں نے دوبارہ مردے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آصف! تم نے اس بدروح کے بارے میں نہیں بتایا۔ یہ کون ہے؟“

”ارے۔ تم اب تک نہیں سمجھ سکے۔“ مردے نے ہنس کر کہا۔ ”یہ وہی تو ہے جس کے لئے میں نے ہندو مذہب اختیار کیا تھا۔“

”اوہ! تو یہ تمہاری محبوبہ راکھی ہے۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں! اور میرے اب تک بکواس کرنے کا“

مقصود یہی تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں کتنی بڑی غلطی کی تھی۔“ وہ بولا۔ ”میں دنیا کو بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ محبت کرنا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن ایک مادی وجود کو پانے کے لئے اپنے خالقِ حقیقی کی وحدانیت سے انکار کرنا بدترین گناہ ہے محبت روحوں کا ملاپ ہے جو زندگی میں نہ سہی مرنے کے بعد ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن خدا سے پھرنے والے نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ یعنی نہ خدا ہی ملانہ وصال صنم۔ اور یہی میری زندگی کا عبرتناک پہلو ہے جس پر میں قیامت تک شرمندہ رہوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ پتھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میری استدعا ہے کہ تم میری آپ بیتی ضرور شائع کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں گے اور میرے حق میں دعا کریں گے۔ اب تم بتاؤ کہ میں تمہارے وقت کا کیا معاوضہ ادا کروں۔“

”نہیں میرے دوست!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہاری آپ بیتی پڑھ کر دو چار آدمی راہ راست پر آ جائیں تو یہ میرے لئے سب سے بڑا معاوضہ ہوگا۔“

”شکریہ۔ آؤ میں تمہیں باہر چھوڑ آؤں۔ بارش رک چکی ہے۔“ اس نے قریب آ کر زنی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

نہ جانے اس بار مجھے اس سے کیوں خوف محسوس نہ ہوا تھا۔ جو بچی اس نے ہاتھ پکڑا، چراغ بجھ گیا اور وہاں گہری تاریکی پھیل گئی۔ میں نے راکھی کی روح کی طرف دیکھا لیکن اندھیرے کے سبب وہ مجھے نظر نہ آئی۔ اسی لمحے مردے نے مجھے آگے کھینچا اور میں قدم اٹھانے لگا۔ پانچ چھ منٹ تک اندھیرے کا سفر جاری رہا۔ واپسی میں مجھے اس کا ہیولا تک نظر نہ آ رہا تھا۔

”ناصر صاحب!“ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے شروع میں بھی کہا تھا اور اب دوبارہ بھی تنبیہ کر رہا ہوں کہ میری آپ بیتی حرف بہ حرف اور کسی کانٹ



بدروح پیکر

فرید شہزاد - کراچی

اچانک نوجوان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تو گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں، آنکھوں میں بلیاں دوڑا اور غرا رہی تھیں، رات کے پچھلے پھر گمبہر خاموشی میں بلیوں کی غراہٹیں ماحول کو خوفناک بنا رہی تھیں کہ اچانک.....

نفسانی خواہشات کے دلدادہ لوگ کیا واقعی نشانِ عبرت بن جاتے ہیں۔ ثبوت کہانی میں موجود ہے

والے یہ کہانی ضرور پڑھیں۔ کیونکہ کسی چیز کو بھول جانے کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ میرے پاس کوئی رد عمل نہیں۔ کل بھی تنہا تھا۔ آج بھی تنہا ہوں۔

اکیلا امر کی آخری منزل پر ہوں۔ رات کے کسی پہر نیند ٹوٹ جاتی ہے تو ذہن فوراً اس کی طرف بھٹک جاتا ہے اور وہ اندھیروں کی کوکھ سے چمکتی جگنو کی طرح اپنی جون دکھانے لگتی ہے، تب پچھلی زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں، تو کچھ عجیب سا لگتا ہے، پچھتاوا ہوتا ہے کہ زندگی اندھیروں میں بھٹک رہی تھی، برسوں بعد بھی وہ رات اور اس رات کا ناقابلِ فراموش واقعہ ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا

انسانی زندگی انگنت، ناقابلِ فراموش واقعات اور حادثات سے عبارت ہے۔

بعض واقعات، حادثات اور سانحات اتنے گہمیر ہوتے ہیں کہ ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میری داستانِ حیات بھی ایسے ہی ایک حادثہ کا عنوان ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میری زندگی میں اچانک رونما ہونے والا یہ حادثہ صبر و تحمل کے لئے کچھ ہی باعث ہوگا کہ نہیں؟

کیونکہ یہ حادثہ، یہ واقعہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔ سن گھڑت کہانی سمجھ کر نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر بھی میری خواہش ہے کہ کہانی پڑھنے

چھوڑ گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے جب اس درخت کے نیچے پناہ لی تھی تو اس وقت ڈھائی بجے تھے اور ابھی صرف بیس منٹ ہی گزرے تھے۔

میں سوچتا ہوا وہاں سے چورجی کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچتے پہنچتے سواتین بج گئے۔ میں نے گیس بیڑ جلا یا اور بھگا ہوا لباس اتار کر دوسرا لباس پہن لیا مگر سونے کی بجائے میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور مردے کی آپ بیتی لکھنے بیٹھ گیا کہ ممکن ہے صبح تک بھول جاؤں۔ صبح کے ساڑھے سات بجے میں نے آپ بیتی مکمل کی اور قبرستان سے گھر میں داخل ہونے تک کے واقعات لکھ لئے۔ پھر میں بیڑ اور قلم سرہانے موجود میز پر رکھنے لگا تو میری نظر میز کے وسط میں پڑی اور میں بے اختیار اچھل پڑا۔ وہاں پچاس روپے کے نئے نوٹوں کی ایک گڈی دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً وہ مردے کی طرف سے میرے لئے معاوضہ تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نوٹوں کی گڈی اٹھائی۔ خوشی میں میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور پچاس والے نوٹوں کی گڈی میرے ہاتھوں میں کانپ رہی تھی۔ مگر نہیں گڈی کی بجائے اصل میں میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ پانچ ہزار کی رقم میری مینے بھر کی تنخواہ سے دو گنا تھی۔ میں نے گڈی کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو گڈی کی الٹی سمت میں نوٹ پر سفید دائرے میں نیلی روشنائی سے ایک لفظ لکھا تھا۔ ”آصف“

میرے یقین کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ مجھے اتنی بڑی رقم مل گئی تھی اور یہی مردے کی آپ بیتی کے سچا ہونے کا ثبوت تھا۔ رقم تو میں نے خرچ کر لی لیکن وہ نوٹ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے جس پر مردے نے اپنا نام لکھا تھا۔ یہ ایک یادگاری نوٹ ہے اور میں نے اس نوٹ کو اس لئے بھی خرچ نہیں کیا کہ ہو سکتا ہے اس آپ بیتی کی اشاعت کے بعد مجھے اس کی سچائی کے لئے کسی کو ثبوت پیش کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔



چھانٹ کے بغیر شائع ہونی چاہئے۔ یہ کوئی خوفناک قصہ نہیں، ایک حقیقی اور عبرت انگیز واقعہ ہے اور پڑھنے والوں پر اس کا صحیح تاثر صرف اس صورت میں ممکن ہے جب یہ کسی ترمیم و اضافے اور رو بدیل کے بغیر ان تک پہنچے۔ میں نے تمہارے وقت کا حسب وعدہ معاوضہ ادا کر دیا ہے جو تمہیں گھر پہنچ کر مل جائے گا لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں وعدہ خلافی برداشت نہیں کروں گا۔ کم از کم تمہیں یہ واقعہ دیا ننداری سے لکھنا ہوگا۔

”تم بے فکر رہو دوست۔“ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ ”سب کچھ تمہاری خواہش کے مطابق ہوگا۔“ میں نے کہا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ ٹھیک اسی وقت روشنی پھیل گئی۔ علاقے کی بجلی بحال ہو گئی تھی اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں خود کو اسی درخت کے نیچے پارہا تھا جہاں مردے سے ملاقات ہونے سے چند روز پہلے سے پہنچنے کے لئے رک گیا تھا۔ قبرستان میں بھی بقیات جل رہی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میرا لباس بھگا ہوا تھا حالانکہ چند لمحے پہلے تک خشک تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مردے کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ بارش رک چکی تھی اور مجھے پہلے کی طرح سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس صورت حال سے میں ایک بار پھر خوف زدہ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کہیں میں نے کوئی بھی ایک خواب تو نہیں دیکھا۔

میرے اندازے کے مطابق خشک لباس کے ساتھ کم از کم دو گھنٹے تک مردے کے ساتھ ایک غار میں اس کی آپ بیتی منتا رہا تھا۔ آپ بیتی مجھے یاد تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ میں اب تک پر اسرار واقعات سے دوچار رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی گھڑی میں پروقت دیکھا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ مردے کے غار میں گھڑی کی سوئیاں پونے تین بجے پر ساکت ہو گئی تھیں لیکن اب گھڑی چل رہی تھی اور تین بجنے میں دس منٹ کم تھے۔ گویا صرف پانچ منٹ میں مردہ مجھے اپنی طویل آپ بیتی سنا کر وہاں مجھے واپس

ہے۔ اس سے میرا تعلق کیسے ہوا، جسے پڑھ کر شاید آپ یقین نہ کریں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے۔

بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ گاؤں کے بہت سے لوگ اچھے دنوں کی تلاش میں مختلف شہروں میں جا رہے تھے، کچھ عرب ملکوں میں ریال اور دینار بنور رہے تھے، جب حالات کی تنگ دستی نے غمراہی کا تو ایک دن میں نے بھی گاؤں چھوڑ دیا۔ ایک میں ہی نکلا تھا۔ پڑھنا لکھنا تو دور کی بات کوئی ڈھنگ کا کام دھندرا بھی نہیں جانتا تھا۔ میں ایک کسان، ایک ہاری تھا۔ مٹی کو گھڑ کر زمین کی زرخیزی کے متعلق بتا سکتا تھا۔ لہذا تو گاؤں خور و جوان تھا۔ میرا صحت مند جسم کسی بھی صنف نازک کے کن اکھیوں سے دیکھنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ کھیت کھلیاؤں میں محنت مزدوری سے صحت قابل رشک تھی۔ شہر کے مختلف چوراہوں پر بھٹکتے بھٹکتے مسکن چورنگی پر سلامو سے آنا سامنا ہو گیا۔ وہ اپنی ریڑھی کے قریب درخت کی چھاؤں میں بیٹھا سوتا تھا۔ سلامو سے گاؤں کی پرانی یاری تھی۔ دیکھتے ہی لپٹ گیا۔ پردیس میں شناسا مل جانے پر خوشی ہوتی ہے، چائے پیٹے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا تو کہنے لگا۔

”پار تو فکر نہ کر، جو ہداری اپنا بندہ ہے، ٹھکانہ مل جائے گا اور ہمیں نہ کہیں دھندے سے بھی لگ جائے گا۔“

سلامو کی باتوں سے تقویت ملی۔

فلپوں سے کافی دور جھکیوں کی بستی تھی، کبھی یہ علاقہ غیر آباد ویران تھا، دور دور تک کیلر کی جھاڑیاں، اونچے نیچے نامور کڑھے تھے، جوں جوں جھکیوں کی بستی بستی گئی جنگل جھاڑیاں کٹتی گئیں، نیم پختہ، بے ترتیب، بے ڈھنگے گھروں کا سلسلہ پھیلتا گیا۔ دو پہر کا وقت تھا۔ سنان گلیوں میں اداس دو پہر کی وزیرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایک گلی کے موڑ پر سامنے کی جھکی کے صحن میں نو عمر چھو کرکوں کا غول شور مچا رہا تھا، کسی کی بھی عمر نو جوانی کی سرحد سے آگے نہیں تھی۔ یہاں دس روپے کے عوض دی سی آر پر فلم دکھائی جاتی تھی۔ لوگوں کو وقت پر بے پناہ پہنچ جاتا تھا، کبھی کبھی کوئی بوڑھا جھکی ہوئی چھت کے نیچے زور زور سے کھانسنے لگتا تو سناٹا کا ہنسنے لگتا۔ پھر وہی تھکی تھکی خاموشی چھا جاتی۔

سلامو کے ساتھ نذیراں قصائی کی دہلیز پر پہنچا تو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اب وہ گاؤں کا نذیراں قصائی نہیں چوہدری نذیر حسین جموعہ تھا، پیشہ بدل کر اپنی حیثیت بدل چکا تھا۔ قصائی تھا مگر تیز دماغ تھا، لین دین کے لوگوں کی سرپرستی میں وسیع و عریض رقبے پر قبضہ کر کے چھوٹی چھوٹی جھکیاں بنا کر چوہدری بن بیٹھا تھا۔ مجھے بھی ایک جھکی مل گئی۔ پردیس میں ٹھکانہ مل گیا تو بے انتہائی خوشی ہوئی۔ جھکی کیا تھی ساتھ گزری بوسیدہ بھری چار دیواری تھی، در و دیوار سے ویرانی برتی تھی، کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی اور کھڑکی کے قریب چوکی موجود تھی، مختصر سی چار دیواری کا آنگن بچ پوچھو تو مجھے اکیلے کے لئے کافی تھا، بھر بھری بوسیدہ دیواروں پر مکرڑوں نے جالے تان دیئے تھے، گرد کی دھیر تہہ صاف کرنے پچھراؤرنے میں سارا دن گزار دیتا۔

دوسرے دن چوہدری نذیر حسین جموعہ کے توسط سے ایک پلازہ میں چوکیداری مل گئی، اس پلازہ میں ایک دن بعد بیٹھا پانی آتا تھا، الگ سے نالکا لگا ہوا تھا۔ چار چھ فلٹ ایسے تھے جہاں کین بھر کر پانی پہنچاتا تھا، کینوں کی کاریں جھاڑ پونچھ دیا کرتا تھا۔ تنخواہ کے علاوہ اضافی آمدنی کا ذریعہ پیدا ہو گیا تو گاؤں کی تنگی ترشی دور ہو گئی۔ گاؤں میں تو اتنی رقم دیکھنے نہیں ملتی تھی۔

جھکی پٹی میں مانو سرحدی کا چائے کا کھوکھا تھا۔ سرکنڈوں کی چار دیواری پر چٹائیوں کی پھت تھی، بھدی گندمی میز کرسیوں پر کھیاں، بھن بھنائی رہتی تھیں۔ صبح سے رات گئے تک دی سی آر پر فلمیں چلتی تھیں۔ شام ڈھلے پلازہ سے آنے کے بعد کھوکھا میں فلمیں دیکھتا۔ پار دوستوں میں وقت گزارتا پھر رات گیارہ بجے کے بعد جھکی میں قدم رکھتا، جونہی جھکی میں داخل ہوتا چھٹی سی کی نادیہ شے کی موجودگی کا احساس دلاتی عجیب سی ٹھکن ہوتی۔ سوچتی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا اور بتی جلا دیتا۔ جھکی روشن ہو جاتی۔ کبھی کبھی دھندلی دھندلی سی پرچھائیں پلک جھپکتے نظر آتی پھر غائب ہو جاتی۔ سوئے میں قدموں کی چاپ ابھرتی جیسے آنگن میں کوئی چل پھر رہا ہو۔ کبھی کبھی بچن میں برتنوں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیتیں،

اچانک خوف سے دل زور زور سے دھڑکنے لگتا یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اندھیرے سے نکل کر سامنے آجائے گا۔ نیند ٹوٹ جاتی کبھی نیند میں چونک کر دیکھتا دیرانی اور پراسرار خاموشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں کمزور، پوک قسم کا آدمی نہیں جو سہم جاتا۔ ساری حرکتوں کو نظر انداز کر دیتا لیکن اجڑی نیند سے بیدار ہونے سے اعصاب میں ٹھکن، جسم میں تناؤ پیدا ہو جاتا نیندوں میں نیند اچاٹ ہو جاتی۔

وہ رات بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ تنگ تاریک گلیوں میں پت چھڑکی تیز ہوا میں بھٹکی ہوئی روجوں کی طرح پیچ رہی تھیں۔ جھکی کے پچھواڑے کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ کھلی کھڑکی سے آدھے چاند کی مدھم مدھم روشنی چھا کر رہی تھی۔ جھکی نیم روشن، نیم تاریک تھی، کھڑکی کے قریب چوکی پر گہری نیند سو رہا تھا۔

اچانک دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو گئیں کہ گھبرا کر آنکھیں کھل گئیں جبکہ نہ تو ذرا ناخواب دیکھا تھا اور نہ ہی کسی مافوق الفطرت شے کے متعلق سوچا تھا، آنگن میں بلیاں دوڑاؤں گری تھیں جیسے آبلے میں جھپٹ رہی ہوں، رات کے پچھلے پہر پراسرار خاموشی میں بلیوں کی غرائشیں ماحول کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا شبہ ہونے لگتا ہے۔ پہلے تو شٹا گیا پھر پھٹی چھٹی آنکھوں سے دیکھا تو وہی منظر تھا، غیر متینی مگر یقین کرنا پڑا، چونکہ اس کے وجود سے بھری بھری تھی، وہ بازو لیٹی خمار آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی، اس کی موجودگی اچھے کا باعث تھی۔ وہ شبہ جو پچھلے دنوں سے دل و دماغ میں پرورش پا رہا تھا یقین میں بدل گیا۔ میں جوان تھا، غیر شادی شدہ تھا۔ ایک عورت کو مرد کی نظر سے دیکھنے لگا۔ کبھی چہرہ شناسا لگتا تو کبھی اجنبی وہ نہ خوب صورت تھی نہ بد صورت، داہری رنگ و روپ کی عام عورت تھی۔ اس کی ساری خوب صورتی، ساری دلکشی، ساری جاذبیت سمٹ کر دراز گھنی زلفوں میں سما گئی تھی۔ اتنی دراز گھنی زلفیں تھیں کہ کمرے سے نیچے تمام اداؤں کی رات کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ کبھی کسی عورت کی اتنی دراز گھنی زلفیں نہیں دیکھی تھیں۔ بھر پور بدن کی مکمل عورت تھی مگر اس کی مسکراہٹ

میں دیکھنے کے انداز میں مصنوعی پن کا احساس ہوا، گناہ کے چور راستے داخل ہوئی دل و دماغ پر چھا گئی، ہاتھ پکڑا تو پوری کی پوری پکڑ میں آ گئی، کبھی کبھی کی طرح نرم و ملائم لگتی، کبھی تاریل کی طرح سخت، وہ ملی تو زندگی کی کمی پوری ہو گئی، جنون خیز جذبوں کو منزل مل گئی۔ پہلی گناہ عورت اجڑی زندگی کو مکمل کر گئی، آسودگی اور خوشگوار ٹھکن سے آنکھیں بند ہو گئیں۔ صبح جھکی خالی خالی تھی۔

اب ہر رات کا معمول بن گیا۔ رات کے پچھلے پہر خود بخود آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اب وہ اجنبی نہیں لگتی تھی۔ نہ گناہ لگتی تھی۔ راتوں کی نیند چرانے والی بڑی خوب صورت عورت تھی۔ کافرانہ عیشوہ طرازیوں سے چھینڑتی، ہر شب، شب اول کی سی شدت سے ملتی۔ چاہت کی گرمی نقطہ عروج پر پہنچ جاتی۔ خود ہر دگی میں زندگی عطا کرنے والی دھیمی دھیمی آ آتی ہوتی۔ احساس کی مٹھی مٹھی چھین ہوتی۔ کبھی کبھی طلسماتی شے کی طرح بھاری بھاری پتھر لگتی۔ اس وقت جسم و جاں میں خوف کی لہر دوڑ جاتی۔ کپکپا کر رہ جاتا۔ دن بھر پلازہ کے گیٹ پر بیٹھا آتی جالی عورتوں کو چھٹی چھٹی نظروں سے گھورتا ہر گناہ کوئی چہرہ اس جیسا نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں جو تک پورا خون چوس نہیں لیتی چھوڑتی نہیں۔ وہ چونک تھی جو چند ہی دنوں میں غیر محسوس طریقے سے میرا خون چوس رہی تھی، ڈنڈنی وائرس تھی جو توانائی چھین رہی تھی، میں جو گاؤں کا کبر و جوان تھا۔ سوکھ کر کاٹنا بن گیا۔ کھوکھلے پن سے دو قدم چلنا مشکل ہو گیا۔ زندگی بے مصرف خالی خالی لگنے لگی۔ چڑچڑے پن سے اچھی بات بھی بری لگتی تھی۔ شعور و ادراک جو جسم کی کارکردگی کے محتاج ہوتے ہیں مفلوج ہو کر رہ گئے۔ میری حالت سلامو سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ رازدار بنتے ہی وہ بھی فکر مند سی سوچنے لگا۔ پھر ایک دن ایک عامل کے پاس لے گیا۔ عامل نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں شٹا گیا۔

”تم جس کے ساتھ راتیں گزارتے ہو، وہ انسانی جسم نہیں، بدروح پیکر ہے، جو انسانی شکل میں خون چوس رہی ہے، تمہاری زندگی پراسرار طاغوتی طاقت کے قبضے میں ہے، یہی سلسلہ اور چند دن رہا تو ایک رات

تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی، میری باتوں پر عمل کرو، ورنہ تمہاری مرضی.....

میں ابھی مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ عامل کی باتیں سن کر کانپ گیا۔

پھر عامل نے کچھ بڑھ کر مجھ پر پھونکا۔ ایک تعویذ چوکی کے نیچے اٹنی طرف کیل سے ٹھونکنے کے لئے دی، ایک سال تک پتھر دم کر کے دیتے ہوئے کہا۔

”اپنی چوکی کے نیچے لڑھا کھو دو، اس کے کپڑے گڑھے میں ڈال کر اوپر پتھر رکھ دو، بس تمہارا کام ختم.....“

عامل کے آستانے سے نکلنے ہی سلامو اپنے دھندے پر چلا گیا۔ مجھے تعویذ گنڈوں، جھاڑ پھونک کے عمل پر اعتقاد نہیں تھا۔ جعلی پیر فقیروں کے بہت سے قصے کہانیاں سن چکا تھا۔ مگر وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بھروسہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بے دلی سے آستانہ سے نکلنے ہی آسب زدہ جھگی چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔

مختلف جگہوں پر مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ جب شہر لسانی بنیادوں پر تقسیم ہوا، ایک قومیت کی جگہ مختلف قومیت کا رجحان ہو تو کہیں ٹھکانہ ملنا مشکل ہو جاتا ہے، گلیاں نفروں میں مکے قومیتوں میں بدل جاتے ہیں۔

شام کی دہلیز پر رات کی تاریکی اتر رہی تھی، تھکا تھکا جھگی میں قدم رکھا۔ پراسرار خاموشی درود یوار سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں بزدل نہیں، ڈر پوک بھی نہیں تھا، مضبوط اعصاب، قوت ارادی کا پکا تھا، لیکن عامل کی باتوں سے کھوکھلا پن محسوس کر رہا تھا۔ کسی دشمن فوج کے عملے کا ڈر نہیں تھا۔ کسی دہشت گرد کی گولی کا خوف نہیں تھا۔ ایک ایسے دشمن سے سامنا تھا جو پیار و محبت سے قتل کرتا تھا۔ آنے والے وقت کی ہولناکی کے متعلق سوچ سوچ کر الجھن محسوس کر رہا تھا کہ مقصد میں کامیاب نہ ہو۔

ہوس کا تو بھانک موت واضح ہو سکتی ہے۔ وہ طلسمی رات رنگین بھی تھی۔ رنگین بھی، پورے چاند کی چاندنی بیٹھی ہوئی تھی۔ پچھلے پھر کے سنانے میں دور نہیں کتے، زور زور سے بھونک رہے تھے، وہ آتے ہی عشوہ طراز یوں کا سر پھونکنے لگی۔ ساڑھی چوکی پر بکھری پڑی

تھی۔ میری نظریں ساڑھی پر جمی ہوئی تھیں۔ باتوں باتوں میں چھوٹی سی گھڑی بنا کر سر ہانے رکھ دیا۔ کوئے کی طرح چوکس اس کے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا۔ بڑی مشکل تھی۔ بڑی سخت آزمائش کی گھڑی تھی اور میں اس گھڑی کو کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تو بہت شان انگڑائی لیتی ہوئی کروٹ بدلی موقعہ غنیمت جانا جھٹ ساڑھی گڑھے میں گرا کر اوپر پتھر لگا دیا۔ ایک جھٹ لگا وہ چونک پڑی۔

چہرے پر تردد کے آثار جھلک پڑے۔ یکبارگی تڑپ کر اٹھی پچھلی نظروں سے چاروں طرف دیکھتی تھو مارنے لگی۔ ساڑھی کی کشدگی پر تزلزل لگی۔ پھر سفاکی پر اتر آئی۔ صحن میں غرائی لمبیوں کی طرح غرائی جھپٹ پڑی۔ تیز نوکیلے ناخنوں سے نوچتی کھوٹی میرے چہرے اور بازوؤں کو بولہ بان کرنے لگی اس کی وحشت ناک دیکھ کر خوف کی لہر جسم و جاں میں دوڑ گئی۔ سراسیمگی سے ہر وار ہاتھ ہاتھ، بچاؤ کی جدوجہد کرتا رہا اور جب برداشت ناقابل برداشت ہو گئی تو بھٹا گیا، پھر پورے طمانچہ اس کے منہ پر بڑھ دیا۔ طمانچہ پڑنے ہی سارا غلطی ہوا ہو گیا۔ بولہ بان کی ہکا بکا ہو کر خوف سے لاچارگی سے دیکھنے لگی۔ شکست خوردگی اور پسپائی سے چہرہ بچھ سا گیا آواز روندہ گئی، ٹوٹی پھوٹی، اجڑی اجڑی سی لگنے لگی۔ کبھی کبھی چوکی کے پائے بیٹھی سسک سسک کر رونے لگی جھگی جھگی آنکھوں میں سمندر ابل پڑا۔ جھگی کی پراسرار خاموشی میں اس کی سسکیاں ٹھہر ٹھہر کر ابھرنی رہیں۔

رات کا سفر جاری رہا۔ دور نہیں کتے رہ رہ کر بھونکتے رہے۔ بہت دیر بعد اپنی پرہنگی کا احساس ہوا تو حیا سے سٹ گئی۔ چوکی کی چادر کھینچ کر بدن پر لپیٹ لی۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ شاپنگ بیک سے نئے کپڑے نکال کر دیئے تو تعجب سے دیکھنے لگی۔ پھر بے چارگی سے سمجھوتہ بھری نظریں جھک گئیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ زندگی قدم قدم رواں دواں تھی۔ اب اس میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ گھریلو عورت کی طرح کبھی کبھی سکھ پہنچا دیتی تھی۔ اس دوران کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر گناہ کا طمانچہ پڑا، تو خواب گراں سے بیدار ہوا کہ گناہ کی سزا فوری تو نہیں

برسوں بعد بھی ملتی ہے۔ دنیا ہی میں ملتی ہے۔ یہ سوچتے ہی کانپ گیا۔ معاشرے کی ناپائیدگی کھلنے لگی کیونکہ میری زندگی معاشرتی رشتوں سے کٹ گئی تھی، کبھی کبھی پاکیزہ جذبات و احساسات کی غلغلہ کھٹکی کہ غیر شرعی تعلقات گناہ ہے۔ جس کی اجازت نہ تو مذہب دیتا ہے اور نہ ہی مذہب پسند کرتی ہے۔ شرعی احکامات کی پابندی کرتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا چاہئے۔ بہت دنوں تک ایک ہی زاویے سے سوچنے کے بعد ایک رات اپنے خیالات کا اظہار کیا تو غلطے میں بائیں آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی پیار بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

”چھوڑیں بھی، جیسی گزرتی ہے گزرنے دیں، اسی میں بھلائی ہے، ہواؤں کو ٹھٹھی میں بند نہیں کیا جاسکتا۔“

اس کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی چپ سا دھلی۔ وقت بوڑھا ہوتا گیا۔ جذباتی گمراہی پر برف جمی گئی ان ہی دنوں پلیر امام دین کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ چار سال کویت میں رہ کر کویتی دینار بولا رہا تھا اس وقت جھگی کی کنڈے کی برقی رو سے رنگین تقویم کی جگہ جگہ گرتی روشنیوں سے روشن تھی۔ کالی پیلی عورتیں بے ڈھنگے پن سے بناؤ سنگار کئے جھوٹے انداز سے چیخ کر باتیں کر رہی تھیں، ڈھیر سارے بچے دوڑ بھاگ کرتے شور مچا رہے تھے۔ رات گیارہ بجے کے بعد بات آئی، ڈھولکی بے چاشنا ڈھول پیٹ رہے تھے۔ پٹاخوں کے ساتھ ساتھ ہوائی فائرنگ سے جھگی کی گونج رہی تھی۔ جس کے نشے میں بدست ہیر و قسم کے لڑکے بلوچی رقص کرتے جھوم رہے تھے۔ وہ بھاگ بھاگی آئی بازو پکڑ کر چپچتی ہوئی جھگی میں لے گئی، چہرہ کھلا کھلا سا تھا۔ جھگی میں داخل ہوتے ہی بائیں میری گردن میں حائل کر دیں۔ عجیب انداز سے ہنسنے کی پیار بھری اداؤں سے کہنے لگی۔

”مجھے وہ ساڑھی دو، بیگماں کو ساڑھی پہننے دیکھ کر دل چمکنے لگا۔“

”برسوں بعد ساڑھی کی طلب پر حیراں ہو گیا۔“

دھن دھن نہیں تھی۔

کر جاؤ گی۔“ میں نے تعجب سے کہا۔

”پرانی میلی نہیں ہے، مجھے بہت کھلتی ہے۔“ وہ شوقی سے بولی۔

میں سمجھا تا رہا، وہ ضد کرتی رہی، میں منانا تا رہا، وہ روٹتی ناراضگی دکھلاتی رہی، پھر آنکھوں میں سمندر ابل پڑا، لمحہ لمحہ اس کے روئے میں عاجزی افساری کے ساتھ ساتھ رقت آتی گئی، عجیب نگاہ میں مبتلا رہا، آخر اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا، چوکی سر کا کچھ پتھر بنایا یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ برسوں بعد بھی جوں کی توں تھی، نہ بیک لگی تھی نہ داغ دھبہ تھا، ساڑھی دیکھتے ہی خوشی سے نہال ہو گئی۔ دیوانگی میں تن کے کپڑے نوج نوج کر چوکی پر پھینکتی گئی جوں جوں ساڑھی باندھتی گئی چہرے کے تاثرات بدلتے گئے۔ وہ چہرہ جو کچھ پر پہلے شاداب کنول کی طرح تھا۔

شیطان تاثرات سے تنمنا اٹھا۔ اس قدر بھیا تک ہو گیا کہ نگاہیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ آنکھوں میں سانپ کے آنکھوں جیسی خون آمیز چمک عمو کر آ گئی۔ جس نے نظریں ملانے کی تاب چھین لی۔ سر کو جھٹکا دیا تو جوڑا کھل گیا۔ زلفیں چہرے پر بکھر گئیں۔ اتنا ڈر اڑنا چہرہ کبھی کا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا خبیث پن دیکھ کر میری جگہ کتنا ہی مضبوط اعصاب کا آدمی ہوتا اوسان خطا ہو جاتے۔ اس کے تھیکے تیز برسوں پیچھے لے گئے۔ میں گم سم حیران پریشان اجنبی دورا رہے پر کھڑا تھا۔ ٹھن زدہ ماحول میں سہا سہا کتے کے عالم میں ہاتھ پکڑنا چاہا تو شعلہ بار آنکھوں سے گھورتی جھٹکا دے کر چیخ پڑی۔

”چھوڑ دو مجھے، خبردار ہاتھ لگایا تو.....“ اس کی اجنبی چیخ کانوں میں گونجی، میں اور ہم گیا۔

پھر وہ جھٹ پٹی چھلاوے کی طرح باہر نکلی۔ شادی گھر جانے کے بجائے مخالف سمت کی تنگ و تاریک گلیوں میں مڑ گئی۔ اس کی تلاش میں بہت دیر تک اجنبی بے نام گلیوں میں بھٹکتا رہا۔ وہ ایسے غائب ہوئی، جیسے اندھیروں کی کوکھ سے جنم لی تھی، اندھیروں میں ہی ضم ہو گئی۔



سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 8

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تیر انگیز کہانی

وہ ایک انسانی وجود تھا۔ سفید کفن پہنے ہوئے۔ بالکل پتھرا ہوا ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کفن میں چھپا ہوا تھا۔ میں تو خیر بہت عرصہ سے پراسرار حالات میں گھری ہوئی تھی اور بے شمار حیرت ناک واقعات سے گزر چکی تھی لیکن سسز صوفیہ کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا۔ اس کے جسم کی لرزشیں قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔

”یہ۔ یہ کوئی مجسمہ ہے۔“ صوفیہ کی آواز ابھری۔

اس سے پہلے کہ میں صوفیہ کی بات کا کوئی جواب دیتی اچانک مجھے میں تحریک ہوئی اور پھر وہ آن کی آن میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں ہی اپنی چشیں نہیں روک سکیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے اور دروازے کی طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی لیکن پاؤں جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ سسز صوفیہ تو اپنے وزن تک کونہ سنبھال سکی اور اگر میں اس کے وزن کونہ سنبھالتی تو دونوں ہی طرح نیچے گرے۔

لیکن اس دوران کفن پوش بڑے پروقار انداز میں چلتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے اس عمل نے ہمیں اور حواس باختہ

کر دیا۔ ہماری جان نکلی جا رہی تھی۔ کفن پوش چلتا ہوا واپس اپنی کرسی تک پہنچا پھر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی کوئی دار آواز ابھری۔

”صوفیہ پر بیٹھ جاؤ۔“ اس آواز نے مزید دھماکہ کیا۔ تاہم مجھ سے پہلے سسز صوفیہ دھم سے قریب کے صوفیہ پر گر پڑی۔ اچانک ہی میری سماعت نے مجھے ایک عجیب سا احساس دلایا۔

یہ آواز! یہ آواز تو کچھ شناسا سی ہے۔ اس سے پہلے کہ میری سماعت نے آواز دو بارہ ابھری۔

”نشاء۔ میں دانش ہارون ہوں۔“

ہزار ایشم بم پھٹ گئے، ہزاروں آتش فشاں پھٹ گئے تھے، سرخ دھواں ہوا لاوا آسان تک اچھل گیا تھا۔ شدید زلزلے جیسی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ حالت بری طرح بگڑ گئی۔ سسز صوفیہ نے میری حالت دیکھ کر مجھے سمجھوڑا۔

”نشاء۔ نشاء۔ خود کو سننا لو۔“

میں خود کو کیا سننا لیتی۔ غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میرے حلق سے چیخی ہوئی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ابوکنا چاہتی تھی یا پاپا کہنا چاہتی تھی لیکن لفظوں کی تشکیل ہی نہ ہو پارہی تھی۔ ہارون دانش کی گونج

آواز دوبارہ ابھری۔

”مجھے اس کی کیفیت کا اندازہ تھا مس صوفیہ۔
کاش یہ مشکل لمحات ابھی نہ آتے۔ پلیز اسے سنبھالو۔“
”نشاء۔ نشاء۔“ مس صوفیہ کی آواز بمشکل نکلی۔
اس نے میرا سراپے سینے سے لگا کر مجھے سمجھنے لیا ہوا
پر محبت لمس تھا جس کا مجھے احساس ہوا۔ اور مس صوفیہ
سے میں لپٹ گئی۔ میں رونا چاہتی تھی۔ سسکیاں
لیتا چاہتی تھی لیکن کچھ نہیں ہو رہا تھا۔
”سر۔ سر۔ آپ۔“ صوفیہ کی حالت بھی زیادہ
بہتر نہیں تھی۔

”ہاں۔ میں دانش ہارون ہوں۔“
”سر آپ۔ انہیں۔ انہیں سنبھالیں۔“ صوفیہ
نے کہا۔

”نشاء۔ نشاء۔ خود کو سنبھالو بیٹی۔ غور کرو کچھ
وجوہات ہی تو ہیں جن کی بنا پر مجھے تم سے یہ عارضی
دوری اختیار کرنی پڑی ہے۔ ورنہ۔ ورنہ میری جان۔
میں یہی تو چاہتا تھا۔ انہیں لمحات سے تو میں بچ رہا تھا۔“
”سر آپ انہیں اپنا چہرہ دکھائیں۔ انہیں تسلی
ہوگی۔“ صوفیہ نے کہا، لیکن دوسری طرف خاموشی طاری
رہی۔ میری حالت کچھ بہتر ہونے لگی تھی۔ کفن پوش کی
آواز پھر ابھری۔

”ہمدانی نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ میں نے اسے
منع کیا تھا۔ خود بھی مصیبت میں پڑا مجھے بھی مشکل میں
ڈال دیا۔“

”سر آپ کو ہمدانی صاحب کے بارے میں علم
ہے۔“

”ہاں۔ بس کیا بتاؤں۔ اس نے خود ہی فیصلہ
کر لیا۔ کاش نشاء تعاون کر لیتی۔ اس قدر بھاگ دوڑ نہ
کرتی۔“

”سر۔ وہ.....“ صوفیہ نے کہنا چاہا۔ لیکن دانش
ہارون نے بات کاٹ دی۔

”غلطی مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ میں بھی صحیح فیصلہ
نہیں کر سکا۔ لیکن ہمدانی۔ خدا اسے زندگی دے۔“

”سر ان پر شدید تشدد کیا گیا ہے۔“

”ہاں۔ مجھے علم ہے بہت برا ہوا ہے۔ پتہ نہیں
ہمدانی نے کیا سوچا تھا۔“
”سر۔ آپ پلیز! نشاء کے بارے میں
سوچیں۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔“
”کاش۔ میں۔“ دانش ہارون نے جملہ ادھر
چھوڑ دیا۔

”مجھے ہدایت دیجئے سر، میں کیا کروں۔“
صوفیہ نے پھر کہا۔ تب ہارون دانش نے کہا۔

”نشاء۔ مجھے تمہاری اس کیفیت کا اندازہ ہے
لیکن تمہیں علم ہے کہ تینوں میں کارچوک میں ہمیں کیا
واقعات پیش آئے تھے۔ میں انہیں واقعات کا شکار
ہوں۔ تمہیں ہمدانی کے بارے میں پتہ چل چکا ہے۔
اس میں کوئی سپورٹن مجھے بھی پیش آ سکتی ہے۔ مجھے کچھ
وقت دو۔ میں ان حالات پر قابو پانے کی کوششوں میں
مصرف ہوں۔ بس تھوڑے دن اور۔“

میں کیا جواب دیتی۔ میں بچتی بچتی آنکھوں
سے اس کفن پوش کو دیکھ رہی تھی جس کے بارے میں
اب مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ میرا باپ ہے یا نہیں۔
میں تو ہری طرح پریشان تھی، ایک عورت، جو میری ماں
نہیں تھی لیکن جسے میں نے ماں سمجھا تھا۔ پورے آٹھ
سال تک میں جسے ماں سمجھتی رہی تھی اور ایک مرد جو میرا
باپ تھا۔ لیکن۔

اس وقت مس صوفیہ کی آواز ابھری۔

”سر میں تو واقعات سے قطعی لاعلم ہوں۔ میں
تو یہ بھی نہیں جانتی کہ اب مجھے میرے نام سے کیسے
واقف ہیں؟“

”مس صوفیہ۔ اس بارے میں اتنا کہوں گا کہ
اے کے ہمدانی میرا ویل ہے۔ خدا اسے زندگی دے۔“
میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور میں اس کے
بارے میں۔“

”سر۔ میں۔“
”ہاں میں آپ کی بات کا جواب دے

رہا ہوں۔ ظاہر ہے اس کی وساطت سے میں آپ کے
بارے میں بھی جانتا ہوں۔“
”سر۔ نشاء نے میں مجھے اپنے ماضی کے
بارے میں بتایا ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ لیکن کچھ
باتیں کئے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔“
”کہئے۔“

”یہ بچی بڑی خریدیوں کا شکار ہے۔ اس کا ماضی
جو بھی ہو۔ حال میں آپ اس کے سب کچھ ہیں۔ لیکن
اس وقت بھی یہ آپ کی شفقت سے محروم ہے۔“
”آپ ٹھیک کہتی ہیں صوفیہ، لیکن کفن پوش یہ
بات کہہ کر خاموش ہوا تو مس صوفیہ جواب سنبھل گئی
”نہیں۔ بولیں۔“

”جی سر..... لیکن۔“
”جو کچھ ہے مس صوفیہ۔ وہ انسانی عقل سے
بہید ہے۔ چند الفاظ میں اسے بیان نہیں کیا جاسکتا ہے نہ
سمجھا جاسکتا ہے۔“

”پھر بھی سر۔ نشاء کے لئے کیا کیا جائے۔“
”بس کچھ مصیبت۔ سارے معمے حل
ہو جائیں گے۔“

”معاف کیجئے کتنی مصیبت۔ آپ جانتے ہیں
بس اپنے لئے نہیں نشاء کے لئے یہ سوالات کر رہی ہوں
اور گستاخی کی معافی چاہتی ہوں۔“

”شاید چند ماہ۔ ہمدانی اگر جلد بازی نہ کرتا
تو بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں اور اگر نشاء۔ فیض بابا
اور آ پاندیہ سے تعاون کر لیتی تو مجھے آگے کے عمل میں
آسانیاں ہو جاتیں۔“

”وہ کیسے سر؟“

”اسے گھر سے باہر قدم نہیں نکالنا چاہئے تھا۔
کچھ لوگ میری تاک میں تھے۔ خیر جو ہونا تھا وہ ہو چکا
ہے۔ میں نشاء سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

میں اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت میں تھی۔
مجھے اس شخص پر غصہ آ رہا تھا جو کچھ وقت پہلے تک
میرا باپ تھا لیکن اب ہر لمحہ سے بے نیاز میری کیفیات

سے بے نیاز صرف اپنی مشکلات بیان کر رہا تھا۔ کفن
پوش کی آواز پھر ابھری۔
”اس کے علاوہ صوفیہ کچھ ذمہ داریاں، ہمدانی
سے تمہارے تعلق کی بنیاد پر، میں تمہارے سپرد
کرنا چاہتا ہوں۔“
”جی سر۔“

”کیا تم ان مشکل حالات میں نشاء کا ساتھ
دے سکو گی۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا سر.....“
”حالات کی سنگینی کا تمہیں اندازہ ہے۔“
”کافی حد تک۔“

”اور واقعات کی الجھنوں کا بھی۔“
”آپ مجھے بتائیے سر۔“
”تمہیں نشاء کے ساتھ سفر کرنا ہوگا۔“

”سفر.....؟“
”ہاں۔ ایک طویل سفر۔“
”کہاں کا جناب؟“ صوفیہ نے کسی قدر دھیمے

انداز میں پوچھا۔
”مس صوفیہ کے اس سوال پر کفن پوش تھوڑی دیر

تک خاموش رہا، پھر اس کی آواز ابھری۔
”بے شک تمہارے لئے یہ ایک مشکل مرحلہ
ہوگا مس صوفیہ لیکن میں تمہیں اتنا بتا دوں کہ خدا ہمدانی
کو زندگی عطا فرمائے جب اسے اس بات کا علم ہوگا کہ تم
نے میرے لئے ایک مشکل کام کیا ہے تو اسے بے پناہ
خوشی ہوگی، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمدانی سے تمہارا رشتہ
تعلق نہیں بلکہ ایک طرح سے تم اسے باپ کا درجہ دیتی
رہی ہو، کیا یہ سچ ہے؟“

”جی سر صوفیہ، ایسا ہی ہے، ہماری ایک
الگ کہانی ہے اور میں مسٹر ہمدانی کے لئے زندگی کی
بازی لگاتی ہوں۔“

”شکریہ اور تمہیں بعد میں یہ اندازہ ہوگا کہ تم
نے جو کچھ کیا ہے وہ ہمدانی کے لئے کس قدر مفید تھا۔“
”ہمیں کہاں جانا ہوگا سر؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔

”ایہین، ایہین کے شہر و سکایا جس کے بارے میں تمہیں تمام تفصیلات فراہم کر دی جائیں گی، تم یہ جانتی ہو کہ ایہین جنوب مغربی یورپ میں واقع ہے، بحر اوقیانوس میں دوسری مشہور جگہیں ہیں، تمہیں پہلے میڈرڈ اور اس کے بعد وہاں سے ورسکا یا جانا ہوگا، میں تم سے بلا تکلف یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا تم اس قدر مشکل برداشت کر سکتی ہو۔“

”جی میں کر سکتی ہوں۔“ صوفیہ نے جواب دیا۔
”اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں صوفیہ، تمہیں ورسکا یا پہنچنے کے بعد ایک چھوٹے سے قصبے ریگن تک جانا ہوگا اور ریگن میں تمہاری ملاقات ولسن ڈیزل سے ہوگی جواب وہاں زیتون کا بہت بڑا تاجر کہلاتا ہے، لیکن اس سے پہلے وہ ایک مشہور زمانہ ریسلر تھا جو امریکہ میں بڑی مقبول شخصیت کا مالک تھا، وہاں تمہیں میرا ایک پیغام اس کے حوالے کرنا ہوگا، صرف یہی ایک شخص ہے جو اسے مدانی کا نعم البدل اور تمہارا رہنما ثابت ہوگا۔“

”ایہین۔“ سسٹر صوفیہ نے پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
”ہاں، میری مشکل کا وہی حل ہے۔“ دوسری طرف سے کی قدر پریشان لہجے میں کیا گیا۔
”کیا انشاء میرے ساتھ جائے گی؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔

”ہاں، ویسے میں تمہیں بتاؤں کہ ولسن ڈیزل اے کے ہمدانی کا نعم البدل تاجب ہوگا اور وہ اس کی جگہ بے لے گا۔“

”لیکن سر ہم اسے ورسکا میں کیسے تلاش کریں گے اور اس کا ہم سے تعارف کس طرح ہوگا؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔

”اس کا میں مکمل انتظام کر دوں گا۔“ کفن پوش یعنی اپنے کہے ہوئے الفاظ کے مطابق دانش ہارون نے کہا اور میری قوت برداشت جواب دے گی، میں چیخ پڑی۔
”کچھ نہیں کرنا مجھے کہیں نہیں جاؤں گی میں، جھوٹ ہے یہ سب فراڈ ہے، میں کچھ تسلیم نہیں کرتی،

میری ماں کہاں ہے، تم کون ہو، کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم میرے باپ ہو؟ کوئی مصلحت تمہیں اب بھی مجھ سے چھپائے ہوئے، بتاؤ کیوں روپوش ہو گئے تم، کیوں مجھے ایک غیر ملک میں بے یار و مددگار چھوڑا، یہ تمہیں اندازہ تھا کہ میں کتنی دقتوں کے بعد یہاں پہنچی اور یہاں پہنچنے کے بعد مجھے کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، تمہاری مصلحت پوشی اب بھی جاری ہے، تم میرے باپ نہیں ہو، تم اس لئے اپنے آپ کو پردوں میں چھپائے ہوئے ہو کہ میں اپنے باپ کو پہچانتی ہوں، اس پردے کے پیچھے سے دانش ہارون کا چہرہ بھی برآمد نہیں ہوگا، جس کے بارے میں مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ وہ میرا باپ ہے یا نہیں؟“

میرے اندر ایک طوفان برپا ہو گیا تھا، یہ تمام الفاظ بیجان انگیز چیخوں اور سسکیوں کے انداز میں میرے منہ سے نکلے تھے، دیر تک میرے یہ الفاظ کمرے میں گونجتے رہے پھر ان کی بارگشت ہوئی تو سفید کفن میں ملبوس وجود آہستہ آہستہ کرسی سے اٹھ گیا، بلند والا قد و قامت، چوڑے چکلے بدن کا مالک، ڈھیلے ڈھالے کفن میں کچھ نمایاں نہیں تھا مگر بدن کی ہر جنبش محسوس کی جاسکتی تھی، اجانک ہی سفید کفن اس کے جسم سے علیحدہ ہو گیا، میری سگت آنکھیں وہ چہرہ دیکھنا چاہتی تھیں جو کفن کے پیچھے تھا، لیکن اندر سے کوئی چہرہ برآمد نہیں ہوا، سفید چمکدار کپڑے کی پٹیوں سے بنا ہوا ایک انسانی پتلا آنکھوں کے سامنے تھا، بالکل ان مصری میموں کی مانند جو میں نے تصویروں میں دیکھی تھیں، میرا سانس بند ہو گیا۔

پھر پٹیوں میں لپٹے ہوئے ہاتھ اٹھے اور ان ہاتھوں نے سر کے پاس کوئی شے، ٹوٹی، کپڑے کی پٹی کا سران ہاتھوں کو لگایا تو ان ہاتھوں نے وہ پٹیاں کھولنا شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد زمین پر پٹیوں کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں رہا، پٹیوں کے اندر سے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا، ان کا ڈھیر فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے حلق سے ایک دہشت بھری چیخ نکلی اور میں صوفیہ سے لپٹ گئی، خود صوفیہ کا بدن بھی بری طرح

فرار رہا تھا۔ کمرے کی فضا میں وحشت ناک سناٹا پھیلا ہوا تھا، صوفیہ بھی ہمت کھو بیٹھی تھی، اس نے مجھے سمجھ لیا تھا۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی، پھر اچانک پٹیوں کے ڈھیر میں تحریک نمودار ہوئی اور وہ مخصوص انداز میں رول ہونے لگیں نادیدہ ہاتھ دوبارہ انہیں انسانی پتلے کی شکل میں ترتیب دے رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھر پہلے ی جیسا پتلا تیار ہو گیا اور پھر وہ سفید کفن پہلے کی طرح اس پر منڈھ گیا۔ اس کے بعد وہ بی مانوس آواز ابھری۔

”ہاں انشاء میں خود اپنی ذہانت کا شکار ہو گیا ہوں جو کچھ وہاں سے بتانے کے لئے دنیا کی کسی زبان میں الفاظ نہیں ہیں، وقت ہی ان حقیقتوں کا انکشاف کرے گا اور اسی وقت نہیں آیا ہے، لیکن تم نے اپنی منزل کی جانب قدم اٹھائے ہیں، تم کچھ عرصے میں اپنا راز پا لوگی اور یہ لازمی امر ہے تم اس سے کتنا ہی گریز کرو کیا سمجھیں، میں بے شک تمہارا باپ ہوں، حالانکہ یہ لفظ کہتے ہوئے مجھے خود بھی شرمندگی ہوتی ہے، لیکن کیا کروں تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے اور صوفیہ تمہیں بھی، ہمدرد لڑکی! میری بیٹی سے تعاون کرنے والے کسی طور گھائے میں نہیں رہیں گے، میں ان کے احسانات کبھی نہیں بھولوں گا، انشاء میرے دل کے نکلے اپنے باپ کو خود سے منحرف نہ کھٹے، اس ناکارہ شکل میں تمہارے سامنے کیا آتا، یہ تو بہتر وقت ہے کہ تم نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا اگر بالکل بچی ہو تیں تو تمہارا کیا حال ہوتا، جاؤ تقدیر بدلے گی، ضرور بدلے گی اور وہ دن ضرور آ جائے گا، وہ دن وہ دن۔“ آواز آخر میں سسکیوں میں تبدیل ہو گئی، صوفیہ اور میں آپس میں بری طرح لپٹے ہوئے تھے، لیکن مجھ سے پہلے صوفیہ ہی نے خود کو سنبالا اور اس کی آواز بمشکل نکلی۔

”سر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“
”ولسن ڈیزل میرا گہرا دوست ہے، میں تمہیں اس کے نام تفصیلی خط لکھ کر دوں گا تم میری بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق ایہین جاؤ گی اور وہاں ورسکایا کے

نواحی علاقے میں اس جگہ جا کر ولسن ڈیزل سے ملنا اور وہ خط اسے دے دینا، اس کے بعد تم یوں سمجھو کہ تمہارے آگے کے تمام معاملات ولسن ڈیزل سنبھالے گا۔ اس پر نہ تو کوئی شک کرنا اور نہ اس کی باتوں سے خرف ہونا۔“

”سر آپ کو یقین ہے کہ ولسن ڈیزل ہماری پذیرائی کریں گے؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔
”ہاں بیٹی، مجھے یقین ہے۔“

”ان سے ہمیں کیا معلومات حاصل ہوں گی؟“
”براہ کرم یہ سوالات مجھ سے نہ کرو، جاؤ بس اب جاؤ ہمارا ایک جگہ اکٹھے ہونا خطرناک بھی ہو سکتا ہے، یہ ذمے داری ہمدانی پر تھی، لیکن لیکن خیر جاؤ بس اب چلی جاؤ، جاؤ بیٹی، خدا تمہارا نگہبان ہو، جاؤ براہ کرم جاؤ۔“

آواز میں ایک زور پیدا ہو گیا تو صوفیہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”آؤ نشاء آ جاؤ میں نیم بے ہوشی کی سی کیفیت کا شکار تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں، بالآخر ہم وہاں سے چل پڑے اور تھوڑی دیر کے بعد سفر طے کر کے اپنے گھر پہنچ گئے، میں اپنے بستر پر لیٹ کر ہلک ہلک کر رونے لگی تھی، میرے حلق سے ہچکیاں نکل رہی تھیں۔“

”کیا وہ واقعی میرے پاپا تھے سسٹر صوفیہ، کیا واقعی وہ میرے پاپا ہی تھے؟“

”حوصلہ کرو نشاء، تقدیر نے تمہیں ایک انوکھی آزمائش میں ڈالا ہے، اللہ پر بھروسہ رکھو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر کیا ہو گیا میرے پاپا کو، کیا ہو گیا انہیں، وہ تو شاندار رحمت اور تندرستی کے مالک تھے ان کا بدن کہاں گیا، وہ، وہ کچھ عجیب بھی لگ رہے تھے تم بتاؤ پٹیوں کے ڈھیر میں کیا تھا کون بول رہا تھا؟ آہ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا تھا میں پاگل ہو جاؤں گی۔“

”اس کائنات میں نجانے کیا کیا راز بکھرے ہوئے ہیں، ہم کچھ بھی نہیں جانتے نشاء، واقعی ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔“

”ارے بابا میرا دم نکل جائے گا، اٹھ جا
January 2013

صاحب نے مجھے بہت سزا مہارے بارے

Dar Digest 136

7 January 2013

Dar Digest[

دل بری طرح بے چین ہو گیا۔ سسر صوفیہ نظر آئیں تو میں نے کہا۔ ”سسر میری ایک بات سنیں میرے دل میں آئی ہے۔“

”کیا.....؟“

”سسر۔ اس دوسرے تابوت میں کون تھا۔“

”دوسرے تابوت میں۔“

”ہاں۔ وہاں دو تابوت تھے۔ ایک کا تالا کھل گیا تھا۔ دوسرا بند تھا۔ کیا اس میں بھی کوئی تھا۔“

”تمہارے خیال میں کون؟“

”شاید میری ماں۔“

”کاش۔ میں بتا سکتی۔“ صوفیہ نے کہا اور میں خاموش ہو گئی۔ واقعی وہ بے چاری کیا بتا سکتی تھیں۔ اس

رات بھی ہمیشہ کی طرح جاگتی رہی۔ پھر نہ جانے رات کے کون سے پہر آنکھ لگ گئی۔ جانے کتنی دیر سوئی تھی کہ

کسی نے زور زور سے جھنجھوڑا، ہڑ ہڑا کر انہی تو آیا نہ میرا کچھ نہ نظر آیا۔ انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

میں نے گردن گھما کر صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

”کک..... کیا ہے۔“

”اٹھو..... آیا نہ میرے سرگوشتی کی۔“

میں اٹھ گئی۔ تو آیا نہ میرے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا اور میں ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔ پھر میں نے کہا۔ ”اب بتاؤ۔ کیا بات ہے۔“

”نشاء بی بی۔ ہم اب یہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔“

”یہ بات بتانے کے لئے آپ نے مجھے آدھی رات کو جگا دیا ہے۔“

”ہم اب آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ میں نے ہارون صاحب سے کہہ دیا ہے۔“

”کس سے۔“ میں نے چونک کر کہا۔

”آئیے آپ ان سے مل لیں۔ دانش ہارون صاحب آئے ہیں۔“

میری جو کیفیت ہونی تھی اس کا اندازہ

کیا جاسکتا ہے۔ ”پاپا آئے ہیں۔ پاپا آئے ہیں۔“ بہت سے خیالات ایک دم دل میں آئے تھے۔ وہ بعید جسم کا وجود کیا فریب تھا کیا اس کا میرے باپ ہونے کا دعویٰ غلط تھا لیکن وہ آواز..... وہ حمایت۔ وہ سب کچھ تو پاپا جیسا تھا۔

لڑکھڑاتے قدموں سے پاپا کی لائبریری میں داخل ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سگاری مخصوص بو سگھائی دی اور میرا دل اچھل کر طوق میں آ گیا۔

لائبریری کے اس مخصوص جگہ میں جہاں کا ماحول بخ تاریک ہوتا تھا پاپا کی کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ سگڑا سرخ سراروشن تھا اور دھوئیں کی یکسر بلند ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے ندیمہ بگم۔ آپ جائیے۔“ پاپا کی مخصوص آواز ابھری۔

”میں کچھ کہنا چاہتی ہوں سر.....“ ندیمہ نے ہچکچاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں۔ کیا بات ہے؟“

”نشاء بی بی نے ہم پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔“

ان کا رویہ بے حد خراب ہو گیا ہے ہمارے ساتھ باہر کے لوگ ہم سے پولیس والوں کی طرح سوالات کرتے ہیں ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“

”انتظار۔“

”جی سر۔ ہم اب یہاں نہیں رہ سکیں گے۔“

”ہم سے تمہاری کیا مراد ہے۔“

”میں اور فیض پاپا۔“

”ہوں..... کیا تمہیں یہ سوچنا زیب دیتا ہے ندیمہ۔ تم نے مشکل حالات میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اور اب جب مشکل ترین حالات ہیں تم مجھے چھوڑنا چاہتی ہو۔“

”معافی چاہتے ہیں صاحب۔ انسان تو ہم بھی ہیں۔ ندیمہ رونے لگی۔“

”آپ اس گھر کے ستون ہیں۔ اور ستونوں کے بغیر گھر قائم نہیں رہتے۔ میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں بے فکر ہیں میں نشاء کو سمجھا دوں گا۔“

”آیا ندیمہ روتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ میں سر دنگ ہوں سے پاپا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بھی پراسرار سی کیفیت میں تھے۔ کچھ کھوں کے بعد انہوں نے کہا۔“

”حالات پہلے بھی بہتر نہیں تھے نشاء۔ کچھ پراسرار کہانیاں میری ذات سے پہلے بھی منسلک تھیں لیکن جنس میں جو کچھ ہوا وہ میری توقع کے برعکس تھا۔ وہاں کے پراسرار حالات تم جانتی ہو۔ صورت حال اتنی عجیب تھی کہ مجھے تم سے الگ ہونا پڑا۔“

”ایک بات کہوں پاپا۔“

”ہاں۔ یولو.....“

”آپ واقعی میرے ابو ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”بہت سے مطلب ہیں پاپا۔ مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ میری ماں ایک نامعلوم شخصیت ہے اور آپ..... پاپا۔ اگر میں آپ کی بیٹی ہوں تو آپ مجھے بے یار و مددگار تیونس میں نہ چھوڑ دیتے کچھ بھی ہو سکتا تھا میرے ساتھ۔ پاپا مجھے

اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ میں کون ہوں کیا ہوں اور اس کے بعد؟“

”تمہیں کچھ نہیں ہوتا نشاء۔ میں آج تک ایک لمحہ تم سے غافل نہیں رہا تیونس سے یہاں آنے کے بعد بھی اور تیونس میں بھی، میں نے لمحہ تم پر نگاہ رکھی ہے اگر تمہیں کوئی خطرہ ہوتا تو میں ہر احتیاط بالائے طاق رکھ دیتا۔“

”میں نہیں مانتی پاپا۔ میں نہیں مانتی۔“

”خند نہ کرو نشاء۔ میں تم سے بڑی توقع رکھتا ہوں۔ تم میری اس بہت بڑی مشکل میں میرا ساتھ دینا ہارا تعاون ہی ہمیں زندگی دے گا۔“

”پاپا میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔ میں استین نہیں جاؤں گی۔ میرے ان الفاظ پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر پاپا کی آواز ابھری۔

”میں تم سے تعاون کی توقع رکھتا تھا۔ یہ صرف میری زندگی کا نہیں تمہاری زندگی کا بھی سوال ہے۔ تاہم میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”آپ مجھے میرے سوالوں کے جواب دیں پاپا۔“

”ہاں یولو۔“

”تیونس میں آپ نے مجھے کس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔“

”میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا نشاء۔ میں لمحہ لمحہ تمہارے ساتھ تھا۔“

”کہاں تھے آپ۔ اور پھر یہاں آنے کے بعد بھی آپ نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں قائم کیا۔ بس دوسرے لوگ مجھے آپ کا پتہ دیتے رہے۔“

”ٹھیک ہے نشاء۔ تم اگر میرا ساتھ نہیں دینا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔“

”کتنے سوال ہیں میرے ذہن میں پاپا۔ کارچوک کے غاروں میں میری ہمشکل لاش۔ اور پھر

اور پھر نہ جانے کیا کیا۔ مجھ سے پوچھیں پاپا۔ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔“

”کاش۔ میں تمہیں اپنی مجبوری سمجھا سکتا۔“

”یہ سب کیا ہوا ہے پاپا۔ یہ کیسی مجبوری ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔“

”یہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔“

”آخر کیوں۔“

”تم نے میرے جسم کی حالت دیکھی تھی۔“

”ہاں پاپا..... وہ آپ ہی تھے نا۔“

”ہاں۔“

”مگر کیوں آپ کو کیا ہوا ہے۔“

”ایک تاریخی سزا ہے یہ۔“

”تاریخی سزا۔“

”ہاں.....“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا پاپا۔“

”یہ بھی ایک بہت بڑی مجبوری ہے، لیکن میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی کرو، ہاں اگر یہ التجا بھی تمہیں قبول نہ ہو تو ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“

فہرست کتب شمع بک ایجنسی کراچی

معلوماتی کتب	ادارہ	دہشت ناک کہانیاں	ادارہ
معلومات ہی معلومات	ادارہ	حیرت انگیز کہانیاں	ادارہ
شمع معلومات	ادارہ	خوفناک کہانیاں	ادارہ
اسلامی معلومات	ادارہ	ڈراؤنی کہانیاں	ادارہ
معلومات قرآن مجید	ادارہ	آسیبی کہانیاں	ادارہ
معلومات پاکستان	ادارہ	بھیا نک کہانیاں	ادارہ
معلومات سائنس	ادارہ	خوفزدہ کہانیاں	ادارہ
معلومات علامہ اقبال	ایم الیاس	ناگ دیوتا (مکمل ناول)	نوازش شاہین
معلومات کھیل	ایم الیاس	پشپاز دیوی (مکمل ناول)	ایم الیاس
معلومات جغرافیہ	ایم الیاس	پچندا (مکمل ناول)	ایم الیاس
معلومات تاریخ	ایم الیاس	قیدی روحیں (مکمل ناول)	ایم الیاس
جدید معلومات	ایم الیاس	غیبی آواز (مکمل ناول)	ایم الیاس
معلومات تاریخ اسلام	ایم الیاس	روح بیتی (مکمل ناول)	ایم الیاس
معلومات ممالک	ایم الیاس	یوتاف (مکمل ناول)	ایم الیاس
معلومات پاکستان	ایم الیاس	مداری (مکمل ناول)	ایم الیاس
عالمی معلومات	ایم الیاس	طلسم زاد (مکمل ناول)	ایم الیاس
اسلامی معلومات	ایم الیاس	بنت فرعون (مکمل ناول)	ایم الیاس
دنیا کی حیرت	ایم الیاس	ہمزاد کا عشق (مکمل ناول)	ایم الیاس
حیرت انگیز معلومات	ایم الیاس	بھنور (مکمل ناول)	ایم الیاس
دک بڑے لوگ	ایم الیاس	جادوگر (مکمل ناول)	ایم الیاس
دلچسپ و عجیب واقعات	ایم الیاس	اوتار (مکمل ناول)	ایم الیاس
حیرت انگیز واقعات	ایم الیاس	لبے ہاتھ (مکمل ناول)	ایم الیاس
ڈراما سٹ سے انتخاب	ایم الیاس	بھگتی روح (مکمل ناول)	ایم الیاس
پراسرار کہانیاں	ایم الیاس	لاش کا ہنگامہ (مکمل ناول)	ایم الیاس
	ایم الیاس	مدروحیں (مکمل ناول)	ایم الیاس
	ایم الیاس	کفن چور (مکمل ناول)	ایم الیاس

”ٹھیک ہے نشاء میں جا رہا ہوں کیونکہ زیادہ دیر یہاں رکنا خطرناک ہو جائے گا۔“

”خدا حافظ۔“ میں نے کہا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر چار قدم آگے بڑھے اور بولے ”خدا حافظ نشاء خدا حافظ۔“ اس کے بعد وہ باہر نکل گئے۔

میں حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی، کتنے شاندار لگ رہے تھے اپنی چال و حال سے مگر مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ اس لباس کے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ وہ صرف ایک دھوکہ ایک خیال ہیں، ایک احساس اور کچھ نہیں، لیکن کیوں، میں نے تو اپنے پاپا کے ساتھ طویل وقت گزارا تھا، تیونس جانے سے پہلے وہ ایک ہنستے بولتے ہشاش بشاش آدمی تھے، لیکن یہ کیا ہو گیا، کیا ہوا ہے انہیں۔

دوسرا دن بڑا سناں تھا، سخت بیزار ہوئی تھی، دیے بھی دن کو گیارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی تھی اور شدید حیرانی کا احساس ہوا تھا، صوفیہ کی غیر موجودگی نے چونکا دیا، اس احساس سے دل دھل گیا کہ وہ چلی تو نہیں گئیں، میں خوف زدہ ہو کر باہر نکل آئی اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے چلی، وہ صوفیہ ہی تھیں۔

”اتنی دیر تک سوئی رہی ہوں، بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔“

”ارے سسر آپ نے ناشتہ نہیں کیا؟“

”ناشتے کا نام لے کر میری بھوک کو نہ بھڑکاؤ، پلیر! جلدی کرو ناشتہ لگواؤ۔“ سسر صوفیہ نے خوشگوار لہجے میں کہا اور میں نے ان کی ہدایت کے مطابق عمل کیا، واقعی انہیں شدید بھوک لگ رہی تھی، بڑی بے صبری سے ناشتہ کر رہی تھیں، مجھے ہنسی آگئی، لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، ناشتے سے فارغ ہو کر انہوں نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی اور پھر ہونٹ خشک کر کے بولیں۔

”رات کو دانش صاحب آئے تھے؟“

”ارے، آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔“ صوفیہ نے کہا

”گویا آپ مجھے یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ کس مشکل میں گرفتار ہیں اور جس بے جسم کی آپ نے بات کی ہے اس کی وجہ کیا ہے، ایسا کیوں ہوا ہے پاپا؟“

”میں نے کہا ناشتہ ابھی تفصیل سے کچھ بتانا میرے لئے ممکن نہیں ہے، بس اتنا کچھ کہہ دوں کہ تاریخ بھی نہیں بدلتی، جو تاریخ میں ہو چکا ہوتا ہے تو پھر کی لکیر ہوتا ہے اور لکیریں آسانی سے نہیں مٹ سکتیں۔“

”تو آپ میرے لئے کیا کہتے ہیں پاپا؟“

”بتا چکا ہوں کہ ایمین کا سفر بہت ضروری ہے۔“

”مگر میں وہاں کیسے جاؤں گی میں نے تو تنہا کبھی ایسا سفر نہیں کیا۔“

”صوفیہ جو تمہارے ساتھ ہے۔“

”مگر وہ تو مجھ سے بھی زیادہ ناواقف ہے پاپا۔“

”اس کے باوجود وہ تمہارا ساتھ دے گی۔“

”لیکن انہوں نے انکار کر دیا ہے۔“

”ہرگز نہیں، میں اس سے بات کروں گا۔“

دانش ہارون صاحب کی آواز سنائی دی اور میری آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔

”اور مجھے کوئی تسلی نہیں دیں گے پاپا، میری تنہائی سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے آنسو بھرے لہجے میں کہا۔

”صرف اتنا کہوں گا بیٹا کہ عام باپ اپنی اولاد کو سینے سے لپٹا کر عملی طور پر اپنی شفقت کو پرسکون کر لیتے ہیں، لیکن میں اپنے وجود میں سالہا سال یہ پیار سمیٹے ہوئے بے بسی کی منزلوں سے گزر رہا ہوں۔ مجھ سے زیادہ بے بس اس کائنات میں کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے پاپا میں وہی کروں گی جو آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔“ میں نے آخر کار ہتھیار ڈال دیئے، تب پاپا نے کئی ہاتھ نے ایک لفافہ مجھے دیا اور کہنے لگے۔

”اس لفافے میں ڈیزل کے لئے ہدایات ہیں، بس تمہیں یہ لفافہ اسے دینا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے لفافہ پاپا سے لیا تو وہ بولے۔

اور میں چونک پڑی۔ وہ دوبارہ بولی ”اور ہمیں اپنیں جانا ہے، مجھے ایک بات بتاؤ نشاء تمہارا پاسپورٹ تیار ہے کیا؟“

”پاسپورٹ تو ہے، ظاہر ہے میں اسی پاسپورٹ پر تپوس لگئی تھی، لیکن اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ اس کی کیا کیفیت ہے تاہم اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ ابھی ایکسپائر نہیں ہوا۔“

”گلد ویری گلد، ہمیں اپنیں جانے کی تیاریاں کرنی ہے۔“

”ایک بات پوچھوں سسر؟“

”ہاں..... پوچھو۔“

”آپ کیسے تیار ہو گئیں، پہلے تو آپ نے انکار کر دیا تھا؟“

”اول تو مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے اور میں خود بھی اب تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی، دوسری بات یہ کہ دانش صاحب نے استاد محترم کا حوالہ دیا اور کہا کہ اگر ہمدانی صاحب بہتر حالت میں ہوتے تو اس سے بھی زیادہ اذیت برداشت کر کے ہر حالت میں ہمارا ساتھ دیتے، میں صرف ان کا نعم البدل بن جاؤں خدا ان کو زندگی دے، جب انہیں اس بات کا علم ہوگا تو انہیں فخر ہوگا اور میں اور میں۔“

”ہاں پولیس بولیں۔“ میں نے کہا۔

”جس شخص نے مجھے کچھ سے اٹھا کر تحمل میں رکھ دیا اس کا کوئی بھی مشن میری زندگی کا مقصد ہے اور میں اس سے گریز نہیں کر سکتی، میری ہر سانس ہمدانی صاحب کی مقروض ہے نشاء، تم میرے جذبات کو نہیں سمجھ سکو گی۔“

”گویا آپ تیار ہیں میرے ساتھ جانے کے لئے؟“

”ہاں..... میں نے کسی کو بلایا ہے وہ تمام فارم وغیرہ لے کر آئے گا، تمہاری تصویریں لے کر جائے گا اور ہم آگے کے کام کر لیں گے، میں نے یہ کام ان لوگوں کو سنبھال دیا ہے۔“

میں خاموش ہو گئی، اس کے بعد درمیان کے چند روز میں نے خاموش تماشائی کی حیثیت سے گزارے، بس سسر صوفیہ ہی مصروف تھیں۔ مجھے البتہ اس کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہیں، بہت سے لوگ ان کی مانتی میں کام کرتے تھے۔ ان لوگوں نے سارے کام مکمل کر لئے، آخر کار وہ وقت آ گیا جب ہمیں اپنیں روانہ ہونا تھا۔ ایک دن احتیاط سے ہم انٹر پورٹ پہنچے اور ایک فلائٹ ہمیں لے کر اپنیں چل پڑی۔

اس وقت ساری دنیا اجنبی سی لگ رہی تھی، میں زندگی کے ان تمام ہنگاموں سے ناواقف تھی۔ میں نے آج تک جو کچھ کیا تھا وہ پاپا کے ساتھ ہی کیا تھا، ایک سہا سہا احساس میرے دل میں جا گزیر تھا، لیکن سسر صوفیہ اس وقت ایک عجیب و غریب شخصیت بن کر میرے سامنے آئی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں تنہا نہیں ہوں انہوں نے مجھے بتایا۔

”اپنیں کے بارے میں تمام ضروری معلومات میں نے حاصل کر لی ہیں۔“ میں نے اپنا دل بہلانے کے لئے پوچھا۔ ”مجھے بھی ذرا تھوڑی سی تفصیل بتائے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ اپنیں جنوب مغربی یورپ میں واقع ہے، اس کے مغرب میں بحر اوقیانوس، شمال میں خلیج بسکے، جنوب اور مشرق میں بحر روم ہیں، فرانس اس کے شمال میں ہے اور پرتگال مغرب میں اس کے علاوہ بیلجا اور کینیڈا جزائر اور دوسرے کئی جزائر اس میں شامل ہیں۔“

”کیپٹل میڈرڈ ہے؟“

”ہاں..... میڈرڈ، بارسلونا، سویلے، زراغوزہ اور روکایا وغیرہ، جس شخص کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے وہ زیتون کا تاجر ہے، ویسے اور بھی بہت ساری صنعتی پیداوار وہاں ہیں، میں نے تمام تفصیلات معلوم کر لی ہیں، خوبصورت جگہ ہے، بہت سی قدیم روایات کی حامل۔“

”واقعی، آپ نے کافی کام کیا ہے سسر صوفیہ۔“

میں نے تقریبی لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیں۔

”جانی تم نے میرے دل میں ایک عجیب سی جگہ بنائی ہے، میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ ہمدانی صاحب نے مجھے تمہاری نگرانی کے لئے حکم دیا تھا، اب وہ حکم بھی میرے سر آنگھوں پر ہے، لیکن تمہاری اپنی شخصیت نے بھی مجھ پر اثر کیا ہے اور یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے اسی کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔“

”شکریہ۔“

”میں نے اپنیں کے نقشے بھی حاصل کر لئے ہیں، ہمیں میڈرڈ میں اترنا ہوگا اور پھر وہاں سے روکایا میں قیام کرنے کے لئے سفر کرنا ہوگا، روکایا میں ویسے تو بہت ساری قیام گاہیں ہیں، لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ ہونل جیکارڈا اس سلسلے میں بہترین ہے اور نیا بھر کے سیاح وہاں قیام کرنا پسند کرتے ہیں۔“

”اوہ کیا آپ نے وہاں سے رابطہ بھی قائم کر لیا؟“

”نہیں نہیں بالکل نہیں، میں نے کہا تا میں نے معلومات حاصل کی ہیں اور خود دانش ہارون صاحب نے جو خط تمہیں دیا ہے اس میں بھی کچھ ہدایات ہیں میرے لئے میں نے ان سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔“

”آپ نے وہ خط پڑھ لیا جو میں نے آپ کو دیا تھا اور پاپا نے مجھے۔“

”ہاں پڑھ لیا ہے مجھے اس کی اجازت دی گئی تھی۔“

”فون پر؟“

”ہاں۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور فضائی سفر کے مسافروں کا جائزہ لینے لگی، طرح طرح کے لوگ تھے، دفعۃً میں نے سوال کیا۔

”ایک بات بتائیے سسر صوفیہ، آپ دنیا کے کون کونسے ملکوں میں جا چکی ہیں؟“

جواب میں صوفیہ ہنس پڑیں پھر بولیں۔ ”کہاں کہاں کر رہی ہوڈرائنگ، میں نے خوابوں میں بھی اپنے وطن سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی۔“

”میرے خدا اس کے باوجود آپ اس قدر پراعتماد ہیں۔“

جواب میں سسر صوفیہ مسکرا کر خاموش ہو گئیں پھر میں نے کہا۔

”اچھا ایک بات بتائیے ہم وہاں ولسن ڈیزل کو تلاش کیسے کریں گے؟“

”فون کروں گی میں انہیں اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے۔“

”اوہ کیا فون نمبر بھی خط میں موجود ہے؟“

”خط میں نہیں تھا، لیکن ہارون دانش صاحب مجھے فون پر بتاتے ہیں۔“

بہت سے سوالات کر چکی تھی میں صوفیہ سے چنانچہ جہاز کی پشت سے سرگرا کر انھیں بند کر لیں۔ البتہ سسر صوفیہ کی پراعتماد شخصیت نے مجھ پر عجیب سا اثر ڈالا تھا۔ انسان کو اسی قدر پراعتماد ہونا چاہئے، یوں لگ رہا تھا جیسے سسر صوفیہ پہلی بار ملک سے باہر نہ جا رہی ہوں، بلکہ وہ عام طور سے دنیا کا سفر کرتی رہتی ہوں اور انہیں اندازہ ہو کہ باہر کی دنیا میں کیسے رہا جاسکتا ہے۔ تمام معاملات خواب کی مانند گزر رہے تھے، میں ان تمام جگہوں کے بارے میں سوچ رہی تھی مجھے اب پہنچنا تھا اور اس کے بعد وہاں سے زندگی کا دوسرا سفر شروع ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں پاپا وہاں مجھے بھیج کر کیا کرنا چاہتے تھے۔

آخر کار ہم میڈرڈ پہنچ گئے، یہاں بھی سسر صوفیہ کی پراعتماد شخصیت نے مجھ پر بڑا اثر ڈالا تھا، ایک ٹیکسی نے ہمیں ہوئے جیکارڈا پہنچا دیا اور جیکارڈا کی اٹھاسیسویں منزل کی بڑی کھڑکی سے میں نے روکایا کا شہر دیکھا، میڈرڈ میں ہم نے قیام نہیں کیا تھا بلکہ وہاں اترتے ہی ہم نے روکایا کے سفر کی تیاری کر لی تھی۔ ابتدائی معمولات سے فارغ ہونے کے بعد سسر صوفیہ لباس وغیرہ تبدیل کر کے میرے سامنے آئیں تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ خاصی پرکشش خاتون تھیں، کہنے لگیں۔

”اور تم نے تو پہلی بار ملک سے باہر قدم رکھا

”ہاں..... تھوڑا سا انتظار کر لیتے ہیں۔“

”نہیں، میں پاپا کے ساتھ کئی ملکوں میں گئی ہوں، آخری بار میں تیس گئی تھی۔“

”ارے ہاں..... تم نے مجھے بتایا تھا۔“

”ایک بات بتائیے سسٹر صوفیہ.....؟“

”ہاں بولو۔“

”کیا وسکن ڈیزل ہمیں پہچان لیں گے؟“

”اول تو دانش ہارون صاحب کا خط ہمارے پاس موجود ہے اور پھر لازمی امر ہے کہ جب انہوں نے ہمیں وہاں بھیجا ہے تو ان سے رابطہ بھی کیا ہوگا۔“

”پاپا سے آپ کی بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔“

”میں نے سوال کیا۔“

”ہاں، میرے تیار ہونے کے بعد انہوں نے مجھے کچھ ضروری باتیں بتائی تھیں۔“

”اچھا یہ بتائیے، اب کیا کریں گی، کب انہیں فون کریں گی؟“

”بالکل پرسکون ہو جاؤ ڈارلنگ ایک نئی دنیا کا لطف لو، دیکھو اس ہوٹل کی اٹھائی سو سیوس منزل سے اس کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے دنیا کتنی عجیب لگتی ہے۔ یہ سب کچھ جو نیچے ہو رہا ہے اس کا نام زندگی ہے، جتنے لوگ پیدل، گاڑیوں میں اور مختلف ذرائع سے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں ان سب کی زندگی سے ایک کہانی منسلک ہوگی، لازمی طور پر ایک کہانی منسلک ہوگی اور یہ ان کی زندگی کی کہانی ہوگی، کیا سمجھیں، ہاں ایک بات میں تم سے کہوں، اگر چاہو تو ابھی مسٹر ڈیزل سے رابطہ قائم نہ کرو، بلکہ وسکایا کی زندگی دیکھو۔“

”بس پتہ نہیں میں کیوں خوف زدہ ہوں سسٹر صوفیہ؟“

”غیر فطری بات نہیں ہے جانی، اس کی وجہ میں جانتی ہوں، لیکن کوئی حرج نہیں ہے اس بات کے امکانات ہیں کہ وسکن ڈیزل خود اس کا انتظام کریں۔ کیا سمجھیں؟“

”یہاں سے ہمیں لے جانے کا۔“

”ہاں..... تھوڑا سا انتظار کر لیتے ہیں۔“

”جی کون؟“

”مسٹر وسکن ڈیزل سے بات ہو سکے گی؟“

”اس وقت موجود نہیں ہیں، آپ مٹیج دے دیجئے۔“

”کب تک مل سکیں گے؟“

”ایک گھنٹہ کے بعد سے لے کر رات ایک بجے تک۔“

”پلیز! آپ انہیں مٹیج دے دیں کہ دانش ہارون کے نمائندے پہنچ گئے ہیں اور ان سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”آپ کہاں ہیں میڈم؟“

”ہوٹل جی کا رڈ۔“

”صوفیہ نے اپنے کمرے کا نمبر بتایا اور شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ ٹھیک ایک گھنٹہ کے بعد ہمارے کمرے کی بیل بجی تو صوفیہ نے لا پرواہی کے انداز میں کہا۔“

”کون ہے؟“

”ہم یہی سمجھتے تھے کہ ویر ہے لیکن آنے والی شخصیت ویر کی نہیں تھی۔ غیر معمولی طور پر ایک قد آور شخص تھا جس کے لمبے لمبے بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ اور پورا بدن اسٹیل سے بنا معلوم ہو رہا تھا، مجھے یاد آ گیا کہ وسکن ڈیزل ایک امریکی ریسلر تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ایمین میں آباد ہو گیا ہو کیونکہ اس کے نقوش اپنیش نہیں تھے۔ ایک انتہائی قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت ہی شاندار شخصیت کا مالک نظر آتا تھا۔ چہرے پر مخصوص اسٹائل کی ہلکی سی ڈاڑھی بھی تھی۔ اس نے پراخلاق لہجے میں کہا۔“

”میرا نام وسکن ڈیزل ہے اور یقیناً میں غلط کمرے میں نہیں آیا؟“

”ہاں، آپ بالکل صحیح کمرے میں تشریف لائے ہیں، براہ کرم اندر آئیے۔“

”صوفیہ نے پراعتماد لہجے میں کہا۔“

”تم میں سے دانش ہارون کی بیٹی کون ہے؟“

”یہ سوال بے بی، میں تمہیں اپنا نام تو بتا ہی چکا ہوں اور مجھے علم ہے کہ تم بھی مجھے اچھی طرح جانتی ہو، بھلا کس کی مجال تھی کہ میرے علاوہ یہاں آ سکتا، لیکن اس کے باوجود یہ تمہارے پاپا کا ٹیلی گرام ہے اسے دیکھو۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر ڈیزل، آپ کی شخصیت آپ کی سچائی کا ثبوت ہے۔“

”پلیز! اسے دیکھو۔“

”وسکن ڈیزل نے کسی قدر کراخت لہجے میں کہا اور میں نے ٹیلی گرام لے لیا، لکھا تھا۔“

”ڈیزل، میری بیٹی نشاء تمہارے پاس آرہی ہے، تفصیلات وہی بتائے گی، مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ دانش ہارون۔“

”میں نے ٹیلی گرام اس کی طرف واپس بڑھا دیا۔“

”بیٹھ سکتا ہوں۔“

”براہ کرم تشریف رکھئے۔“

”میں نے کہا اور وہ ایک صوفیہ پر دراز ہو گیا۔ ہم دونوں بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔“

”میں ویسے تو قصبہ رنگین میں رہتا ہوں، لیکن پچھلے دنوں میں نے وسکایا میں اپنا ایک بار بتایا ہے اور اپنی رہائش گاہ بھی اسی بار کے اوپری حصے میں رکھی ہے۔ اپنے دوست کی بیٹی کو میں اپنے ساتھ ہی رکھتا، لیکن بارا بچی جگہ نہیں ہوتی، وہاں سے بہت برے لوگ بھی آ جاتے ہیں اس لئے تمہیں یہاں جی کارڈ وہی میں قیام کرنا پڑے گا، لیکن بے نی معاف کرنا اس کے اعتراضات میرے ذمے ہوں گے، ارے ہاں تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا ڈیر۔“

”وسکن ڈیزل نے

”میں نے کہا، لیکن صوفیہ سے پہلے میں ہی بولی پڑی۔“

”میرے ساتھی میری دوست، پاپا نے انہیں میرے ساتھ ہی بھیجا ہے۔“

”موسٹ ویلکم کیا تم نے وسکایا کا شہر دیکھا یا ابھی یہاں پہنچے ہو۔“

”نہیں ہمیں آئے ہوئے وقت گزر گیا اور ہم ٹیکسی کے ذریعے وسکایا کے بہت سے حصے دیکھ چکے ہیں۔“

”صوفیہ نے کہا۔“

”ویری گڈ..... ویری گڈ، پسند آیا ہمارا شہر۔“

”ہاں بہت اچھا ہے۔“

”اچھا کیا نام بتایا تم نے، نشاء، نشاء تمہارے پاس میرے لئے دانش ہارون کا کوئی پیغام ہے؟“

”جی یہ ایک لفافہ انہوں نے دیا ہے، سسٹر لفافہ دیجئے۔“

”میں نے کہا اور صوفیہ نے وہ لفافہ نکال کر وسکن ڈیزل کو دے دیا، ڈیزل نے اس میں رکھے ہوئے ایک اور لفافہ کو نکال لیا، اس پر پلاسٹک جڑھی ہوئی تھی، ساتھ میں ایک بڑا پرچہ رکھا ہوا تھا۔ ڈیزل نے اس لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر پرچے کو کھول لیا، پھر کئی منٹ تک وہ اس پرچے کی تحریر کو پڑھتا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تغیرات صاف نوٹ کئے جاسکتے تھے، پرچے کو اس نے کئی بار پڑھا اور اس کے بعد اسے بند کر کے لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔“

”اس کے بارے میں تمہیں نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ میرے اور میرے دوست کا معاملہ ہے اور میں اسے اپنے پاس رکھوں گا، تمہیں اعتراض تو نہیں ہے؟“

”نہیں سر۔“

”میں نے کہا تو وہ انگلی اٹھا کر بولا۔“

”سر..... نہیں..... انکل ڈیزل۔“

”جی.....“

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیج دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکایا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، فی الحال خوب کھومو پھرو و جی

ضرورت ہو مجھے بتا سکتی ہو۔“ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور روم سروں کے ٹیلی فون کے پاس پہنچا، پھر اس نے روم سروں کو فون کر کے اسٹیشن زبان میں کچھ ہدایات دیں اور واپس آ کر ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔

”تمہارے ساتھ کافی کا ایک پیالہ پی کر میں چلا جاؤں گا، اس وقت تک میری جھومت کرنا جب تک میں تمہیں خود کال نہ کروں۔“

”جی سر۔“

”نہیں نہیں، میں پھر کہہ رہا ہوں کہ سر نہیں اٹکل، اچھا چلو چھوڑو، اگر تم مجھے اٹکل کہنے میں دقت محسوس کرتی ہو تو نہ کہو۔“

تھوڑی دیر کے بعد کافی آ گئی، غضب کی کافی تھی، میں نے دوسری پیالی بھی پی لی اور اس کے بعد ڈیزل ہم سے رخصت ہو گیا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکل گیا تو صوفیہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”میں اس شخص سے بہت متاثر ہوئی ہوں، کیا ہی شاندار پرسنالٹی ہے، زبردست۔“

میں نے مسکرا کر سسٹر صوفیہ کو دیکھا اور صوفیہ میری اس مسکراہٹ سے میرے اندر کی کیفیت کو سمجھ گئی اور بولی۔

”نہیں، اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں اس کی مردانہ وجاہت سے متاثر ہوئی ہوں اور میرے ذہن میں کوئی خاص تصور پیدا ہوا ہے تو پلیز! تم میری بہت اچھی دوست ہو، کبھی تم سے کوئی بات چھپاؤں گی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اوہ!..... سوری۔“ میں نے کہا اور صوفیہ نے آگے بڑھ کر میرا رخسار چوم لیا۔ میں نے جواب میں اس کی آنکھوں کو چومتے ہوئے کہا۔

”ایک بات میں آپ سے کہوں سسٹر صوفیہ، آپ کی شکل میں مجھے جو رشتہ ملا ہے اس نے میرے اندر ایک نئی زندگی پھونک دی ہے۔ آپ یقین کریں کہ میں رشتوں کو ترسی ہوئی ہوں، ہر طرف لپک کر آگے بڑھتی تھی لیکن پتہ چلتا تھا کہ اس کے اندر کوئی اور چیز چل رہی ہے،

میرے لئے محبت نہیں، بس کیا کہوں آپ سے۔“

پھر ہوریش آ گیا، اپنے ساتھ وہ ایک خوبصورت گاڑی لایا تھا اور اس کے بعد ہم نے دسکایا کی سیر کرنا شروع کر دی۔ وکسن ڈیزل نے انراہ انکساری دسکایا کو ایک عام سا شہر کہا تھا جبکہ یہ تو انتہائی حسین شہر تھا، دن اس طرح گزرا کہ پتہ بھی نہیں چل سکا۔ رات کا کھانا ہم نے اپنے ہوٹل واپس آ کر کھا لیا تھا اور ہوریش کو جانے کی اجازت دے دی تھی، اس طرح سیر و سیاحت میں پانچ دن گزر گئے، ہوریش روز بچھ جاتا تھا، چاروں تک ہم نے دسکایا گھوما اور تقریباً پورا شہر ہی دیکھ لیا۔ اس دوران مسٹر ڈیزل نے ہمیں فون بھی نہیں کیا تھا، یا نجی دن جب ہوریش آیا تو ہم نے اس سے معذرت کر لی۔

”آج ہم کہیں نہیں جائیں گے آرام کریں گے۔“

”ٹھیک ہے میڈم۔“ ہوریش کار لے کر واپس چلا گیا، وہ دن ہم نے ہوٹل میں ہی گزارا تھا، چھپے اور ساتویں دن بھی ڈیزل سے کوئی رابطہ نہیں ہوا، اس کے بارے میں ہم نے بہت سی باتیں کی تھیں، آنکھیں شام وہ ہمارے پاس آ گیا۔

”آج ہم ڈنر ساتھ کریں گے اور مجھے اندازہ ہے بے بی کہ اب دسکایا میں تمہارا دل نہیں لگ رہا ہوگا۔“

”آپ اپنے بارے میں بتائیے اٹکل، آپ ٹھیک ہیں؟“ میں نے پوچھا اور وہ ہنس پڑا۔

”ہاں..... لیکن زیادہ ٹھیک اس وقت ہو جاؤں گا، جب تم میرے لئے کافی منگواؤ گی۔ کیا سمجھیں۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا اور مجھ سے پہلے سسٹر صوفیہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور روم سروں کو فون کر کے مقامی عہدہ کافی منگوانے لگیں جو واقعی اپنا جواب آپ تھی اور ہم کو فون نے اتنی پی ڈالی تھی کہ اب ہمیں خطرہ ہو گیا تھا کہ ہمارا دوران خون نہ بڑھ جائے، کافی آ گئی اور ڈیزل نے کافی کے سپ لیتے ہوئے کہا۔

”اب تمہیں وہ تمام تفصیل بتاؤں گا جو میرے دل میں پوشیدہ ہے، کیا سمجھیں۔“

”جی، ہم بھی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔“

ڈیزل کچھ دیر خاموش رہا، جیسے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہو، اور پھر اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”ایڈمنڈ آرکوائڈی مورایک نامور مہم جوگر دانا جاتا ہے، تمہیں اس کا نام یاد ہو گیا، ذرا ٹیڑھا نام ہے، ایڈمنڈ آرکوائڈی مور، ہے نا ٹیڑھا۔“

ہم دونوں مسکرا دیے، خبر ڈیزل نے کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور بولا۔

”ایڈمنڈ آرکو ایڈی مور دنیا کے نامور مہم جو افراد میں سے ایک شاکر کیا جاتا ہے شمالی آسٹریلیا کے جنگلات میں ایک مہم کے دوران وہ مشکل میں پھنس گیا، میں بھی اس کے ساتھ تھا اور یہ بہت پرانی بات ہے، موت ہم سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اور ہم ہنس رہے تھے کہ کیا دلچسپ موت تقدیر میں لکھی ہے، میں نے امریکہ کے رنگ میں ریسلنگ کی دنیا میں اپنا لوہا منوالیا تھا، لیکن میرا بہترین مشغلہ ہم جوئی تھا اور میں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں مہم سرانجام دی ہیں، بہر حال میں تم سے کہہ رہا تھا کہ ہم ہنس رہے تھے کہ کیا دلچسپ موت تقدیر میں لکھی ہے، لیکن ایڈی مور زندگی کا انتظار کر رہا تھا، وہ حیرت سے کہتا تھا کہ اس طرح ایک ایسے نجوی کی پیشگوئی غلط ثابت ہوگئی جس نے ساری زندگی کبھی کوئی غلط پیشگوئی نہیں کی، اسے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی موت کا اتنا فوس نہیں تھا جتنا اس نجوی کی جیٹش کوئی غلط ہونے کا، وہ کہتا تھا کہ نجوی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی کہ کسی مہم جوئی کے دوران اس کی موت واقع ہوگی اور واقعی نجوی کی پیش گوئی اس وقت صحیح ثابت ہوئی جب موت ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھی اور کچھ لمحوں کی بات تھی کہ ہم اس کی آغوش میں پہنچ جاتے، پھر یوں ہوا کہ ایک تحقیقاتی پارٹی وہاں پہنچ گئی، اور اس نے ہم سب کی زندگی بچائی، یہ بھی ایک اہم

بات تھی کہ ہمیں بچانے کے لئے اس پارٹی کو اپنی زندگی داؤ پر لگانا پڑی۔

صورت حال یہ تھی کہ اگر یہ لوگ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوتے تو ہمارے ساتھ انہیں بھی زندگی کھوئی پڑتی اور اس مددگار پارٹی کا سب سے بڑا رکن دانش ہارون تھا، دانش ہارون سے یہ ہمارا پہلا تعارف تھا، تمام تر معلومات کے بعد پتہ چلا کہ وہ مصریات کا دیوانہ ہے اور مصر کے بارے میں عام تحقیق سے ہٹ کر تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ اس نے ابراہین مصر کے بارے میں ایسے نئے سراغ لگائے ہیں جو ابھی تک دنیا کے سامنے نہیں آئے اور ان دنوں میرے ذہن پر بھی مصر سوار تھا، چنانچہ ہم لوگ جدا ہو گئے اور وقت گزرتا رہا، مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ دوبارہ میری دانش ہارون سے ملاقات ہوگی۔ نہ ہم لوگوں نے اس قسم کے وعدے کئے تھے جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ مصر میرا بھی پسندیدہ ملک ہے اور مجھے بھی ابراہین کے بارے میں خاصا شغف تھا، دوسری بار بھی ہماری ملاقات ایسے ہی ہوئی، ان دنوں میں مصر میں تھا اور ابراہین پر کام کر رہا تھا کہ ایک صحرا میں پھر ہمارا کراؤ ایک ایسے مقام پر ہوا جب ہم ریت کے طوفان میں گھرے ہوئے پانچ دن کے بھوکے پیاسے تھے اور اس عالم میں چونکہ ہمارے حواس معطل ہو گئے تھے اور کچھ ہی وقت جا رہا تھا کہ ہم ریت کی گہرائیوں میں ڈفن ہو جاتے، ہم بے ہوش ہو گئے، اس کے بعد ایک نخلستان میں ہمیں ہوش آیا اور اس بار بھی ہماری زندگی دانش ہارون کی مرہون منت تھی، ایک ایسے شخص نے جس نے دوبارہ ہمیں موت کے جبروں سے نکال لیا ہو، جتنی بھی اس سے محبت اور اس کا احسان تسلیم نہ کیا جاتا انتہائی کم ظرفی کی بات تھی۔

خیر اس دوسرے واقعہ کے بعد کوئی دو سال بعد کی بات ہے کہ ایک شام میڈرڈ کے ایک پارک میں جب میں جاگلگ کر رہا تھا کہ کسی نے مجھے میرے نام سے پکارا، میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، کوئی نہ تھا

خیر اس دوسرے واقعہ کے بعد کوئی دو سال بعد کی بات ہے کہ ایک شام میڈرڈ کے ایک پارک میں جب میں جاگلگ کر رہا تھا کہ کسی نے مجھے میرے نام سے پکارا، میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، کوئی نہ تھا

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ آواز کہاں سے میرے کانوں میں ابھری ہے، جیسی وہ آواز دوبارہ ابھری۔

”یہ میں ہوں وسکن ڈیزل، اگر تمہیں یاد ہو، میرا نام دانش ہارون ہے۔“

آواز بالکل میرے قریب سے آئی تھی، میں شدت حیرت سے دیوانہ ہونے لگا، میں نے کہا۔ ”مگر تم کہاں ہو یا ر؟“

”تمہارے بالکل نزدیک۔“

”نظر کیوں نہیں آ رہے؟“ میں نے تعجب سے سوال کیا۔

”تم نے پہچان لیا یہ بتاؤ؟“

”ہاں ہاں تمہاری آواز کو میں زندگی دینے والے فرشتے کا نام دیتا ہوں۔ مگر یہ کیا اسرار ہے، تم لگا ہوں گے ہم ہو جانے کا کوئی عمل دریافت کر چکے ہو کیا؟ میں تمہاری حیران کن صلاحیتوں کا دل سے معترف ہوں، تم سب کچھ کر سکتے ہو۔“

”نہیں میرے دوست، میں ایک حادثے ایک ایسے کا شکار ہو گیا ہوں۔“

”ارے کب کہاں کیسے؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”بیکار ہے مجھ سے میرے بارے میں نہ پوچھو دوست، بس تمہیں دیکھا پہچان لیا اور دل چاہا کہ تم سے باتیں کروں، یہ بتاؤ تم خیریت سے تو ہو۔ کسی نئی مہم میں کسی مشکل کا شکار تو نہیں ہوئے۔“

”اگر میں حیران نہ ہوتا تو تمہاری اس بات پر بہت ہنستا اور کہتا کہ دوست مجھے یقین ہے کہ اگر تیسری بار بھی میں کسی مشکل کا شکار ہوں گا تو تم وہاں پہنچ جاؤ گے، لیکن براہ کرم مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے اور تم کہاں ہو۔“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”ویسے اس گفتگو کی طوالت بھی بے معنی ہے بے بی..... بہت سی باتیں ہوئیں اور پھر وہ چلا گیا۔ بعد میں مجھے صرف اس کی نئی کتابوں سے ہی اس کے زندہ ہونے کا پتہ چلا رہا، مصریات پر اس نے جو کچھ لکھا وہ

دنیا بھر میں سب سے انوکھا ہے، میرے دل میں اس کے لئے تجسس تھا کہ اس کا وہ المیہ درست ہوا یا نہیں، اب اس کی حقیقت کھلی ہے۔“

”آپ کو اس ایسے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں؟“ صوفیہ نے پوچھا۔

”بہت کچھ۔“ وسکن ڈیزل نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”آپ ہمارے لئے کیا کر سکتے ہیں انکل۔“

”زندگی تک دے سکتا ہوں۔“

”تھینک یو انکل..... تھینک یو ویری مچ۔“

”اس نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے، اپنا کوئی کام مجھے دے کر اعزاز بخشا ہے مجھے، ہارون دانش نے اپنی ایک کتاب میں میرے بارے میں بڑے اچھے الفاظ میں لکھا تھا، میری کاوشوں کو سراہا تھا اور مجھے عام محققوں پر فوقیت دی تھی اور اس وقت اس نے اس کا عملی ثبوت دیا ہے میں اس کا شکر گزار ہوں۔“

”انکل کیا آپ کو ابو کی مشکل معلوم ہو چکی ہے، آپ جانتے ہیں کہ ان کی پراسرار زندگی کا راز کیا ہے؟“

”نہیں..... ہارون نے مجھے جو تفصیلات بتائی ہیں وہ اپنی اس مشکل کے حل کے تلاش کے سلسلے میں اس کی وجوہات نہیں بتائیں۔ تمہیں میرے ساتھ مل کر کاوش کرنی ہوگی۔“

”میری ماں کے بارے میں کچھ پتہ چل سکتا ہے انکل۔“ میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا اور وسکن ڈیزل تا سرف سے مسکرا پھر بولا۔

”جب ساری کہانی منظر عام پر آئے گی تو اس میں وہ تمام کردار ہوں گے جن کا اس کہانی سے تعلق ہے، سنو بے بی جو تفصیلات ہارون نے لکھی ہیں اور جو ذمے داری اس نے مجھے سونپی ہے اس کی تکمیل کے لئے ہمیں بہت سی کاوشیں کرنی ہیں، چند اہم افراد کو انکشاف کرنا ہے، ان میں پہلا نام ابو حامد کی ہے، یہ الجبراز کا باشندہ ہے اور الجبراز کے شہر عیارہ میں اس سے ملاقات

ہو سکتی ہے۔ مصریات پر اس نے بھی بہت کام کیا ہے اور بڑا نام رکھتا ہے، ہمیں الجبراز چلنا ہوگا، میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کس صوفیہ بھی اس مشن میں ہمارے ساتھ رہیں گی۔“

”ہاں وسکن ڈیزل، میں ہر لمحہ نشاء کی ساتھی ہوں، مجھ سے ہٹ کر کوئی بات نہ سوچی جائے۔“ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”بس پھر تم لوگ سفر کے لئے تیار رہو میں تیاریاں مکمل کئے لیتا ہوں۔“

”مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا انکل۔“ میں نے کہا اور وسکن ڈیزل نے کسی قدر تنگی لگا ہوں سے مجھے دیکھا پھر بولے۔

”اچھے اچھوں کو معلوم نہیں ہو سکتا بے بی، مصری تہذیب کے چھ ہزار سال ملوث ہیں اس داستان میں۔ تاریخ الجھ گئی ہے اسے سلجھانا ہے بڑے پاپڑیلے پڑیں گے اس کے لئے۔ اور تم..... تم ایک معمولی سے آدمی اسے اس کا حل چاہتی ہو، چلتا ہوں تیاریاں مکمل کر کے آؤں گا۔“ وسکن ڈیزل چلا گیا، میں غم زدہ سی ہو گئی تھی۔ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”کیا بات ہے ہبی اب پریشانی کس بات کی ہے، جس سمت قدم بڑھا رہے ہیں ادھر چلنا ہوگا۔“

”میں اس تاریخ میں الجھ گئی ہوں سسٹر صوفیہ۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

”وسکن ڈیزل اس لحاظ سے عجوبہ تھا کہ اچانک ہی نازل ہو جاتا تھا اور پھر ایک دم انکشاف کرتا تھا۔“

”رات کو ساڑھے دس بجے ہم میڈر چل رہے ہیں، وہاں سے الجبراز کا سفر اختیار کرنا ہوگا۔“

ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے، لیکن تیاریاں تو کرنی ہی تھیں اور پھر وہ کیا سے میڈر پہنچ گئے، وسکن ڈیزل بھی ساتھ تھا۔ میڈر میں ایک مناسب ہوٹل میں قیام کیا گیا تھا، وسکن ڈیزل نے اپنے لئے الگ کمرہ لیا تھا اور میں اور سسٹر صوفیہ دوسرے کمرے میں تھے۔ وسکن ڈیزل فریش جوتے کے بعد ہمارے پاس آ گیا،

کافی پی گئی اور پھر اس نے کہا۔ ”میڈر میں تمہیں تنہا گھومنا پھرنا ہوگا، میں کچھ کام کروں گا، یہاں کے بازار خوبصورت ہیں، تمہیں خریداری کا لطف آئے گا۔“

سسٹر صوفیہ بھی تیار ہو گئیں اور ہم ایک دن آرام کرنے کے بعد ساحلوں کی مانند میڈر کی سڑکوں پر نکل آئے۔ اجنبی ماحول، اجنبی لوگ، ہم بازاروں کی سیر کرتے رہے۔ اس وقت ہم ایک خوبصورت اسٹور سے باہر نکلے تھے کہ اچانک میرا سانس رک گیا۔ اسٹور کے سامنے کے فٹ پاتھ پر عسکری کھڑا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت پینٹ اور جنکٹ پہنے ہوئے، لیکن شیو بڑھی ہوئی تھی، اس وقت آنکھوں پر مخصوص چشمہ بھی نہیں تھا۔ ایک دم آگے بڑھا آیا اور مکمل لہجے میں بولا۔

”ہیلو نشاء۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سسٹر صوفیہ سے بولا۔ ”ہیلو میڈم۔“

”ہیلو..... کون ہو تم؟“ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”میرا نام عسکری ہے۔“

”سمجھ گئی، تم اسٹین کیسے آئے؟“

”نشاء میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”جو کچھ کہنا چاہتے ہو میرے سامنے کہو، مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔“ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”وہ سامنے کیسے ہے اگر آپ لوگ.....“

”بالکل نہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”نشاء..... میں تم سے کہتا تھا کہ میں تمہارا اسیر بن چکا ہوں، تمہیں اپنے دل سے نکالنا اب میرے لئے ممکن نہیں رہا ہے، میں تمہارے پیچھے پیچھے اسٹین تک آ گیا ہوں، دیر میں پتہ چلا کہ تم یہاں آ رہی ہو، جس طرح بھی میں پڑا تیاریاں کیں، میڈر کے چپے چپے میں کتنے دن سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں، آج مل سکی ہو نشاء۔ تم جو کچھ بھی کر رہی ہو اس میں مجھے اپنا ساتھی بناؤ، اس کے صلے میں، میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔“

میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔

”جلے سسر..... آپ یہ فضول کو اس سنے کیلئے کیوں رک گئیں، آئیے پلیز!“ میں نے کہا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔

”نشاء میں بیٹی بال کے کمرہ نمبر دو سو چالیس میں ٹھہرا ہوا ہوں، نشاء میرے بارے میں غور کرنا، تمہیں میری ضرورت ہے پلیز! نشاء دیکھو میں.....“

میں نے سامنے سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکنے کا اشارہ کیا اور ٹیکسی رک گئی، میں اور سسر صوفیہ فوراً اس میں بیٹھ گئے تھے۔ راستے میں صوفیہ نے ہمارے ہوٹل کا نام ڈرائیور کو بتا دیا تھا، راستے میں خاموشی رہی تھی۔ طبیعت پر بھاری یزن طاری ہو گیا تھا۔ ہوٹل آ کر عجیب سی الجھن کا شکار ہو گئی۔ سسر صوفیہ کو میں نے عسکری کے پارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔

”میرے خیال میں تمہیں اس سے بات کرنی چاہئے تھی، اس کا اتنا طویل سفر کر کے یہاں چلے آنا معمولی بات نہیں ہے۔“

”سسر وہ روشاق کے لئے کام کرتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اب ایسا نہ ہوا اور گریسا ہے بھی تو یہ ایک اچھا موقع ہے دشمن کو قریب سے دیکھا جاسکتا ہے، ویسے میرا اندازہ ہے کہ اب ایسا نہیں ہے وہ بس تمہاری محبت کی دیوانگی کا شکار ہے۔“

”مثل اس کی شکایت ہے اور سسر میرے دل میں اب اس کے لئے ذرہ برابر بھی جگہ نہیں ہے، میں کسی کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔“

”اس کے قریب جا کر تم اسے مثل کی طرف مائل کر سکتی ہو۔“

”کیا ہمارے پاس ان فضولیات کے لئے وقت ہے؟“

”میں تمہیں کسی عمل کے لئے مجبور نہیں کروں گی بس میری رائے ہے کہ ایک بار اس کے دل کو اندر سے ٹٹول لو اور یہیں سے واپس روانہ کر دو، ہو سکتا ہے وہ

الجزائر تک ہمارا چچا کرے۔“

میں سوچ میں ڈوب گئی، پھر میں نے سسر سے اتفاق کر لیا، دونوں ہی باتیں کارآمد تھیں، اگر وہ عسکری میرے سلسلے میں جنونی ہو گیا ہے تو اسے سمجھاؤں اور اگر کوئی اور بات ہے تو کتنا چھپے گا۔

شام کو پانچ بجے ہم باہر نکل آئے۔ ہوٹل میں بال تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی، نچلے درجے کا لیکن خوبصورت خولصورت ہوٹل تھا۔ روم نمبر دو سو چالیس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہم آگے بڑھے ہی تھے کہ اچانک اس کمرے کا دروازہ کھلا اور اس سے کوئی باہر نکل آیا۔ میرے حلق سے ایک آواز نکل گئی، میں نے سسر صوفیہ کا شانہ دو بوج لیا تھا، میرے قدم جم گئے تھے، مشکل میرے حلق سے آواز نکلی۔

”سسر..... وہ..... وہ وہ روشاق ہے۔“

سسر صوفیہ کو ایک لمحے میں میری کیفیت کا احساس ہو گیا تھا اس کے علاوہ روشاق کا نام بھی ان کے لئے اجنبی نہیں تھا، خوش قسمتی تھی کہ ہم جہاں کھڑے تھے وہیں اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں اور لفٹ آئبل سیڑھوں کے سامنے تھی۔ صوفیہ نے نہایت بھرتی کا مظاہرہ کیا اور میرا بازو پکڑ کر کھینچ لیا، اس کے بعد ہم سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ روشاق لفٹ ہی کی طرف آ رہا تھا، قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر ہم رکے اب روشاق لفٹ کے پاس کھڑا انتظار کر رہا تھا، پھر وہ لفٹ میں داخل ہو گیا۔

میرے وجود میں جنم سلگ رہا تھا، سسر سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں، پھر انہوں نے کہا۔ ”عسکری کا کیا کمرہ ہے نا، کمرہ نمبر دو سو چالیس؟“

”ہاں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ روشاق اسی سے ملے آیا تھا۔“

”بالکل۔“ میں نے سختی سے ہونٹ سمجھ کر کہا۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“

”وہ روشاق کی نمائندگی کر رہا ہے، سسر، وہ مجھے

مسل قریب دے رہا ہے، میرے خیال میں اب اس سے ملنا پکار ہے۔“

”ہوں.....“ وہ چلتے ہیں، نہیں نیچے نہیں چند سیڑھیاں اور چڑھ لو، ہم دوسری منزل سے لفٹ لے لیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد ہم اپنے ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ سسر صوفیہ نے صوفیہ پر دراز ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے تم سے اختلاف ہے ڈارلنگ۔“

”کیا سسر؟“

”یقیناً اب بھی تم اس سے محبت کرتی ہو۔“

”شاید ایسا ہو سسر، لیکن اس کی ایک وجہ ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

”سسر، میں اپنی تنہائیوں سے اکتائی ہوئی تھی، میرے خیال میں ان حالات میں کیا کسی سے بھی محبت ہو سکتی تھی؟“

”ہاں میں یہ مانتی ہوں۔“

”اگر آپ یہ مانتی ہیں سسر تو اب یہ مان لیجیے کہ میں اب اس سے شدید نفرت کرتی ہوں۔“

”ہوں، خیر چھوڑو یہ بتاؤ کیا کریں، کینخت روشاق نجانے کیسے یہ راز پایا اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ وہ نہایت ہوشیاری سے ہم پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔“

”اتفاق سے سسر ولسن ڈیزل سے روشاق وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی، سسر ڈیزل کا ہوشیار ہو جانا بے حد ضروری ہے، ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح ہمدانی کو نقصان پہنچ گیا ہے اس طرح سسر ڈیزل بھی اس کا شکار ہو سکتے ہیں۔“

”اوہ سسر! بالکل ٹھیک کہا آپ نے، میرا ذہن اس سمت نہیں گیا تھا۔“ میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”ڈیزل کو فوراً پوری تفصیل بتانا ہوگی۔“ سسر نے کہا۔

رات کو ولسن ڈیزل سے ملاقات ہو گئی۔ ”کل گیارہ بجے ہماری فلائٹ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”آپ کو ایک اہم واقعہ کی اطلاع دینی ہے

انگل ڈیزل۔“

ولسن ڈیزل نے سوالیہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا تو سسر صوفیہ نے اسے پوری کہانی سنائی اور آخر میں روشاق کے بارے میں بتا دیا۔ ولسن ڈیزل کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا، کافی دیر کے بعد اس نے کہا۔

”کل رات گیارہ بجے ہماری فلائٹ ہے، دس بجے ہم ہوٹل سے نکلیں گے، میں اگر دن میں نہ ملوں تو تم سے تو تم لوگ تیار رہنا۔“ ولسن ڈیزل کا لہجہ پر اعتماد تھا اس نے اس کہانی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ پھر وہ چلا گیا اور ہم لوگ تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

دوسرے دن صبح کوئی ساڑھے دس بجے کا وقت تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ اندر سے بند تھا۔ سسر نے دروازہ کھولا اور پھر آنے والے سے بات کرنے لگیں پھر انہوں نے اندر رخ کر کے کہا۔

”مسر عسکری ہیں نشاء۔“ میں اچھل کر کھڑی ہوئی اور اس کے بعد میں دروازے پر آ گئی۔

”یہ خاتون مجھے اندر آنے سے روک رہی ہیں نشاء۔“ عسکری نے کہا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے غرا کر پوچھا۔

”مجھے تم سے کچھ کام ہے۔“

”چلے جاؤ یہاں سے، جاؤ میں نے تم سے دوبارہ ملاقات کے لئے منع کیا تھا، لیکن تم..... جاؤ میں اپنی زبان گندکی نہیں کرنا چاہتی۔“

”نشاء تم یہاں بھی خطرات میں گھری ہوئی ہو، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں اور جو کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں وہ تمہارے لئے.....“

”سسر! انہیں دروازے سے باہر دھکا دے کر دروازہ بند کر دیجئے اور اگر یہ دوبارہ تیل بجائے تو ہوٹل منجمنٹ کو فون کر کے بتاؤ کہ ایک آوارہ انسان ہمارے کمرے میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ میں نے اس کی پوری بات بھی نہیں سنی تھی۔

”نشاء میری بات سن لو۔“ عسکری نے کہا لیکن سسر صوفیہ نے دروازہ بند کر دیا تھا، میں واپس آ کر اپنی



مغرور

محمد عثمان علی - میاں چنوں

اچانک نوجوان کو جنگل میں بھیڑیوں نے گھیر لیا، بھیڑیوں سے بچنے کے لئے وہ بھاگا مگر وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب نہ ہو سکا، وہ کرب و اذیت سے چیخنے لگا، اس کے جسم کا ریشہ ریشہ اڈھڑتا چلا گیا۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ بلندیوں پر صرف خدا کی ذات پہنچاتی ہے۔ ایک سبق آموز کہانی

اس کا نام جابر تھا، اور شاید نام کی نسبت سے ہی اسے شروع شروع میں بہت جبر کرنے پڑے تھے، فالتے اور ٹھوکریں سہنا پڑیں تھیں۔ مگر بعد میں پھر یہی فالتے دھتوں میں اور ٹھوکریں ایک طویل ترین حلقہ احباب میں تبدیل ہو گئے تھے۔

وہ ایک تعمیراتی ادارے میں کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا۔ مگر آج محنت اور لگن سے وہ بذات

خود ایک مشہور و معروف اور بہت بڑا آرکیٹیکٹ تسلیم ہو چکا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے نقشے ملک بھر میں مانے جاتے تھے۔ تسلیم ہوتے تھے، وہ کمال بھی کچھ ایسا ہی دکھاتا تھا۔ زمین جتنی بھی ہو..... نقشے کے لئے وہ جب کاغذ پر لکیریں کھینچنا شروع کرتا تو زمین خود بہ خود وسیع ہونا شروع ہو جاتی تھی۔ رتی بھر بھی فرق نہیں پڑتا تھا شاید اس کے پاس کوئی جادو تھا، جس پر آدمی حیران رہ

”لوگ یہ بھول گئے کہ یہ اپنیں ہے میرا وطن۔“

”انکل ڈیزل۔“

”میں ان لوگوں کو اور بھی نقصان پہنچا سکتا تھا، لیکن کیا کروں وہ حکومت اپنیں کے مہمان تھے، رعایت کردی ہے میں نے ان کے ساتھ۔“

”لیکن انکل.....“

”ہاں بی بی، کچھ لوگ مسلسل ہمارے ساتھ لگے ہوئے تھے، اب وہ الجزائر پہنچ جائیں گے اور ہم ایک ہفتے بعد اس سفر کا آغاز کریں گے وہ بھی سمندری جہاز سے جبکہ اب یہ لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ ہم اس فلائٹ سے الجزائر روانہ ہو گئے ہیں، یقیناً وہ کوئی دوسری فلائٹ پکڑیں گے۔“

”اوہ! انکل آپ نے اس طرح انہیں ڈانچ دیا ہے، لیکن یہ تو بہت مشکل کام تھا۔“

”میڈرڈ میں یہ میرے لئے ممکن تھا، میں نے ہوٹل میں کمرے بک کر لئے ہیں، ہمارا سامان ایئر پورٹ سے وہیں پہنچ جائے گا۔“

بالآخر ہم لوگ ہوٹل پہنچ گئے، وسکن ڈیزل کی اس چالاکی پر مجھے ہنسی آرہی تھی، خوب دھوکہ دیا تھا اس نے ان لوگوں کو۔ بعد میں، میں نے وسکن ڈیزل سے اس سمندری سفر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

”اس جہاز کا نام مارشل ہے اور اس کا کپتان روڈرگس ہے۔ دراصل تم لوگوں کے اس انکشاف کے بعد کہ وہ لوگ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے اپنیں تک آ گئے ہیں میں تشویش کا شکار ہو گیا تھا، اس کے بعد یہ سفر بالکل غیر مناسب تھا، لیکن میں ان لوگوں کو یہی ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ہم اپنیں سے چل پڑے ہیں، لیکن اب ہم بالکل نئے انداز سے الجزائر پہنچیں گے اور اپنے ارادے کی تکمیل کریں گے۔“ وسکن ڈیزل نے عجیب سے انداز میں کہا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی تھی۔

(جاری ہے)

جگہ بیٹھ گئی تھی، دیر تک ہم نے کوئی بات نہیں کی اس کے بعد دروازے پر دستک نہیں ہوئی تھی، رات کو دس بجے مسٹر وسکن ڈیزل ہمارے پاس آ گئے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا۔

”تم لوگ ٹھیک ہوتا؟“

”عسکری آیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”صبح ساڑھے دس بجے۔“

”ہاں۔“

”مجھے معلوم ہے تم لوگ پریشان تو نہیں ہو۔“

”نہیں..... لیکن احتیاط ضروری ہے۔“ میں نے کہا اور وسکن ڈیزل ہنسنے لگا۔

”ہاں احتیاط ضروری ہے، لیکن تم بہت بد اخلاق لڑکی ہو مجھ سے میری پسندیدہ کافی کے بارے میں کبھی نہیں پوچھتیں۔“

کافی پینے کے بعد ہم کمرے سے باہر نکل آئے، ایک ٹیکسی میں سامان رکھا گیا اور ٹیکسی ایئر پورٹ چل پڑی، راستہ خاموشی سے طے ہوا تھا، ایئر پورٹ پر ضروری کارروائی ہوئی اور ہم اس طرف چل پڑے جہاں ہمیں رن وے پر لے جانے کے لئے گاڑی موجود تھی، لیکن جونہی ہم گاڑی کے قریب پہنچے ایک کیئرنگک وین ہمارے عقب میں آ گئی اور دوسرے لمحے وسکن ڈیزل نے ہمیں غراپ سے کیئرنگ وین میں داخل کر لیا اور ایک جھپکے وہ خود بھی وین میں آ گئے اور وین آگے بڑھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھے لوگ ہمیں دیکھتے رہ گئے تھے۔

ہم دونوں بوکھلا گئے تھے اور اس بوکھلاہٹ میں کچھ بول بھی نہ سکے، وین رن وے کے ایک ایسے حصے میں جا کر رکی جہاں تاریکی تھی اس تاریکی میں ایک اور گاڑی کھڑی ہوئی تھی، وسکن ڈیزل نے ہم سے اترنے کے لئے کہا اور ہم امتقوں کی طرح یہاں اتر گئے۔ وین آگے بڑھ گئی اس گاڑی کا اسٹیرنگ خود وسکن ڈیزل نے سنبھالا تھا، وین ڈرائیو کرتے ہوئے

اس نے کہا۔

ڈرڈائجسٹ کا مشہور و معروف سلسلہ

نمبر 5 اور 6

رولو کا

پراسرار قوتوں کا مالک

مکمل اور طویل ترین داستان حیرت

کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قسط نمبر 47 سے قسط نمبر 58 تک

قسط نمبر 59 سے قسط نمبر 70 تک

تحریر: اے وحید قیمت فی کتاب = 150/-

نادیدہ قوتوں کی زور آزمائی، کالی دنیا کی بدروحوں

کی شرانگیزی، جنت کی دیدہ دلیریاں، خونی

آتماؤں کی تحیر انگیز اور حیرت انگیز ناقابل

فراموش ہاتھ پائی اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے

خونچکاں بھونچکاں معرکہ جیسے پڑھ کر پڑھنے

والے مہموت اور انگشت بدنما رہ جائیں گے

اور طویل ترین عرصہ تک یہ تمام کہانیاں ذہن کے

پردے پر جھلکاتی رہیں گی۔

ڈرڈائجسٹ کی شینز

کتاب مارکیٹ نیو وارڈ بازار کراچی

Ph: 32744391

”ٹھیک ہے سر۔۔۔“ سیکریٹری نے اثبات میں سر ہلایا اور اگلے قدموں واپس کمرے سے نکل گیا۔

مرزا صاحب، دو ماہ قبل جابر سے ملاقات کا وقت طے کر گئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد سفید رنگ کے کرتے پا جاے میں لمبوں ایک عمر رسیدہ باوقار شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر سفید رنگ کی داڑھی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسی کا نام مرزا تھا۔ وہ جابر کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میرے پاس وقت کی قلت ہے۔ اس لئے جلدی بولیں۔ کیا کام ہے؟ زمین کہاں.....؟ کارزہے یاد دیمان؟ ویسٹ اوپن ہے یا ایسٹ اوپن۔“ جابر نے ایک ہی سانس میں مرزا سے کاروباری لہجے میں دریافت کیا۔

”جابر صاحب! میں آپ کے فن کا شیدائی ہوں۔ اسی لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ.....“ مرزا صاحب جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”ہاں۔ ہاں..... آپ بات جاری رکھیے.....“ جابر نے کہا۔

مرزا آہستہ سے بولا۔ ”مجھے مکان نہیں بتوانا.....“

”تو پھر کیا بتوانا ہے۔ کوئی سنیما وغیرہ..... یا کوئی شاپ..... عمارت پلازہ.....“

ذرا توقف کے بعد مرزا صاحب بولے۔ ”وہ دراصل مجھے مسجد کا نقشہ بتوانا ہے۔“

”کیا.....؟ مسجد کا نقشہ.....؟“ جابر نے بے اختیار چوک کر طنز یہ انداز میں کہا۔

مرزا صاحب نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”جی.....“

جابر قہقہہ لگا کر کمرے کے معنی خیز انداز میں ہنس پڑا۔ پھر وہ بولا۔ ”مسجد..... بہت خوب، تو اب جابر خان مسجد کا نقشہ بنائے گا.....“ جابر کا انداز مستحزبانہ

میں سوال کر جاتے۔ منہ سے کچھ نہ بولتے۔ اپنی بے پایاں محنت اور لگن سے وہ آج ایسی بلندی پر تھا، جہاں سے نیچے دیکھنا شاید اس کے اپنے بس میں نہیں تھا۔ کامیابیوں کے ایک مسلسل سلسلے نے اس کو ہر فن تعمیرات کی بلندیوں پر لاکھڑا کیا تھا۔ وہ اب نہ صرف شہر کا بلکہ اپنے ملک کا مشہور ترین کاروباری آدمی بن گیا تھا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر اس کی سوچوں کا شیرازہ ٹوٹ گیا۔

”ہی..... کم ان.....“ اس نے عام فہم لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازہ دھیرے سے کھلا اور اس کا سیکریٹری اندر داخل ہوا۔ وہ بولا۔ ”سر۔ مرزا صاحب آگئے ہیں۔“

”ہوں۔ تم یہ بات مجھے فون پر بھی بتا سکتے تھے.....!“ جابر نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”میں نے نمبر ملا یا تھا سر۔ مگر آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا.....“ اس کے سیکریٹری نے شائستہ لہجے میں بات کی۔ پھر وہ جابر کی ٹیبل پر پڑے ہوئے فون پیس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”سر۔ ریسیور تو کریڈل کی بجائے ٹیبل پر پڑا ہوا ہے۔“

اس بات پر جابر نے چونک کر فون پیس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کے منہ سے ہلکی سی سرد سانس خارج ہوئی۔ ریسیور واقعی کریڈل کی بجائے ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔

”اوہ، کال سننے کے بعد مجھے شاید ریسیور کریڈل پر رکھنے کا یاد نہیں رہا۔“ جابر نے اس بار دم سے لہجے میں کہا۔ ”ہاں پور تم مرزا صاحب کو اندر بھیج دو اور ہاں..... اس کے بعد کسی کومت بھیجنا۔ مجھے وزیراعلیٰ کے پاس جانا ہے۔“

جانتا۔ جابر کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نقشے کے سلسلے میں صرف اور صرف اپنی ہی بات ملحوظ خاطر لاتا تھا۔ چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے..... دنیا ادھر کی ادھر..... گرد و سروں کی بالکل بھی نہ سنتا اور اگر کوئی غیر ضروری مداخلت کرتا تو جابر لاکھوں روپوں کا نقشہ بھی ادھر اور چھوڑ کر اٹھ جاتا اور معاہدہ کھوکھو مار کر ختم کر دیتا۔

ملک کے تمام اہم تعمیراتی منصوبوں پر اس کے ہی بنائے ہوئے نقشوں کے مطابق کام ہو رہا تھا شہر کے تمام رئیسوں، امراء کے محل نگہروں کو بھیوں اور بنگلوں کے نقشے بھی اس کے فن پارے تھے۔ سرکاری عمارتیں، تفریحی مقامات، ہسپتال، سنیما گھر اور دیگر کاروباری مقامات..... سب پر اس کا ہی نام درج تھا جابر کی کامیابیوں کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ چل پڑا تھا جو کہ روکے بھی نہیں رک رہا تھا۔ بے انتہا دولت، بے شمار انعامات..... اب ہر نیا آنے والا دن ان ہی چیزوں کی نوید لے کر آتا۔ یہ انداز سفر اس کو حد سے زیادہ بے پرواہ بنا گیا تھا۔ وہ بعض دفعہ انجانے میں کچھ ایسے کام بھی کر جاتا تھا جو بظاہر کسی ہوش مند آدمی کو زیب نہیں دیتے۔ مگر وہ شخص جس کا نام جابر تھا، اب صرف اور صرف ایک مشہور آرکیٹیکٹ تھا اور شہرت کے زینے چڑھنے کے بعد کم ہی خوش نصیب لوگ ایسے ہوتے ہیں جو فیصلے عقل سے بھی کرتے ہیں! اب تو پیناٹشوں میں گھرے رہنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ بروقت، ہر گھڑی، سوتے جاگتے..... بس پیاسا ہی کرتا رہتا تھا۔ بالکوئی سترہ فٹ، بیرونی کمرائیں فٹ، چھت کی اونچائی تیس فٹ، گوزینے کا قطر چار فٹ، کچن چودہ فٹ، ہاتھ روم بارہ فٹ اور نامعلوم کیا کیا.....

وہ ہر لمحہ، ہر وقت..... کسی ناکسی نئے پروجیکٹ کے نقشے کی تیاری میں مصروف رہتا۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ نقشہ ہر لحاظ سے مکمل ہوتا۔ مگر پھر جابر کو خود ہی اس میں کچھ کی نظر آ جاتی اور پھر وہ از سر نو نقشہ بنانے میں مصروف ہو جاتا۔ دیکھنے والے آنکھوں ہی آنکھوں

تھا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ ناکہ میری فیس کتنی ہے۔۔۔۔۔“
”جی بالکل۔۔۔۔۔“

”اگر آپ کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میری فیس ادا کر سکیں تو پھر بھی میں مسجد کا نقشہ نہیں بنا سکتا۔ آئی ایم سوری۔“

”مگر کیوں۔۔۔۔۔ اس کے عوض آپ کو مکمل فیس دی جائے گی۔ تاکہ اللہ کے لئے مفت میں نقشہ بنوایا جائے گا۔“

”مسجد میں رکھا ہی کیا ہے؟ سیدی سیدی لائن ہوگی۔ وہاں جاننا نہ بچھا دیں۔۔۔۔۔ ہر دو فٹ کے فاصلے پر پتکے کا پوائنٹ دے دیں۔ سوری مرزا صاحب، میں اس طرح کا کام نہیں کر سکتا، میں آرکیٹکٹ ہوں۔ کوئی معمولی مستری نہیں۔۔۔۔۔“

مرزا صاحب نے جابر کے متعلق جو کچھ سن رکھا تھا وہ دیکھ بھی لیا۔ مگر وہ بھی جہاں دیدہ آدمی تھے۔ ان کو جابر پر غصہ نہیں آیا۔ بلکہ ترس آیا۔ وہ دل ہی دل میں جابر کے لئے ہدایت کی دعا کرتے ہوئے اس کے دفتر سے باہر آ گئے۔

جابر کو احساس تک نہ ہوا کہ اس سے کس طرح کا کفر سرزد ہوا ہے۔ مگر شاید ابھی خدا کا امتحان اور بات تھا۔

دن بدن گزرتے گئے۔ وقت کا پہرہ گھومتا رہا۔ ایک دن جابر نے مزدوروں کے رہائشی کوارٹرز کا نقشہ بھی بنانے سے انکار کر دیا۔ فیکٹری کا مالک چاہتا تھا کہ جس طرح فیکٹری کا نقشہ جابر نے تیار کیا ہے۔ اسی طرح ملازمین کے لئے کوارٹرز بھی جابر ہی بنائے۔ مگر جابر نے فیکٹری کے مالک کو دو ٹوک صاف جواب دے دیا۔

”دیکھیں جناب۔ سیدی سی بات ہے۔ ان کوارٹرز میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں دو، دو کمروں کے مکانات کا نقشہ نہیں بنا سکتا کوارٹرز میں رکھا ہی کیا ہے۔ دو کمرے، ایک باتھ روم، دو ونڈوز اور ہال چکن۔۔۔۔۔ ایک سلیپ رکھ دیں۔ مٹی کے تیل کا چولہا اور بس۔۔۔۔۔“

کوارٹرز تیار ہیں۔“

فیکٹری کے مالک نے جابر کو کافی حد تک سمجھایا۔ منانے کی کوشش کی۔ مگر جابر پر تو کوئی اور کسٹم کا اثر نہیں ہوا۔ پھر فیکٹری کا مالک خاموش ہو گیا۔ ایک طرح سے فیکٹری کے مالک کو ذرا بھی تھا کہ اگر اس نے جابر سے مزید بحث کی۔۔۔۔۔ اصرار کیا تو جابر کہیں اس سے فیکٹری کا نقشہ بھی واپس نہ لے لے۔

جابر کو ایک سرکاری عمارت کے عمدہ نقشے کے عوض بڑے انعام و اکرام سے نوازاجا رہا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک تقریب میں اس کی ”دی آرکیٹکٹ“ کا خطاب بھی دیا گیا۔ گویا اب جابر کی ذات کا واحد حوالہ اس کا پیشہ ہی رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب جابر انسان بھی کم کم ہی رہ گیا تھا۔

وہ اپنے اس خطاب پر بہت مسرور تھا۔ بات خوشی کی ضروری تھی۔ مگر اس خطاب کو پالینے کے بعد اس میں پہلے سے زیادہ رعونت آ گئی تھی۔ وہ اور زیادہ مغرور ہو گیا تھا۔

فیکٹری کے کوارٹرز والی بات جب مزدور یونین کے لیڈر کو ملی تو وہ سراپا احتجاج بن گیا۔ فیکٹری کے مالک نے اسے بہت روکا مگر وہ نہ مانا اور ایک دن جابر کے دفتر پہنچ گیا۔

”سنا ہے کہ آپ نے کوارٹرز کے نقشے پر سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے؟“ مزدور لیڈر نے جابر سے استہقامیہ لہجہ میں کہا۔

”جی درست سنا ہے۔ بھلا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“ جابر نے اٹھائی سے پوچھا۔

”جی بالکل۔ کیونکہ ہم لوگ اسی فیکٹری کا حصہ ہیں۔ مزدوروں کو فیکٹری سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کوارٹرز سے آپ کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، نقشہ بنانا آپ کا پیشہ ہے، آپ کو اس کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔“ مزدور لیڈر جابر کے سامنے اپنے ساتھی مزدوروں کا دفاع کر رہا تھا۔

”میں اپنی میرٹھی کا مالک ہوں۔ میں نقشہ

ضرور بناتا ہوں۔ مگر میرے بنائے نقشے کوارٹرز کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ محلوں، کوٹھیوں، بنگلوں اور بڑی عمارت کے لئے ہیں۔ میرے ڈیزائن کئے ہوئے بیڈ روم میں لاکھوں روپوں کا سامان آرائش ہوتا ہے۔ میرے بنائے ہوئے چکن اٹلی کے ساز و سامان سے مزین ہوتے ہیں۔ اور تمہارے کوارٹرز۔۔۔۔۔ تمہارے کوارٹرز میں جملہ سامان کیا ہوگا دو بیڈز، ایک گیس سلنڈر چولہا، ایک الماری اور بس۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔“ جابر نے بولتے ہوئے کہا اور ساتھ والے کلاک پر نظر ماری۔ ”اب آپ جانتے ہیں۔ آپ میرا وقت برباد کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلا جاتا ہوں۔“ مگر ”دی آرکیٹکٹ“ صاحب۔ میں تو آپ کا وقت ہی برباد کر رہا ہوں۔ مگر آپ خود کو برباد کر رہے ہیں۔“ لیڈر یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔

جابر کو اسی طرح دو تین اور مواقع ملے۔ مگر ”دی آرکیٹکٹ“ بن جانے کے بعد اس کی سوچ میں بھی رعونت اور مغروری درآئی تھی۔ وہ انجانے میں ایسی غلطیوں کا روزمرہ تکب ہو رہا تھا۔ جس سے کسی نہ کسی کی دل نشینی ضرور ہوتی۔

اس دل نشینی کے سلسلے کے ساتھ ساتھ اس کی کامیابیوں کا بھی سلسلہ بھی قائم تھا۔ کامیابی اور دل نشینی کے مرکب کے ساتھ ”دی آرکیٹکٹ“ کا سفر جاری رہا۔ دل نشینی کے شکار ہونے والے بھی حیران تھے کہ آخر خدا نے جابر کو اب تک اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے؟

ایک بڑے سیاسی لیڈر کے ذاتی گھر کا نقشہ بنایا جا رہا تھا۔ گھر کی بالکونی کی ساری خوب صورتی محض اس لئے خراب ہو رہی تھی کہ گھر کے سامنے والے دینی مدرسے کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بات بالکونی کے حسن کو خراب کر رہی تھی۔ دینی مدرسے کی عمارت ایک عام سی عمارت تھی، بالکونی کے حسن کو بچانے کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس دینی مدرسے کی کچھ نہ کچھ خوبصورتی بڑھادی جائے۔

”دی آرکیٹکٹ“ کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج تھا۔

وہ سیاسی لیڈر کو کچھ نہ کچھ کر دکھانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو استعمال کر کے اب اس پروجیکٹ پر مصروف عمل ہو گیا تھا۔

اپنے تمام اثر و رسوخ استعمال کر لینے کے باوجود وہ دینی مدرسے کو وہاں سے کہیں اور منتقل کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ مدرسے میں مزید زیبائش کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ پھر ایک دم اسے ایک بہت ہی لغو خیال آیا۔ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے متعلقہ حکام سے بات چیت کی اور کیونکہ یہ خیال بظاہر محکمے کے لئے بہت فائدہ مند تھا اس لئے یہ خیال فوراً ہی مان لیا گیا مگر حقیقت اس خیال سے دینی مدرسے کا تقدس بری طرح پامال ہو رہا تھا۔ مگر اس کی فکر نہ ”دی آرکیٹکٹ“ کو تھی اور نہ ہی محکمے کو۔۔۔۔۔

پھر بالکونی کا حسن اس طرح بچا لیا گیا کہ دینی مدرسے کے اس حصے پر جو بالکونی سے نظر آتا تھا۔ ایک کثیر المنزلہ عمارت بنا دی گئی اس عمارت کو ایک ”بار“ کی شکل دی گئی۔ بظاہر یہاں سوفٹ ڈرنک اور الکوحل پلائی جاتی تھی۔ مگر جہاں قانون زم وہوہاں سوفٹ ڈرنک اور الکوحل کا امتیاز قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ”بار“ کچھ ایسی خوبصورتی سے بنایا گیا تھا کہ رات کو وہاں سے رنگے ہوئے فانوس کی روشنی شیشوں سے منعکس ہو کر گیلری میں پڑتی تھی جو اس مکان کی بالکونی کو اور بھی خوبصورت کر دیتی تھی۔

اس بات پر عوامی احتجاج ہوا مگر پھر عوام کو یہ یقین دلا کر بات ختم کر دی گئی کہ اس ”بار“ کی آمدنی مدرسے کو دی جاتی ہے۔ مگر یہ حقیقت کسی کو بھی نہیں معلوم تھی کہ باریکی آمدنی کی کس جیب میں جاتی ہے۔

اپنی اس نئی فتنہ پر وہ اور بھی اونچی پرواز کرنے لگا۔ ”دی آرکیٹکٹ“ نے اب اپنا اصل نام بھی لینا اور استعمال کرنا بند کر دیا تھا۔ ہر جگہ ہر موقع پر وہ اب اپنے اسی خطاب سے پکارا بلایا جاتا تھا۔ جو انسان اپنے نام کی حفاظت نہ کر سکے، اس کا نام دنیا میں بھی کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟ مگر وہ اس فکر سے آزاد ہو گیا تھا۔ اب وہ جیب

میں اپنا ملاقاتی کارڈ رکھتا، اس کارڈ پر اس کا نام درج نہیں تھا۔ بلکہ انگلش میں صرف ”دی آرکیٹکٹ“ لکھا ہوا تھا۔ یہ خطاب اس کی مکمل پہچان تھا۔ سب ہی کو جان لیتے تھے۔ اور اب اس شخص سے جابر بہت دور چلا گیا تھا۔ اور ایک اچھا انسان تو کافی پہلے چلا ہی گیا تھا۔

وقت کے تازیانے، نے اسے کامیابیوں کی مار مارا تھا۔ وہ کچھ کچھ بور رہنے لگا تھا۔ مگر شاید اب بہت دیر ہوگئی تھی۔ جہاں سے واپس لوٹنا شاید بہت دشوار بلکہ ناممکن تھا۔

شہر سے دور کسی گاؤں کو ملانے کے لئے ایک پل کا نقشہ اس نے مکمل کر لیا تھا۔ اور اب کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس پل کے مکمل ہوجانے کے بعد اس کا نام اور بلند ہو جاتا۔ کیونکہ پل کا نقشہ بہت اٹوکھا بنایا گیا تھا۔

عمارتوں کے نقشے بنانے والا یہ شخص اب ہر وقت اسی دھن میں لگا رہتا کہ یہ پل جلد از جلد مکمل ہوجائے تاکہ ”دی آرکیٹکٹ“ کا نام اور بھی روشن ہو! مسجد کا نقشہ نہ بنانے والا، مزدوروں کے کارڈز کا نقشہ نہ بنانے والا اور مدرسے کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والا، اب پل کی تعمیر مکمل ہونے کے لئے خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ کیونکہ اگر یہ پل وقت پر مکمل نہ ہو پاتا تو اس کے نقشے کی بہت بدنامی ہوتی۔

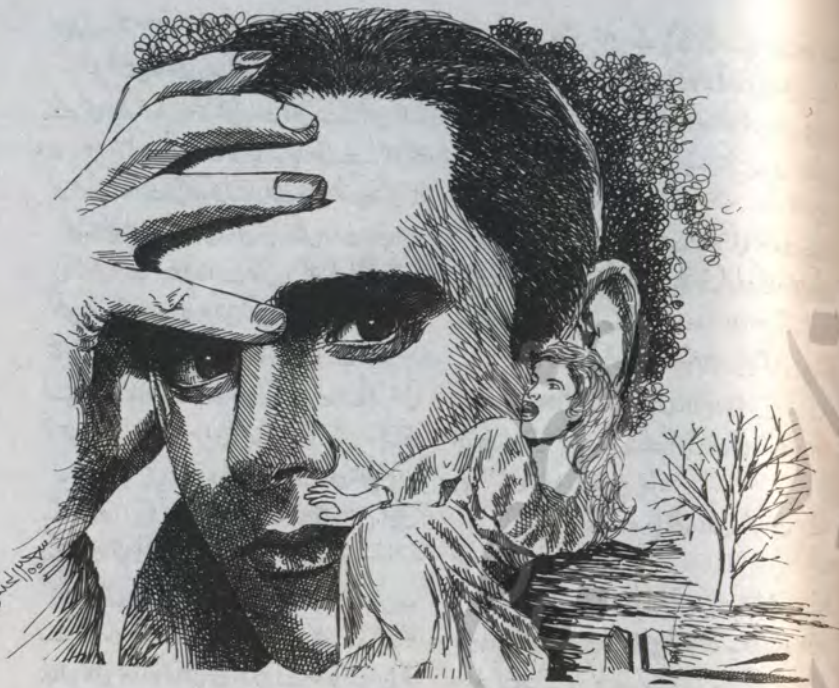
ایک روز وہ پل کے کام کی نگرانی کر کے اپنی گاڑی میں واپس لوٹ رہا تھا کہ رات سر پر آگئی۔ راستہ بھی سنسان تھا۔ گاؤں سے گزر کر پکی سڑک پر آنے میں آدھا گھنٹا لگتا تھا۔ وہ تنہا سے چور تھا۔ اسے گاڑی چلانے میں بے حد دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کے لئے سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کر دی اور خود باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لیتا چلتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے درختوں کے پیچھے سے کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی اندھیرے کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ مگر ان جنگلی بھیڑیوں نے

اس کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھیڑیے اب بہت قریب آگئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا جیسے ہی اس کی نگاہ ان بھیڑیوں پر پڑی، وہ بے اختیار بوکھلاہٹ کے عالم میں بھاگ کھڑا ہوا۔

مگر بھیڑیوں نے اسے شکار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کے بھاگنے کی رفتار بھی قابل دیدنی بھاگتے بھاگتے وہ سمت کا تعین کرنا بھول گیا۔ اور کئے جنگل میں آگہرا۔ ان بھیڑیوں نے آن واحد میں اسے چالیا۔ وہ کرب آلود انداز میں پیچھے لگا تھا۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ ادھر تارچلا گیا۔

کئی روز بعد وہاں سے گاؤں کے کسی آدمی کا گزر ہوا۔ کسی تعین نے اس آدمی کے قدم روک لئے۔ اس نے وہاں کسی انسانی لاش کو دیکھا جو بری طرح سے بھنبھوٹی ہوئی تھی۔ چہرہ شاخت میں نہیں آ رہا تھا۔ جسم کا، کافی حد تک گوشت چٹ ہو گیا تھا اس آدمی نے مدد کے لئے دوچار اور لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ سب لوگ سمجھ گئے کہ یہ شخص بھیڑیوں کا شکار ہوا ہے۔ لوگوں نے شاخت کے لئے اس کی سلاخی لی تو ایک جیب سے اس کا کارڈ نکل آیا۔ جس پر انگلش میں ”دی آرکیٹکٹ“ لکھا ہوا تھا۔ ان الفاظ کو پڑھ کر لوگ سمجھے کہ یہ کوئی غیر مسلم شخص ہے۔ اسی گاؤں کے لوگوں کے عقیدے کے مطابق غیر مسلم کو اور وہ بھی بھیڑیوں کے شکار کو مسلمانوں کی طرح دفن کرنا گناہ تھا۔ ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور خاموشی سے لاش کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

ان لوگوں کو علم بھی نہ ہوا کہ یہ ایک ماہر تعمیرات کی لاش تھی جو زمین پر خوب صورت اور بلند والا عمارتوں کے نقشے بناتا تھا۔ گمراہ زمین پر اب اس کا اپنا کوئی نقش نہیں تھا۔ وہ بے نشان ہو چکا تھا۔ اس کا نام بھی فنا ہو چکا تھا اور وہ خود بھی حد سے زیادہ مغرور بن جانے والوں کا شاید یہی حشر ہوتا ہے۔



تابوت

شہاب شاخ

ایک آواز سنائی دی مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، تم جیسے عامل کا یہی انجام ہوتا ہے، تم جیسے نام نہاد جھوٹے مکار عامل، لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے ڈھونگ رچا کر عمل کا سہارا لیتے ہیں، اور پھر عیش پرست بن جاتے ہیں۔

ایک نایابہ قوت کی عبرتاک داستان، جسے پڑھنے والے خوشی سے عیش کرنا نہیں گے

”یہ گھر تو تمہاری پسند کا ہے نا؟“ میں نے اپنی بیوی ماروتی سے پوچھا جو کہ گزشتہ تین ماہ سے گھر کی تبدیلی کا وادیا چار رہی تھی۔ میرے سوال پر اس نے میری طرف دیکھا اور حسب عادت خشک لہجہ میں بولی۔

”ہاں بس ٹھیک ہی ہے گزرا ہوا جائے گا۔“ میں نے تو تم سے پہلے اس گھر کو ایک نظر دیکھ لو لیکن تم نے ہی

انکار کر دیا تھا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نے پسند کر لیا ہے تو مجھے بھی پسند آجائے گا لیکن بات وہی ہے کہ آج تک ہمارا مزاج مل ہی نہیں سکا تو کیا کیا جاسکتا ہے۔“ اس کا لہجہ حسب عادت تلخ ہو گیا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو کسی حال میں خوش نہیں رہتی تھی۔ میں رات دن اس کی خاطر محنت کرتا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا لیکن ہر وقت اس کا مزاج بگڑا ہی رہتا تھا۔ ہماری شادی کو چھ سال ہو چکے تھے، ہمارے دو بچے شکستہ اور ابے تھے۔ ماروٹی جب شادی کے بعد میرے گھر آئی تو تب ہی سے اس کا مزاج اچھا نہیں تھا۔ میں سوچتا تھا کہ بچے ہو جائیں گے تو وہ ٹھیک ہو جائے گی لیکن بچوں کے بعد تو اس کا مزاج مزید تلخ ہو گیا تھا۔ میں ہمیشہ درگزر کرتا تھا کیونکہ میں گھر کو آباد رکھنا چاہتا تھا۔

میں ماروٹی کی بات پر کچھ نہ بولا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا اور لان کا جائزہ لینے لگا جہاں کافی خود رو گھاس تھی، میں نے سوچا کہ آج تو تھک گیا ہوں کل اسے کاٹ دوں گا۔

☆.....☆.....☆

ہمیں نئے گھر میں آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس دوران صرف یہ ہوا تھا کہ رات کے وقت ہمارے اسٹور سے سکینوں جیسی آوازیں آتی تھیں۔ اتفاق یہ تھا کہ یہ آوازیں صرف میں نے سنی تھیں۔ میں آرکیٹیکٹ تھا اور رات دیر تک اپنے روم میں کام کرتا رہتا تھا۔ اسٹور روم اس کے قریب ہی تھا رات تین بجے کے قریب سکینوں کی آوازیں آتی تھیں اور جب میں اسٹور میں پہنچتا تو وہاں کوئی نہیں ہوتا اور میری موجودگی میں آوازیں بھی نہیں آتی تھیں۔ میں اس حوالے سے یوں پریشان تھا کہ اگر کسی رات ماروٹی نے یہ آوازیں سن لیں تو میرے لئے نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ فوراً یہ مکان چھوڑنا چاہے گی اور ایک بار پھر مجھے نئے مکان کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑے گا۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ماروٹی بچوں کو لے کر اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میں گھر پر اکیلا تھا اور لان میں بیٹھا چائے پینے کے ساتھ ساتھ ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

اچانک اسٹور کی طرف سے کسی عورت کے رونے کی آواز آنے لگی۔ میں چونک کر اٹھا اور تیز بہر قدموں سے اس جانب چل پڑا۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے اسٹور کا دروازہ کھولا، اندر نیم تاریکی تھی۔ ایک کونے میں کوئی عورت کھڑی تھی جو زیادہ تاریکی میں ٹپٹپ اور ہولے کی صورت میں مجھے نظر آ رہی تھی۔ ”کون ہو تم؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں تمہاری مدد چاہتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”میری مدد؟..... لیکن تم ہو کون؟“ میں نے پوچھا۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ یہ کوئی ماورائی معاملہ ہے۔

”یہاں میرے پاس آ جاؤ، تمہیں سب بتا دیتی ہوں۔“ وہ بولی۔

میں اس کی بات سے ذرا پریشان ہوا کہ آخر وہ مجھے اپنے آپ پاس کیوں بلارہی ہے، کہیں مجھے نقصان تو نہیں پہنچانا چاہتی؟ بے شمار دوسے اور خیالات میرے ذہن میں تیزی سے گردش کر رہے تھے، میں نے اس سے کہا۔ ”تم میرے پاس آ جاؤ۔“

”میں یہاں سے دو چار قدم سے زیادہ نہیں چل سکتی، تم یہاں آ جاؤ، گھبراؤ نہیں، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“ اس نے یقین دلایا۔

میں نے سوچا کہ اگر میں اس کے پاس نہ گیا تو بعد میں نہ جانے وہ کیا کچھ کرے اور کہیں یہ معاملہ ماروٹی تک نہ پہنچ جائے، ویسے بھی میں بہادر شخص تھا، موت سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔

میں محتاط انداز میں چلتا ہوا اس سے ذرا فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے،

تم کون ہو؟“

”میرا نام راکیشوری ہے، مجھے ظلم کی بھٹی میں ڈال دیا گیا ہے، تم اگر چاہو تو میری مدد کر سکتے ہو اور اگر نہ چاہو تو تمہاری مرضی، میں اصرار نہیں کروں گی۔“ اس کا لہجہ مظلومیت سے بھر پور تھا۔ میرا خوف دور ہوا اور دل میں اس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوا لیکن پھر بھی میں پوری طرح محتاط تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہاری حیثیت کیا ہے اس وقت، یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم انسان نہیں ہو؟“

”میں انسان ہی ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”لیکن..... تم یہاں کیسے رہ رہی ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”تمہارا اندازہ تو درست ہے کہ میں اس وقت انسانی شکل میں نہیں ہوں، یہ میری آتما ہے میرا جسم تو کہیں اور قید ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ..... وہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ابوالہول کے جسم کے قریب۔“ اس نے جواب دیا۔

”ابوالہول؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن وہ تو مصر میں ہے؟“

”ہاں، وہیں میرا جسم قید ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ..... لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا گا کیونکہ میں مصر نہیں جاسکتا۔“ میں نے معذرت کی۔

”کیا وجہ ہے کہ تم وہاں نہیں جاسکتے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں ایک کمپنی میں ملازم ہوں اور پھر میں تنخواہ دار آدمی ہوں، اس تنخواہ سے اپنے گھر کا خرچ چلاتا ہوں، بال بچوں کی ذمہ داریاں ہیں مجھ پر۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر تمہارے یہ مسئلہ حل ہو جائیں تو کیا تم میری مدد کرو گے؟“ وہ بولی۔

”کیا مطلب.....؟“ کس طرح ہوں گے۔ یہ

مسئلہ حل؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر تمہیں ایک کروڑ روپے مل جائیں تو کیا تم ان تمام مسائل سے آزاد ہو جاؤ گے؟“ اس نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”ایک کروڑ؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں..... کیا اتنے میں تمہارے سارے مسائل حل نہیں ہو جائیں گے؟“ وہ بولی۔

”لیکن..... یہ ایک کروڑ کون دے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں دوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم؟“

”ہاں۔“

”لیکن کیسے؟“

”کیسے دینے ہیں یہ میرا کام، تم یہ بتاؤ کہ اگر یہ رقم تمہیں مل جائے تو کیا تم میری مدد کرنے پر راضی ہو؟“

ایک کروڑ بڑی رقم تھی، میں تو اس سے بڑا کاروبار بھی کر سکتا تھا، اتنی رقم سے تو میں بلڈر بھی بن سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ روح صحیح کہہ رہی ہے تو میں امیر ہو کر ایک اچھی زندگی گزار سکتا ہوں اور اگر اس کے کچھ غلط ارادے ہیں تو پھر یہ کسی نہ کسی طرح مجھ سے پورے کروا سکتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”مجھے کس طرح تمہاری مدد کرنی ہوگی؟“

”ابوالہول کے جسم کے پاس میرا تابوت دفن ہے، اسے نکالنا ہوگا وہاں سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہ کام تم کسی اور سے بھی تو لے سکتی ہو؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، اگر تم نہ کرنا چاہو تو تمہاری مرضی ہے لیکن پھر یہ گھر تمہیں چھوڑنا پڑے گا، ہو سکتا ہے کہ تمہارے بعد آنے والوں میں سے کوئی میری مدد کر سکے۔ تم سے پہلے جو بھی کرائے دار یہاں آ کر

رہے، میں ان سے بھی مدد چاہتی تھی لیکن وہ لوگ مجھ سے بات نہ کر پائے اور میری سسکیاں سن کر ہی یہاں سے چلے گئے، تم پہلے آدی ہو جس نے مجھ سے بات کرنے کی ہمت کی ہے، اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میری زندگی کو کتنا خطرہ ہوگا؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”بالکل بھی نہیں، بس ایک منتر میں تمہیں بتا دوں گی جو پڑھ کر تم نے تابوت کھولنا ہے اور اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا بس یہی کچھ کرنا ہے یا کچھ اور بھی ہے؟“ میں نے احتیاطاً پوچھا۔

”اور کچھ بھی نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ میں نے سوچا کہ کیا کیا جائے؟ ایک کروڑ روپیہ میری زندگی بدل سکتا تھا، کام بھی کچھ خاص مشکل نہیں تھا۔

”تم چاہو تو آرام سے سوچ کر جواب دے دینا۔“ وہ روتی ہوئی۔

”ٹھیک ہے، میں کل تمہیں اس وقت جواب دے دوں گا۔“ میں نے اس کی طرف سے مہلت مل جانے پر مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ وہ بولی۔

میں اسٹور سے نکلنے کے بعد واپس لان میں آ کر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن اس روح میں الجھا ہوا تھا۔ اگلے روز تک میں نے خوب سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ یہ ایک کروڑ روپیہ کمانے کا موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہئے۔ یہ رقم میرے اور میرے بچوں کے شاندار مستقبل کی ضمانت تھی۔

میں وقت مقرر پر اسٹور میں پہنچ گیا روح اپنی سابقہ جگہ پر موجود تھی۔ ”کیا سوچا تم نے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”میں نے تمہارا کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے۔“ وہ بولی۔ ”کل تمہیں تمہاری رقم مل جائے گی۔ ایک بوڑھا آدمی تمہیں یہ رقم دے جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”رقم دینے کے بعد میں تمہیں بتاؤں گی کہ میرے لئے تم نے کیسے کام کرنا ہے۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”بس اب تم جاؤ۔“ اس نے جانے کا اشارہ کیا اور میں پلٹ کر واپس آ گیا۔

میں لان میں آ کر بیٹھ گیا۔ ماروتی دس دن کے لئے گئی تھی اس لئے میں اس کی طرف سے بے فکر تھا۔ اگلے روز صبح گیارہ بجے میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ میں اٹھ کر مین گیٹ پر آیا، اسے کھولا تو میں نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک کالا بریف کیس تھا۔

”آپ ہی شام بالو ہیں؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ آپ کی رقم۔“ اس نے بریف کیس مجھے دیا اور مزید کوئی بات کہنے بغیر پلٹ کر چل پڑا۔ میں تیزی سے واپس گھر آ گیا اور پھر گیٹ کا پلوٹ چڑھانے کے بعد میں نے ڈرائنگ روم میں پہنچنے میں بھی دیر نہیں کی، میں صوفے پر بیٹھ گیا اور بریف کیس میں نے سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر اسے کھول دیا۔ وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

میں نے نوٹ چیک کئے۔ ”وہ سب اصلی تھے۔“

میں نے بریف کیس اپنی الماری میں لاک کر دیا اور اسٹور میں پہنچ گیا۔ وہاں روبرج موجود تھی۔ مجھ سے بولی۔

”ہاں مل گئی۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہارا کام ہو گیا، اب میرا کام شروع ہوتا ہے۔“ وہ بولی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہیں دس دن دے رہی ہوں۔ ان دس دنوں کے اندر اندر تمہیں ابوالہول کے جیسے تک پہنچنا

ہو جائے گا۔ یہ معاملات بھی نمٹالو۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے لیکن اب تم ایسی کوئی حرکت نہ کرنا کہ جس سے میری بیوی خوف زدہ ہو جائے۔“

میں نے کہا۔

”تم بے فکر ہو۔“ اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

”میں جو کچھ بھی کرتی تھی صرف اس لئے کہ کوئی میری طرف متوجہ ہو، اب تم سے میری بات ہو گئی ہے تو مجھے اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”وہ منتر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جب تم روزانہ آنے لگو گے تو میں تمہیں بتا دوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”بس اب تم جاؤ اور اپنے معاملات دیکھو۔“ اس نے جانے کا اشارہ کیا۔

میں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ماروتی کو حقائق نہیں بتاؤں گا بلکہ اب اسے اپنے رعب میں لے لوں گا۔

میں فون کر کے شام میں ماروتی کو بلا لیا۔ اس نے آتے ہی اپنے سچ انداز میں کہا۔

”تمہیں چین نہیں ہے، ایسی کیا آفت آ گئی ہے کہ مجھے یہاں فوراً بلا لیا ہے۔“

”زیادہ کب تک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر تکی سے کہا تو حیرت اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے مجھ سے ایسے رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ غصے سے بولی۔

”یہ کس انداز میں بات کر رہے ہو تم؟“

”تمہاری اوقات کے مطابق اسی انداز میں بات کرنی چاہئے مجھے تم سے۔“ میں نے جارحانہ انداز برقرار رکھا۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔“ اس نے ہاتھ دکھاتے ہوئے غصے سے کہا۔ اسی وقت میرا ہاتھ گھوما، اس کے گال پر لگنے والے چائے کی آواز کافی زوردار تھی۔ میں نے کہا۔

”میں نے کہا۔“

”میں نے کہا۔“

”تم کیا توڑ دو گی میرا منہ، میں پہلے توڑ دیتا ہوں۔“ وہ کچھ سہم گئی تھی اور پھر اس نے عورت کی فطرت کے مطابق رونا شروع کر دیا۔

”کیوں روتی ہو؟“ میں نے تکی سے پوچھا۔

”تم نے اب مجھے مارنا بھی شروع کر دیا ہے۔“

اس نے مفادماندہ انداز میں احتجاج کیا۔

”میں تمہاری ہڈی پلٹی بھی توڑ سکتا ہوں۔ لیکن نہیں، میں ایسا نہیں کروں گا تم میری تپتی ہو، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور سینے سے لگا لیا۔ وہ سکستے لگی۔ میں نے اسے پیار کیا۔ اس نے شکست تسلیم کر لی۔ میں نے اسے صوفے پر بٹھا لیا اور بولا۔

”دیکھو! میں تمہارے لئے ایک گھر خرید رہا ہوں۔“

”کیا؟“ اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

”لیکن..... پیسے کہاں سے آئیں گے؟“ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔

”میں نے ایک بڑی کمپنی کے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے۔ میرے پاس عمارتیں بنانے کا تجربہ ہے، اس کے پاس پیسہ ہے، ہم دونوں مل کر کام کریں گے، وہ مجھے کچھ رقم ایڈوانس بھی دے رہے ہیں تاکہ میں تمام جھنجھٹ سے آزاد ہو کر اس کے ساتھ کام کروں۔“

”اوہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں، اس کے ساتھ مجھے غیر ملکی دوروں پر بھی جانا ہے، میں اپنے کاغذات وغیرہ تیار کرواؤں گا، اس دوران تم اپنی مرضی کا کوئی مکان دیکھ لو جو بیس لاکھ تک کا ہو۔“ میں نے کہا۔

”بس لاکھ۔“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں۔“ میں مسکرایا۔ ”جب قسمت کی دیوی

دار Digest [163] January 2013

دار Digest [162] January 2013

مہربان ہوتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“
”اوہ..... تم کتنے اچھے ہو۔“ وہ مجھ سے پلٹ گئی۔

”یہ مجھے آج پہ پہلا ہے کہ میں اتنا اچھا ہوں۔“
میں نے دھیرے سے ہنس کر اسے پلٹاتے ہوئے کہا۔
”مجھے معاف کر دو، میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش آتی رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”چلو معاف کر دیا۔“ میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر خوشی سے مجھے دیکھا اور پھر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ اور میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

☆.....☆.....☆
میں نے اپنی تیاریاں مکمل کیں۔ ماروتی مکان تلاش کر رہی تھی اس لئے اسے اس کی ماں کے گھر بھیجا اور اسٹور میں پہنچ گیا۔ روح وہاں موجود تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں نے اپنی تیاریاں مکمل کر لی ہیں، اب مجھے وہ منتر بتادو اور یہ بھی بتادو کہ وہ تابوت کس جگہ پر ہے؟“

اس نے مجھے ایک چھوٹا سا منتر بتایا۔ اس کے الفاظ میں نے آسانی سے یاد کر کے اسے سنا۔
”بس یہ منتر تین مرتبہ تمہیں پڑھنا ہے اور جب تم یہ منتر پڑھو گے تو تمہارے اطراف میں ایسا اندھیرا چھا جائے گا کہ تمہیں کوئی دیکھ نہیں سکے گا، تم سکون سے اپنا کام کرنا اور وہاں سے چلے جانا، اس تمام کارروائی کے دوران وہی بوڑھا شخص تمہارے ساتھ ہوگا جس نے تمہیں رقم دی تھی۔“ وہ بولی۔

”تو کیا میں اسے بھی ساتھ لے کر جاؤں؟“
میں نے پوچھا۔
”نہیں وہ تمہیں وہاں مل جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔
”تم جب قاہرہ پہنچو گے تو وہاں اس بوڑھے سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی، وہ تمہیں ہوٹل میں

ٹھہرائے گا اور تمہارے ساتھ ساتھ رہے گا۔“ اس نے بتایا۔
”یہ تو اچھا ہے گا۔“ میں نے کہا۔

”اس کے علاوہ دیگر ہدایات اور ضروری باتیں وہ تمہیں بتا دے گا۔“ وہ بولی۔
”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔
”بس اب تم جاؤ۔“ اس نے جانے کا اشارہ کیا۔ اور میں پلٹ کر چل پڑا۔

☆.....☆.....☆
میں قاہرہ کے ایئر پورٹ سے باہر آیا تو میری نگاہیں اس بوڑھے کو تلاش کر رہی تھیں اور پھر جلد ہی مجھے نظر آ گیا۔ وہ لوگوں کے درمیان سے تیزی کے ساتھ نکلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“ اس نے ادب سے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔“ میں نے جواب دیا۔
”آئیے اس طرف آ جائیں۔“ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ ہم دونوں چل پڑے۔

کچھ دیر بعد ہم پارکنگ میں آ گئے۔ یہاں کافی کاریں کھڑی تھیں۔ ہم ایک بلیک کاری کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے کار چلا دی۔ مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد کار ایک کثیر المنزل ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں آ کر رک گئی۔
”آئیے جناب!“ بوڑھے نے مجھ سے کہا۔

”ہم کار سے اترنے کے بعد ہوٹل کے اندر آ گئے۔ بوڑھے نے ریسپشن سے چابی لی اور پھر ہم لفٹ کے ذریعے دوسری منزل کے ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ شان دار کمرہ تھا۔ آسائش کی باقی چیزیں یہاں موجود تھیں۔ دو بیڈ میز کمرے کے وسط میں موجود تھے۔ ہم ایک طرف صوفوں پر آسنے سانسے بیٹھ گئے۔

”کھانے کا وقت ہو رہا ہے، کھانا منگوالیا جائے؟“ بوڑھے نے مجھ سے کہا۔
”مجھے ابھی بھوک نہیں ہے، تم اپنے لئے منگوالو۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں کھا چکا ہوں۔“ وہ بولا۔

”او، تو پھر رہنے دو، میں تو ابھی صرف کولڈ ڈرنک لوں گا کیونکہ موسم گرم ہے اس علاقے کا۔“ میں نے کہا۔ ہوٹل کے کمرے میں اسی چل رہا تھا۔
”میں ابھی منگواتا ہوں۔“ وہ بولا اور اٹھ کر انٹر کام پر آؤر ردینے کے بعد واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔
”کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا۔
”گوپال۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارا راکیشوری سے کیا رشتہ ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا اور تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے ان کے معاملات میں دلچسپی نہیں لینی چاہئے۔
”وہ بیٹی ہے میری۔“ اس نے جواب دیا تو مجھے حیرت ہوئی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔
”بیٹی؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
”ناظران بیٹی، اپنے کئے کی سزا بھگت رہی ہے۔“
”اوہ..... کیا تم مجھے اس سلسلے میں کچھ بتانا پسند کرو گے؟“ میں نے کہا۔

اس نے بس انداز میں ایک سر ڈاہ بھری اور بولا۔
”میں اسے منع کرتا تھا کہ کسی جاپ عمل اور جادو ٹونے کے چکر میں نہ پڑے لیکن وہ مجھ سے چھپ چھپ کر سیکھتی رہی اور کسی عامل نے اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر لیا، وہ مصر میں ہے کہہ کر آئی تھی کہ اہرام مصر دیکھئے اور ان پر کچھ ریسرچ کرنی ہے لیکن پھر یہ کہانی کھلی کہ جس عامل سے وہ عملیات سیکھ رہی تھی اس نے اسے عمل میں استعمال کر لیا اور یہ اس حال کو پہنچی۔“
”یہ تو افسوسناک صورتحال ہے۔“ میں نے کہا۔
”میں ایک ارب پتی آدمی ہوں، زیادہ تر ملک سے باہر رہتا ہوں، میرا بڑا بزنس ہے، راکیشوری کی ماں بوڑھی ہے، راکیشوری اس کی ایک نہیں سستی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”یہ جو کام تم مجھ سے لے رہے ہو، یہ تو کسی اور سے بھی لے سکتے تھے؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ

نگاہوں سے دیکھا۔

”راکیشوری سے میں نے کہا تھا کہ میں کسی سے بات کرتا ہوں لیکن اس نے بتایا کہ کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ وہ خود ہی جس سے بات کرے گی وہی شخص یہ کام کر سکتا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا تو یہ بات ہے؟“ میں نے کہا۔
”یہ عملیات اور جادو ٹونے کی دنیا ایسی ہی ہے، اس میں عجیب و غریب صورت حال ہے اور عجیب و غریب شرائط ہوتی ہیں۔“ وہ گال کھجاتے ہوئے بولا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ویٹر اندر آنے کے بعد ہمارا آرڈر رینیزل ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ ہم کولڈ ڈرنک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”وہاں ابوالہول کے مجسمے کے پاس جا کر کب کام کرنا ہے؟“ میں نے گوپال سے پوچھا۔
”کل چلیں گے دن میں۔“ اس نے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
”اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔“ یہ مصر بھی سحر و اسرار کی وجہ سے بڑی عجیب و غریب اور حیرت ناک سرزمین رہی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ابوالہول کے بارے میں بھی میں نے سنا ہے کہ اس کی اپنی کوئی حیرت ناک تاریخ ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
”ابوالہول کا لفظی مطلب ہے ”خوف کا باپ“ یہ عربی کا تلفظ ہے۔ اس سے پہلے اس کا نام بھلیت تھا۔ شروع میں اس مجسمے کا پورا ڈھڑ ریت میں دبا ہوا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بت کوئی طلسم ہے۔ اگر بڑی میں اسے SPHINX کہتے ہیں۔ یہ لفظ یونانی سے آیا ہے۔ اس سے مراد ایک پراسرار عفریت ہے جس کا سر اور سینہ نسوانی تھا۔“

”تمہیں اس کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔
”ہاں، اس طرح کا انکیر معلومات رکھنا میرا

شوق ہے۔“ وہ بولا۔ ”ابوالہول کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے اسے فرعون خاثر نے تیار کروایا تھا جبکہ بادشاہ ایڈیپس سے بھی اس کا تعلق کچھ یوں جوڑا جاتا ہے کہ ایڈیپس کی داستان کے مطابق ابوالہول دیوتاؤں کی تخریبی قوتوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ وہ ہر کسی سے یہ پہلی پوچھتا تھا کہ وہ کون ہے جو صبح چار ناگوں پر چلتا ہے دوپہر دو ناگوں پر اور شام کو تین ناگوں پر؟ جو اس پہلی کو نہیں بوجھ سکتا تھا وہ اسے ہلاک کر ڈالتا تھا۔ آخر ایڈیپس نے یہ پہلی بوجھ لی اس پر اسٹیکس نے، خود کشی کر لی اور ایڈیپس بادشاہ بن گیا۔“

”بہت خوب، تم نے میری معلومات میں بہترین اضافہ کیا، کیا تم اس کے بارے میں مزید بھی کچھ جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بالکل۔“ وہ بولا۔ ”غزہ کے صحرائیں واقع یہ دیوبہکل مجسمہ ہزاروں سال سے دھرتی کے سینے پر پنچے گاڑے کھڑا ہے۔ عہد قدیم میں لفظ ابوالہول کا اطلاق اس مجسمے کے سر پر ہوتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں اس کا پورا دھڑ ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بت ایک ظلم ہے جو وادی نیل کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کی لمبائی 189 فٹ اور اونچائی 65 فٹ ہے، یہ چونے کے پتھر کی پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس میں رنگ استعمال کئے گئے تھے۔ اس مجسمے کو بنے ہزاروں سال بیت چکے ہیں لیکن یہ رنگ ابھی بھی نظر آتے ہیں۔ اس کے اگلے دو بچوں کے درمیان پتھر کا ایک کتبہ موجود ہے جس کے مطابق فرعون ٹھمبوسس پنجم نے 1420 قبل مسیح تک حکومت کی تھی۔ وہاں اس فرعون کی جوانی کا ایک قصہ بھی درج ہے۔“

”بہت خوب، تمہاری بڑی معلومات ہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اسی وقت اس کے موبائل فون کی بیل بجی اور اس نے جب سے فون نکال کر اس کے اسکرین پر نظر ڈالی اور مجھ سے معذرت کرتا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اور میں راکیشوری کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆.....☆.....☆

ہم کار کے ذریعے ابوالہول کے مجسمے کے سامنے پہنچ گئے۔ ”یہ دیکھو کسی شان سے کھڑا ہے یہ ابوالہول کا مجسمہ۔ گوپال نے ابوالہول کے مجسمے کی جانب اشارہ کر کے بڑے تعریفی انداز میں کہا۔

”ہاں واقعی، یہ شان دار ہے۔“ میں نے مجسمے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”بڑی شان ہے اس کی۔“ گوپال کی نگاہیں اس مجسمے پر تھیں۔ اس کے لہجے اور انداز میں بڑی عقیدت تھی جس پر مجھے کچھ تعجب بھی تھا۔

”اب کیا کرتا ہے، وہ تابوت کس جگہ ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہاں، تابوت۔“ وہ چونک کر خیالوں سے باہر آیا۔ پھر ایک جانب اشارہ کیا۔ ”وہ اس طرف ہے۔“

”چلو تو پھر جلدی سے اپنا کام نمٹالیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ضرور۔“ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔ پھر وہ سنبھلا۔

”ہمیں جلد از جلد اپنا کام نمٹنا کر یہاں سے جانا چاہئے تاکہ میری بیٹی کو آزادی مل سکے۔“ اس نے قدم بڑھائے۔ ”آؤ وہ تابوت نکالتے ہیں۔“ میں بھی چل پڑا۔ ہم ایک جگہ پہنچ کر رک گئے۔ اس نے زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”وہ تابوت اس جگہ ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں کار میں سے سامان لاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور کار کی طرف قدم بڑھا دیے۔

ڈرائیور کار سے اتر کر کار کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا ”ڈیگ، کھولو سامان نکالنا ہے۔“

ہمارے اطراف میں اندھیرا چھا گیا۔ لیکن یہ اندھیرا کافی دور تھا۔ میں راکیشوری کا منتر بھی پڑھ رہا تھا۔

میں نے کچھ محنت مشقت کے بعد زمین میں سے تابوت نکال لیا۔ پھر لوہے کے ایک چھپے راڈ کی مدد سے تابوت کے ڈھکنے کی کیلیں اکھاڑ کر ڈھکنا ایک طرف رکھ دیا۔ اس میں کالے کفن میں لپیٹی کوئی لاش تھی۔ میں نے گوپال کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”لوہیرا کام تو ختم ہو گیا۔“

”تمہارا کام تو اب شروع ہوا ہے۔“ گوپال نے بڑی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے کہا۔ اس کے انداز پر میں چونک کر بولا۔

”کیا مطلب؟“

”دراصل اس تابوت میں تم نے لیٹا ہے۔“

اس نے تابوت کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“ مجھے کچھ گھبراہٹ ہوئی۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پراسرار مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر موجود تھی۔

”میں کچھ سمجھا نہیں؟“ میں نے کہا۔

”تم نے پانچ سال پہلے عملیات کئے تھے نا؟“

وہ بولا۔ ”مجھے یاد آ گیا کہ اس وقت مجھے عملیات

سیکھنے کا شوق ہوا تھا اور کچھ عملیات میں نے کئے تھے لیکن پھر دل اچاٹ ہونے کی وجہ سے اس طرف سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے اس کی بات پر کہا۔

”ہاں کتنے تھے۔“

”وہ جو قبرستان والا چلے تم نے کاٹا تھا، وہ غلط ہو گیا تھا، ہم وہی آتما نہیں ہیں جنہیں تم نے قید کرنے کے لئے وہ عملیات کئے تھے۔ تم انہیں بھول گئے لیکن ان کی وجہ سے ہم تکلیف میں آ گئے، ہم ادھر کے رہے اور

نوادھر کے بس اب ہماری کتہ کی کتہ ایک صورت تھی کہ اس تابوت میں تمہیں دفن کر دیا جائے۔ دراصل جو عمل تم نے کیا وہ بیسویں مصر کے جادو گروں کا ہے اس لئے تمہیں یہاں لانا ضروری تھا اور پھر یہ اب کچھ پانچ سال

گزرنے کے بعد ہی ممکن تھا اس لئے تمہارے ساتھ یہ کھیل کھیل گیا۔ تم سے جو منتر پڑھوایا گیا وہ بھی خاص تھا جس سے اب تمہارے مرنے کے بعد ہماری ساری تکلیفیں ختم ہو جائیں گی، ہم آزاد ہو جائیں گے، ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، اس عمل کا یہی طریقہ ہے کہ اگر عامل کامیاب ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ آتما میں اسے اس تابوت میں دفنانے کی کوشش کرتی ہیں، یہ جو اس کالے کفن میں لاش ہے، یہ بھی تم جیسے کسی عامل کی ہے جسے ہم جیسی آتماؤں نے دفنایا ہوگا، ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔“ اس کے فلک شکاف قہقہے بلند ہو رہے تھے اور میرا سر چکرا رہا تھا۔ وہ لاش کو کفن سے آزاد کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے سڑی ہوئی لاش کفن سے نکال کر ایک طرف ڈال دی اور اپنے پہلو سے ایک چمکتا ہوا خنجر نکال کر اسے لہراتے ہوئے خونخوار انداز میں بولا۔ ”یہ خنجر سیدھا تمہارے دل میں اترے گا۔“

”مم۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔“ خوف کی وجہ سے میں بے اختیار بولا۔

”ہا ہا ہا۔“ اس نے فلک شکاف قہقہہ لگایا اور خنجر کھینچ کر مجھے مارا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ موت یقینی تھی لیکن پھر یہ یقین بے یقینی میں بدل گیا کیونکہ مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی اس خنجر کو کسی نے پکڑ لیا تھا۔ میں نے اس شخص کے چہرے کی طرف دیکھا جو

نہ جانے کس وقت اور کہاں سے نمودار ہو گیا تھا۔ وہ تو کوئی فقیر دکھائی دے رہا تھا۔ گوپال نے خون خوار انداز میں اس سے کہا۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“

”وہی جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔“ فقیر نے اطمینان سے جواب دیا۔

”ہم تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔“ گوپال آگ بگولا ہو کر بولا۔

”خاموش؟“ فقیر نے ہاتھ بلند کر کے جلال کے ساتھ کہا۔ ”اللہ والوں سے کراتا ہے۔“ پھر فقیر نے زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔

زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔

زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔

زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔

زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔

زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔

زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔

زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔



نقشہ

نظارت نھر - فیصل آباد

اماوس کی اندھیری راتیں شروع ہو چکی تھیں۔ اچانک اندھیرے کا سینہ چیرتی ایک خوفناک شکل عورت سامنے آگئی اس کی آنکھوں سے حقیقت میں مانند چنگاری شعاعیں نکل رہی تھیں کہ چشم زدن میں.....

کلام الہی بہت زیادہ پرتا شیر ہوتی ہے جس کا حقیقی مشاہدہ اس کہانی میں موجود ہے

سلیم کی سانس پھولی ہوئی اور چہرہ

جوش کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اسے دو جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ تیز تیز قدم اٹھاتا کبھی وہ بھاگنے لگتا اور کبھی پھر سے تیز چلنے لگتا۔ اس کا اندازہ دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ آسانی سے لگا سکتا تھا کہ اسے کسی جگہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس کا رخ ایک گراؤنڈ کی طرف تھا چند منٹ میں وہ گراؤنڈ میں

گوپال کو آگ لگ گئی۔ وہ جل کر بھسم ہو گیا پھر فقیر نے ڈرائیور کا بھی یہی حشر کیا۔

”بابا تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔

”جاؤ، اب تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔“ فقیر نے میرے شانے پر شفقت سے ہاتھ مارا۔ اس دوران اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ ”جاؤ اب کار لے جاؤ۔“ اس نے کار کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے بلا سوچے سمجھے چند قدم کار کی طرف بڑھائے پھر یہ سوچ کر پلٹا کہ فقیر کو بھی کار میں ہی ساتھ چلنے کا کہوں لیکن اس کا تو دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

میں نے چند لمحوں سوچا اور پھر کار کی طرف چل پڑا۔ راستہ مجھے یاد تھا اسی لمحے میں ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں سے اپنی اگلی صبح کی فلائٹ کنفرم کی اور پھر اگلے روز اس فلائٹ سے واپس وطن روانہ ہو گیا۔

میں گھر میں داخل ہوا تو ماروٹی تڑپ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اور روتے سکتے ہوئے بار بار کہنے لگی۔ ”آپ خیریت سے ہیں ناں۔ آپ خیریت سے ہیں ناں۔“

”ارے خیریت سے ہوں تب ہی تو تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیوں اتنا پیار جتا رہی ہو؟“

”میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔“ وہ میرے سینے پر سر کر رہی تھی۔

”اچھا چلو، وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے اندر تو جا کر بیٹھو۔“ میں نے پیار سے کہا۔

”وہ مجھ سے الگ ہو گئی لیکن اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا، ہم دونوں ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے وہ میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔“ یہاں تو عجیب ہی کہانی ہو گئی تھی۔ ”وہ بولی۔“

”عجیب کہانی؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”میں دروازے پر کھڑی پڑوسنوں سے باتیں کر رہی تھی کہ ایک فقیر بابا ہمارے سامنے سے گزرے۔ ہمارے گھر کی طرف دیکھ کر مجھ سے بولے۔ ”میرے گودام میں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔“ میں نے حیرت سے

کہا۔ ”کون ہے بابا؟“

بولے۔ ”آؤ دکھاؤں۔“ میں ان کے ساتھ اسٹور میں آئی۔ وہاں انہوں نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو ایک آتما نکل آئی، فقیر بابا نے اسے جلا کر بھسم کر دیا۔ پھر مجھے بتایا کہ ”آپ کی جان کو بھی خطرہ ہے“ لیکن انہوں نے تسلی دی کہ ”سب خیر ہوگا۔ میں نے ان سے التجا کی کہ آپ کو ہر خطرے سے نکال دیں۔“ انہوں نے تسلی دی اور چلے گئے، میں پریشان تھی، آپ کا سیل نمبر بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ آپ کہاں ہیں، سارے ہی خاندان والے پریشان تھے، اپنے اپنے طور پر سب آپ کو ڈھونڈ رہے تھے، میں تو بس آپ کی خیریت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ کہیں فقیر بابا نے یہ بھی تو نہیں بتا دیا کہ میں نے ہی غلط عمل کر ڈالے تھے۔ میں نے ماروٹی سے پوچھا۔ ”اور کچھ بھی کہا فقیر بابا نے؟“

”نہیں بس اتنی ہی بات ہوئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

میں مطمئن ہو کر بولا۔ ”مجھے تو کچھ نہیں ہوا تھا ہو سکتا ہے فقیر بابا نے میری بلائیں ہٹا دی ہوں۔“

”جی ہاں ایسا ہی ہوا ہوگا۔ آپ اب کبھی غیر ملکی دورے پر نہ جانا۔“ وہ میرے مزید قریب ہوتے ہوئے بولی۔

”اگر تم وعدہ کر دو کہ مجھ سے کبھی نہیں لڑو گی اور اسی طرح پیار کرتی رہو گی تو میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے مسکرا کر شرط رکھی۔ اس نے بڑی مصومیت سے اپنے کان پکڑ لئے اور بولی۔

”لو کان پکڑ لئے، وعدہ پکا وعدہ، اب کبھی نہیں لڑوں گی۔“

اس کی مصومیت پر مجھے پیار آ گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ وہ جتنی چلی آئی اور میں اسے سینے سے لگا کر دل ہی دل میں فقیر بابا کا شکریہ ادا کرنے لگا۔



کر کے کوئی پانچ منٹ کے بعد راشداً تادکھائی دیا۔
مارے جوش کے سلیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا وہ تیز تیز
قدم اٹھاتا قریب آ گیا۔

”کیا بات ہے بار! تم نے تو پریشان کر ڈالا ہے
ایسی کیا بات تھی کہ اتنی امیر جنری میں بلایا ہے۔“
جواباً سلیم نے اس کے گلے لگتے ہوئے تیز لہجے
میں کہا۔

”سنو گے تو پھر کڑک جاؤ گے۔ ایسی خبر ہے
میرے پاس اگر ہم نہ تھوڑی ہمت دکھائی تو تمام عمر
کے لئے عیش ہمارے ہوں گے۔“

”کیوں تو نے کیا قارون کا خزانہ دریافت کر لیا
ہے۔ جو ساری عمر کے لئے ہمارے عیش ہو جائیں
گے۔“ راشداً نے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔ سلیم نے
جوش سے کہا۔

”تو اور کیا قارون کا خزانہ ہی تلاش کیا ہے۔ بس
حاصل کرنے کی دیر ہے۔ لو وہ آ گیا اشرف بھی اسے
آنے دو پھر ایک ساتھ تم دونوں کو تمام بات بتاؤں گا۔“

دونوں ایک طرف سے گراؤنڈ میں داخل ہوتے
اشرف کو دیکھنے لگے۔ وہ قریب آیا تو دونوں باری باری
اس کے گلے لگے پھر ایک طرف نیچے گھاس پر بیٹھ گئے۔
سلیم بڑے رازداری سے آگے کو جھک کر بولا۔

”تم دونوں جانتے ہو نا کہ مجھے کتابیں اور
کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میں اس شوق کی
خاطر ملک صاحب کے گھر میں کام کرتا ہوں تاکہ فالتو
وقت میں ان کی لائبریری سی کتابیں لے کر پڑھ
سکوں۔“

دونوں لڑکوں نے بے زاری بلکہ قدرے کوفت
سے اسے دیکھا۔ ”تو تم نے ہمیں یہ بتانے کے لئے بلوایا
ہے۔ اب میرے کان کھینچے گا کہ گاہک آنے کا نام ہے اور
میں کھوکھا چھوڑ کر یہاں تیرے پاس بیٹھا کیسے ہاں کر رہا
ہوں۔“ اشرف نے غصے سے کہا۔ راشداً نے بھی اس کی
ہاں میں ہاں ملائی۔ تو سلیم کو غصہ آ گیا۔

”اتھو! پہلے میری بات تو توجہ سے سن لو۔ بعد

میں تم نے یہ سوال کرنا تھا کہ مجھے یہ معلومات کہاں سے
ملی ہیں اس لئے میں پہلے ہی تمہیں بتا رہا تھا۔“
وہ لمحے بھر کور کا۔ دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے
رہے وہ پھر بولا۔

”بس وہیں سے مجھے ایک ایسی کتاب ملی ہے جو
ہم سب کی زندگیاں پلٹ دے گی۔ ہم راتوں رات
امیر ہو جائیں گے پھر ہمیں یہ چھوٹے چھوٹے تیرے
درجے کے کام کر کے اپنے پیٹ کے اینڈر سن حاصل
نہیں کرنے پڑیں گے۔“

اس نے سسپنس پھیلائے کو تھوڑا وقفہ کیا۔ مگر
دونوں لڑکے صبر سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ سلیم
نے سلسلہ کلام پھر جوڑا۔

”کچھ دن پہلی ملک صاحب نے اپنے دادا کے
زمانے کی کتابیں بھی تہہ خانے سے نکلوا کر ایک الماری
میں لگوا دیں۔ میں انہیں پڑھنے لگا۔ پرسوں میرے
ہاتھ ایک کتاب لگی اس میں چھپا خزانے کا نقشہ بنا ہوا تھا
مگر تم جانتے تو ہو کہ میرا داغ بہت چلتا ہے میں نے وہ
نقشہ سمجھ لیا بس اب ہم مل کر وہ خزانہ نکالیں گے اور عیش
کریں گے۔“

راشد اور اشرف نے کھا جانے والی نظروں سے
اسے دیکھا ارشد نے کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ تو نے
نقشہ صحیح دیکھا اور دوسرا یہ کہ ملک صاحب کو اس کتاب کا
علم نہیں تھا؟ اور اگر تھا جو کہ ایک یقینی بات ہے تو انہوں
نے اب تک وہ خزانہ لازماً وہاں سے نکلوا لیا ہوگا۔“ سلیم
نے گھور کر اسے دیکھا۔

”میری قابلیت پر شک کرنے کے بجائے میرا
ساتھ دینے کا فیصلہ کرو۔ تمہاری پہلی بات کا جواب یہ
ہے کہ میں نقشے میں درج نشانوں کی مدد سے وہ مطلوبہ
جگہ جا کر دیکھ آیا ہوں وہاں وہ سب نشانیاں موجود
ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تم سب جانتے ہو کہ ملک
صاحب کو شراب سے لگاؤ ہے کتاب سے نہیں۔ مجھے سو
فیصد یقین ہے کہ انہوں نے یہ کتاب بالکل نہیں پڑھی۔“

پلو اگر مان لیا جائے کہ پڑھ لی ہے تو دیکھنے میں کیا حرج
ہے ہو سکتا ہے کہ ابھی بھی وہاں کچھ خزانہ موجود ہو۔ سوچو
اگر ہمیں وہاں سے تھوڑا سا سونا بھی مل جاتا ہے تو وہ آج
کے دور میں کتنے کا ہوگا۔“

اس نے خاموش ہو کر گویا انہیں سوچنے کا موقع
فراہم کیا، چند لمحے خاموش رہ کر اشرف نے کہا۔
”بات تو تیری ٹھیک ہے لیکن عقل میں نہیں سا
رہی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم کیسے خزانہ نکالنے میں
کامیاب ہوں گے گھر والوں سے کیا کہیں گے۔ اس کے
علاوہ کبھی علم نہیں ہے کہ وہاں خزانہ ہے بھی یا نہیں۔“
سلیم نے فوراً کہا۔

”دیکھو بار! اس طرح حوصلہ چھوڑ کر بیٹھنے والے
ہی ساری زندگی دوسروں کی جوتیاں سیدھی کیا کرتے
ہیں میں اکیلا بھی یہ سب کام کر سکتا ہوں۔ اور اس طرح
سارا خزانہ مجھے اکیلے کو مل سکتا تھا۔ مگر میں نے تمہاری
یاری کو دولت پر ترجیح دی۔ اب معاملہ تمہارے سامنے
ہے۔ میں تو ایک کوشش ضرور کروں گا۔ تم با اختیار ہو
ساتھ دینا چاہو تو خوش آمدید اگر نہیں تو کم از کم دوستوں کو
دھوکا دینے کا الزام مجھ پر نہیں آئے گا۔“

دونوں دوست سوچ میں پڑ گئے بات سلیم کی بھی
درست تھی وہ اکیلا بھی خزانہ حاصل کر کے امیر ہو سکتا تھا
مگر اس نے دوستوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی
تھی۔ تو اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ ان سے غلط تھا۔
دونوں نے لمحہ بھر کوشش آنے والے حالات کے بارے
میں سوچا پھر ایک ساتھ بولے۔

”ہم تیرے ساتھ ہیں لالے۔ تو جو کہہ گا کریں
گے بس اب یہ بتا کر ناکا ہے۔“

سلیم خوش ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر
ایک چھوٹی سی درخت کی خشک لکڑی اٹھائی اور آگے کو
جھک کر زمین پر نقشہ بنا کر انہیں سمجھانے لگا۔

”دیکھو یہ جو ہمارے قریبی جنگل میں تین
چھوٹی پہاڑیاں ہیں ناں، یہی ہماری منزل ہیں۔ میں
وہاں جا کر دیکھ آیا ہوں۔ پیدل آدھے گھنٹے کا سفر ہے

اور ہمیں یہ سفر پیدل ہی کرنا ہے کیونکہ رات کے وقت
وہاں کسی بھی سواری کو لے جانا خود ہمارے لئے بھی
خطرہ ہوگا۔ آدھا گھنٹہ ہمیں وہاں جانے میں لگے گا۔
آدھا گھنٹہ کام کے لئے بہت ہے۔ اور باقی واپسی
کا نام تو کل ملا کر یہ ڈیڑھ گھنٹہ بنتا ہے۔ ہم زیادہ وقت
رکھ لیتے ہیں۔ اپنے اپنے گھر سے رات دس کے بعد دو
گھنٹوں کے لئے کیسے نکلنا ہے یہ سب کو خود سوچنا ہے۔“
وہ سانس لینے کو رکھا پھر بولا۔

”اور یہ سب کام ہمیں آج کی رات ہی کرنا
ہے۔ کل کس نے دیکھی ہے۔ اور ضروری سامان بھی
میں بتا دیتا ہوں۔ کھانے کے لئے بسکٹ اور پانی ایک،
ایک نارنج، رسی، مضبوط تھیلے اور ایک ایک خنجر اور ڈنڈا۔
ظاہر ہے ہم جنگل میں جا رہے ہیں کسی سانپ یا
بھیڑیے سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ ہر بندہ اپنا
سامان خود ساتھ لائے گا۔“

ارشاد تیزی سے بولا۔
”اور خزانہ کیسے تقسیم کیا جائے گا؟“ سلیم نے
دونوں کو باری باری دیکھا پھر بولا۔

”دیکھو مال کی محبت یاروں کی یاری بھلا دیتی
ہے۔ مگر ہمیں ایسا نہیں کرنا، ہمیں ان تین دوستوں کی
مثال نہیں بننا جنہیں سونے کی اینٹ ملی تھی اور لالچ نے
انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ ہم تینوں ایک
ایک تھیلا بھریں گے اس کے بعد قرعہ اندازی ہوگی۔ ہر
ساتھی ایک ایک پرچی اٹھائے گا جس کا جو نمبر نکلے گا وہی
تھیلا اسے دے دیا جائے گا۔ بولو منظور ہے۔“
”دونوں فوراً بولے ہمیں منظور ہے۔“ اشرف
نے کہا۔

”بلکہ ہم دونوں اپنے حصے کے تھیلوں میں سے
تمہیں کچھ سونا اور بھی دیں گے کیونکہ تم نے ہی یہ سارا
پلان بنایا ہے۔“ سلیم نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے مجھے بھی منظور ہے سب دوستوں
نے خوشی سے بھرپور ہتھ بٹھک لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔
☆☆☆☆☆

Beautyl شمع بیوٹی پائلر

Price : 300/-

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک بیوٹیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پریکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تنگ و دو اور محنت شاقہ ہے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت، ہاتھ بیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مندر رہنے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دار لکتب

قدانی مارکیٹ اردو بازار لاہور

رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب وہ پہلے آپا تھا تب دن کا وقت تھا مگر اب رات کی گہری تاریکی تھی۔ وہ تینوں ایک درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ درخت کے پتے پوس بجے جیسے ان میں کوئی چھپا بیٹھا ہو اور اس نے بے چینی سے حرکت کی ہو۔

ان تینوں کے دل اچھل کر حلق میں آگئے۔ بھاگ کر وہ اس درخت کے نیچے سے نکل کر آگے چلے گئے۔ لیکن سلیم نے حوصلہ قائم رکھا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”ڈرومت کوئی بندر وغیرہ ہوگا اور زرا تیز چلو تاکہ جلد سے جلد یہاں سے نکل چلیں۔“ تینوں تیز تیز قدموں سے چلنے لگے کچھ فاصلے پر انہیں پہاڑیوں کے پہلے تاریکی میں یوں دکھائی دینے لگے جیسے کوئی بڑا دیو زمین پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہو۔ وہ تینوں غیر ارادوری طور پر ڈرے ہوئے تھے۔ اس جھے میں جنگل قدرے گھنا تھا۔ اس کے بعد صرف چھوٹی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ باقی جنگل پہاڑیوں کے بائیں جانب کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دائیں طرف کچھ دور تک درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ آگے خالی میدان نظر آتا تھا۔

جب وہ جھاڑیوں والے حصے میں داخل ہوئی تو ان کا خوف قدرے کم ہو گیا اور قدموں کی رفتار بھی کچھ مدہم ہو گئی چلتے چلتے سلیم ٹھنک کر رکا۔ وہ سب سے آگے تھا۔ اس کے رکتے ہی باقی دونوں بھی رک گئے۔ قریبی جھاڑیوں میں ہلچل ہو رہی تھی۔ سلیم نے ہاتھ میں پکڑی نارنج کارن ان جھاڑیوں کی طرف کر دیا۔ مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہلچل بھی رک گئی۔

راشد نے سرگوشی میں کہا۔

”یہ کوئی بڑا سانپ بھی ہو سکتا ہے۔ تیزی سے آگے نکل چلو اور واپسی پر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتا۔“ بات معقول تھی۔ تینوں تیزی سے چل پڑے۔ باقی کا راستہ عافیت سے کٹ گیا۔ پہلی پہاڑی کے گرد زرا سا چکر کاٹ کر وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں پہلی پہاڑی دوسری پہاڑی سے ملتی تھی۔ سلیم وہاں رک گیا۔ پہلے اس

”معاف کرنا یار! بس ضروری تیاری کرتے کرتے کچھ دیر ہو گئی۔“

اشرف نے کہا۔ ”ہم تو فکر مند ہو گئے تھے کہ پتہ نہیں تیرے ساتھ کیا معاملہ پیش آ گیا ہے کہ تو ابھی تک پہنچا ہی نہیں۔“

دونوں چل پڑے۔ راشد کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا تھیلا کھول کر اس میں سے نارنج نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔

”خیر پنڈلیوں سے باندھ لو اور ڈنڈے ہاتھوں میں پکڑ لو۔ کیونکہ اگر خدا خواستہ کچھ براہم ہوئی تو تھیلے میں سے نکالنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

سلیم نے اپنا خیر پنڈلی سے لگے چڑے کے دستے میں اڑتے ہوئے کہا۔ دونوں نے اس کی تقلید کی، پانچ منٹ کے بعد وہ تینوں بڑی خاموشی اور راز داری سے جنگل کے ابتدائی حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی سلیم نے اپنی نارنج جلائی۔ تینوں خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے جنگل میں سوکھے پتے ان کے پاؤں کے نیچے آ کر چرچراتے تو ایک عجیب سی پراسرار آواز پیدا ہوتی تھی۔ مگر وہ سب اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھے جارہے تھے۔

چلتے چلتے اشرف نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ”آج تو شاید اماؤں کی رات ہے چاند بھی نہیں نکلا ہے۔“

راشد نے آہستہ سے کہا۔

”اماؤں کی رات کی وجہ سے ہی اتنا اندھرا ہے۔ ورنہ ابھی چھ دریا جنگل ہے۔ یہاں اتنی تاریکی نہیں ہونی چاہیے تھی۔“ سلیم نے ان کا دھیان ہٹانے کو کہا۔

”اچھا ہے کہ آج اماؤں کی رات ہے۔ اس طرح ہم کسی کی نظروں میں آنے سے بچ جائیں گے۔“

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا اور تارے جگمگا رہے تھے۔ اشرف نے مقررہ جگہ پر پہنچ کر اپنے سامان والا تھیلا کندھے سے اتار کر نیچے رکھ دیا۔ اسے دوسرے دونوں ساتھیوں کا انتظار تھا۔ وہ تینوں بچپن سے ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ ایک ہی گلی میں تینوں کے گھر تھے۔ اشرف کا باپ چائے کا کھوکھا چلاتا تھا۔ پانچ جماعتیں پڑھ کے اس نے بھی اپنے باپ کا ہاتھ بنانا شروع کر دیا۔

راشد کا باپ اپنی کپڑے کی چھوٹی سی دکان چلاتا تھا۔ پانچوں کے بعد اس نے راشد کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ لیکن سلیم کے باپ کو شوق تھا کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ جائے۔ وہ ملکوں کی حویلی میں مٹی تھا۔ اسی لئے سلیم بارہویں میں پڑھ رہا تھا ساتھ ساتھ وہ شام کو ملکوں کی حویلی بھی چلا جاتا اور کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا۔ اس طرح ملک اسے بھی کچھ نہ کچھ جیب خرچ دیا کرتے تھے۔

اشرف کو وہاں کھڑے زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب اسے ایک سایہ سا اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر پتہ چلا کہ وہ راشد تھا۔ دونوں اب سلیم کا انتظار کر رہے تھے انہیں کافی دیر گزر گئی مگر سلیم نہ آیا۔ دونوں کو تشویش لاحق ہو گئی۔ اگر اس کے گھر والوں نے اسے نہیں آنے دیا تو وہ دونوں اکیلے وہاں نہیں جاسکتے تھے۔ اشرف بولا۔

”راشد یار! تو یہاں سامان کے ساتھ بیٹھ میں اس کے گھر سے پتہ کر کے آتا ہوں کہ وہ ابھی تک پہنچا کیوں نہیں ہے۔“

”جلدی آنا یار! اگر یہاں ہی دیر ہو گئی تو واپسی میں بھی دیر ہو گئی تمہیں پتہ تو ہے میرا باپ ذرا سخت طبیعت کا آدمی ہے۔ ایویں دھنک کر رکھ دے گا۔“

اشرف سر ہلا کر وہاں سے چل دیا۔ ابھی وہ اپنی گلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ اسے سلیم اپنے گھر سے نکلتا دکھائی دیا وہ وہیں رک کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ قریب آ کر سلیم نے کہا۔

نے چاروں طرف روشنی پھینک کر اردو کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر ان سے بولا۔

”یہ چٹان اپنی جگہ سے سرکانی ہے۔ اس کے نیچے راستہ ہے۔ وہاں سے ہم اس غار نما کمرے میں پہنچ جائیں گے جس میں خزانہ ہے۔“

جلدی جلدی تینوں نے ڈنڈے تھیلے ایک طرف رکھے۔ سلیم نے ٹارٹ کو ایک چھوٹے پتھر پر ایسے زاویے سے رکھ دیا جس سے روشنی اس چٹان پر پڑتی رہے۔ تینوں بل کر زور لگانے لگے مگر چٹان ان کے اندازے سے زیادہ وزنی تھی۔ لیکن اب وہ اتنی سی بات کے لئے اپنے سنہرے مستقبل سے منہ نہیں موڑ سکتے تھے۔ ارشد نے کہا۔

”میری دادی کہتی ہے کوئی بھی مشکل کام اگر درود شریف پڑھ کر کیا جائے تو آسان ہو جاتا ہے۔ آج آزما لیتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر تینوں بلند آواز سے درود شریف پڑھنے لگے۔ اور ساتھ ساتھ چٹان کو دھکیل بھی رہے تھے۔ چٹان اپنی جگہ سے سرکنے لگی۔ آدھی چٹان اپنی جگہ سے سرکا کر وہ رک گئے۔ ایکٹ کھا کر پانی پیا۔ اور پھر سے تازہ دم ہو کر زور لگانے لگے۔ چٹان کے اپنی جگہ سے ہٹنے ہی نیچے ایک بڑے سے بل کی طرح کا راستہ دکھائی دینے لگا۔ لیکن اتنے تک راستے میں اترنے کا ان کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ تینوں خاموش کھڑے تھے۔ بالآخر ارشد نے ہمت کر کے کہا۔

”پہلے میں اندر داخل ہوتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم دونوں بھاگ جانا۔“

اس کی یہ بات سن کر سلیم اور راشد جوش میں آ گئے۔ سلیم بولا۔

”نہیں میں ہی پہلے اتروں گا کیونکہ تمہیں اس راستے پر میں ہی لایا تھا۔“ کچھ دیر تینوں میں تکرار ہوتی رہی پھر طے پا گیا کہ پہلے راشد پھر اسلم اور آخر میں ارشد اترے گا۔ سلیم نے روشنی پھینکی اور راشد بل میں اترنے لگا۔ پھر سلیم خود اتر اس کے بعد ارشد بھی بل

میں اتر گیا۔ دو قدموں کے بعد دائیں طرف جاتی ایک تنگ سی سرنگ ان کے سامنے تھی۔ وہ اتنی تنگ تھی کہ انہیں رکوع کے بل اس میں چلنا پڑتا۔ سلیم نے تارچ اپنے ہاتھ میں رکھی اور راشد سے کہا۔

”ڈنڈا تیار رکھو کوئی سانپ بھی ہو سکتا ہے۔ بزرگوں سے سختے آئے ہیں کہ خزانوں پر سانپ پہرہ دینے لگتے ہیں۔“ راشد نے ڈنڈا اتار کر لیا تینوں جھکے جھکے ایک قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کوئی نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سرنگ ایک تنگ سے کمرہ نما غار میں کھل گئی۔ تینوں احتیاط سے چلتے غار میں آ گئے۔ سلیم نے تیزی سے تارچ والے ہاتھ کو حرکت دے کر گرد و پیش کا جائزہ لیا سیاہ پتھر ملی دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے جالے لٹک رہے تھے ان میں لگی جسیم کڑیاں اپنی زرد آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ایک طرف کی دیوار کے ساتھ دو بڑے پتھر کے صندوق پڑے تھے۔ غار میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

”یہی ہے خزانہ چلو جلدی سے شروع ہو جاؤ۔“ سلیم نے چپک کر کہا۔ ارشد نے آگے بڑھ کر صندوق کا دھکن ایک طرف کھکا دیا۔ صندوق میں قدیم زمانے کے سونے کے زیورات اور کئی قسموں کے جواہرات پڑے تھے۔ جن میں سے رنگ برنگی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ ابھی وہ یہ دیکھنے میں مگن ہی تھے کہ ایک زوردار گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ وہ سب خزانے کو بھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگے سب نے اپنی اپنی تارچیں روشن کر لی تھیں۔ جن کی روشنی سے وہ چھوٹا سا غار مکمل طور پر روشن ہو گیا تھا۔ انہوں نے دیکھا۔

سامنے والی دیوار پر لگے بڑے سے جالے میں لگی ایک مینڈک کے برابر مڑی نے فرش پر چھلانگ دی۔ وہ تینوں خوفزدہ ہو گئے۔ مڑی فرش پر گر گئی ہی بڑی ہونے لگی وہ دم بخود کھڑے اسے دیکھ رہے تھے خزانے کا صندوق اسی طرح کھلا پڑا تھا۔ ان میں سے کسی کی توجہ ادھر نہیں تھی۔ وہ سب بھد بھد بڑی ہونے

والی مڑی کو دیکھ رہے تھے۔ خوف سے ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ مڑی نے بڑھتے بڑھتے ایک خوفناک چڑیل کا روپ دھار لیا۔ اس کے لمبے سیاہ بال زمین کو چھو رہے تھے۔ بالکل تنگی تھی اس کی سرخ لہلہاتی زبان بالشت بھر باہر لٹکی ہوئی تھی۔

ان سب کے منہ سے چیخ نکل گئی، چڑیل نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اس کے لمبے نوکیلے دانت بہت خوفناک دکھائی دے رہے تھے۔ اس سب سے بڑھ کر کمرہ اور دہشت انگیز تھیں اس کی آنکھیں جو بالکل سفید ڈھیلے پر مشتمل تھیں اس میں پتلی سرے سے شمی ہی نہیں مگر چڑیل کو سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک اور قہقہہ لگایا پھر بولی۔

”تو سلیم میاں تم میرے چنگل میں پھنس ہی گئے میں ہر دس 10 سال بعد تین جوان لڑکوں کا خون جاتی ہوں۔ طریقہ ایک ہی ہے۔ وہی کتاب جو تمہارے ہاتھ لگی کسی نہ کسی کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ وہ انسان اپنے ساتھ کسی نہ کسی کو لے کر دوڑا چلا آتا ہے۔ انسان دپے ہی لاپٹنی مخلوق ہے۔ اس طرح میں اپنی خواہش پوری کر لیتی ہوں۔ اس مرتبہ تم میرا شکار ہو گئے مجھے خوشی ہے کہ تین لڑکے مجھے ایک ساتھ مل گئے۔“

ان تینوں کی حالت خوف سے ایسی ہو گئی جیسے ان کے بدن سے سارا ہونچوڑ لیا گیا ہو۔ ان کے بدن پر قرقر کا پ رہے تھے۔ چڑیل نے ایک اور قہقہہ لگایا اور انہیں پکڑنے کو ہاتھ بڑھیا۔ راشد سرنگ کے دہانے کے پاس کھڑا تھا۔ چڑیل کا ہاتھ بڑھتا دیکھ کر تیزی سے سرنگ میں داخل ہوا اور بھاگتا چلا گیا۔ چڑیل نے ایک اور بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اپنی زبان لٹکے ہوئے ہونٹوں پر پھیر کر بولی۔

”مت بھاگو ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ چٹان کھسک کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئی ہے تم نے آواز تو سن لی ہوگی۔“ اب تم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔ اب تمہیں میری بیویک پیاس مٹانی ہے۔

”واہ..... کیا حریدار ہوگا جوان ابلتا ہوا

خون..... اور تازہ گوشت۔“ وہ پھٹارے لے رہی تھی اور ان کی روح فنا ہو رہی تھی دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے وہ سیاہ کالی چڑیل کی طرف دیکھ رہے تھے جو کبھی لمبے میں ان کے لئے موت بننے والی تھی۔ سلیم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”اش..... اشرف! معوذتین اور آیت..... الکرسی..... پر..... پ..... پڑھو..... ورنہ..... چڑیل..... ہمیں مار ڈالے گی۔“

اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر وہ دونوں جلدی جلدی پڑھنے لگے۔ چڑیل نے اپنے ایک ایک ہاتھ سے ان دونوں کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ لیکن جیسے ہی اس کا ہاتھ ان کے بدن سے لگرایا وہ جھپٹنے لگی۔

”بند کرو پڑھنا..... ورنہ میں تمہیں بہت بری موت ماروں گی خاموش ہو جاؤ.....“ وہ چلائی رہی اسے تکلیف میں دیکھ کر ان دونوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ بلند آواز سے تلاوت کرنے لگے۔ پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ غیر ارادی طور پر وہ دونوں بھی خاموش ہو گئے۔ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ چڑیل نے اپنے ہاتھ ان کی طرف بڑھا کر جھٹکے وہ دونوں یوں زمین سے اچھلے جیسے زمین میں پتھر لگے ہوں اور اڑتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ چند لمحوں بعد وہ دھپ سے زمین پر گرے۔ ارشد چلا یا۔

”آیت الکرسی پڑھو جلدی۔“ دونوں پڑھتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا وہ جنگل کے باہر وہاں کھڑے تھے جہاں سے جنگل شروع ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد راشد بھی اسی طرح اڑتا ہوا ان کے قریب دھپ سے گرے۔ چڑیل نے کامل الہی سے خوفزدہ ہو کر ان تینوں کو اپنے غار سے نکال باہر پھینک دیا تھا۔ اتنی خوفناک شکل والی چڑیل کو دیکھ کر ان کے دل سے بھی خزانہ حاصل کرنے کا لالچ نکل گیا تھا۔ جان بچا کر پرتینوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور خاموشی سے کھر کلوث آئے۔



برندرامورتی

علی کاشف آفاقی - میرپور آزاد کشمیر

دھکتی آگ کے بھرکتے شعلے سے اچانک ایک لڑکی کا وجود برآمد ہوا، اور ہوا میں تیرتی ہوئی وہ اوپر کو اٹھی اس کے ہاتھ میں ایک ہتھیار تھا، اس نے اس ہتھیار کو گھمایا اور ہوا میں معلق بدشکل بت کا بازو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

کالی دنیا کی ناقابل یقین خوبی، ڈراؤنی، دل کو بہت کرتی لرزیدہ مزیدہ حیرت انگیز کہانی



اسے آس پاس کی کوئی خبر نہ تھی۔

اور پھر اچانک اس پر اسرار ماحول میں ایک کرخت آواز ابھری۔ ”اے بچاری! ہم نے تیری پوجا کو قبول کیا۔ جلدی کر۔ آخری بھیٹ دے تاکہ ہم تجھے تیری طاقتوں کے بارے میں بتائیں۔“ یہ آواز اس بت کے منہ سے آئی تھی جو کہ اوپر معلق تھا۔ اس آواز کا آنا تھا کہ بچاری جو آنکھیں بند کئے ہاتھ جوڑے آگ کے سامنے بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اٹھ کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور آگ کے سامنے لایا اور اچانک اسے آگ کے بڑھکتے شعلوں میں دھکیل دیا۔ مگر یہ کیا؟ اس بچاری نے جس تیزی سے لڑکی کو بڑھکتی آگ میں دھکیلا تھا۔ اس سے زیادہ تیزی سے وہ لڑکی شعلوں کے درمیان سے باہر نکلی اور ہوا میں معلق ہو گئی۔

بچاری جو اپنی پوجا کی کامیابی پر خوش تھا۔ حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ وہ لڑکی بغیر پروں والی کسی پری کی طرح بت کے اٹھوتے ہاتھ کی طرف بڑھی تھی۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں نجانے کہاں سے ایک ہتھوڑا نما ہتھیار آ گیا تھا اس سے پہلے کہ بچاری کچھ سمجھتا۔ اس حسن کی دیوی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہتھوڑا نما ہتھیار زور سے

بڑا بھیا نک منظر تھا۔ آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ جل رہا تھا۔ آگ کے شعلے کافی اوپر تک جا کر ایک کافی چوڑا تخت نما شیڈ سے ٹکرا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی آگ کا فوارہ جل رہا ہو۔ کمرے کے وسط میں تخت نما شیڈ سے آگ کے شعلے ٹکرا رہے تھے وہ ہوا میں معلق تھا اور اس پر ایک کچھ کچھ اوجھا بھیا نک شکل کا بت موجود تھا۔ بت کے سینے سے ایک بازو نکلا ہوا تھا اور اس بازو کے ساتھ دس انگلیوں والا بے ڈھنگا سا ہاتھ تھا۔ جس میں ترشول موجود تھا۔ بت کا صرف ایک ہی ہاتھ تھا۔ سائینڈ میں اور ہاتھ نہیں تھے۔ بت کا چہرہ نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ جیسے کہ وہ نیچے دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں کے عین نیچے فرش پر ایک بھیا نک شکل کا آدمی اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھوں کو بند کئے بیٹھا تھا۔ اس بھیا نک شکل آدمی کے عین سامنے آگ کے الاؤ کی دوسری طرف ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی بے سدھ پڑی تھی۔ لڑکی کیا؟ بلکہ وہ حسن کی دیوی تھی۔ اس کی رنگت اتنی صاف شفاف اور چہرے کے نقوش اتنے حسین تھے کہ آگ کے شعلے اس کے چہرے سے منعکس ہوتے نظر آ رہے تھے۔ وہ لڑکی ٹرائس کی سی کیفیت میں تھی۔ آنکھوں تو کھلی ہوئی تھیں اس کی مگر

بت کے اکلوتے ہاتھ پر دے مارا۔ اس ہتھیار کے ضرب کا پڑنا تھا کہ ایک بھایک آواز کے ساتھ اس بت کا ہاتھ بازو سے جدا ہو کر نیچے گر پڑا۔ آواز اتنی شدید تھی کہ پجاری نے سہم کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اس طویل کمرے میں کچھ لمحے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر پجاری نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور پھر جیسے حیرت سے اچھل پڑا۔

آگ کے شعلے ماند پڑ رہے تھے۔ بت کا دس انگلیوں والا بے ڈھنگا ہاتھ ترشول سمیت زمین پر پڑا تھا۔ اور اب اس لڑکی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ پجاری کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں گہری ہوئے لگیں۔

☆.....☆.....☆

بھارت کے شہر دہلی میں وہ بہت خوبصورت بنگلہ تھا۔ بنگلہ کافی رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مین گیٹ سے باہر سڑک کے دونوں اطراف درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ مین گیٹ کے اندر پختہ روش کے گرد خوبصورت پھولوں کے پودے تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کئی سایہ دار درخت اپنی بہاریں دکھلا رہے تھے۔ مین گیٹ کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ ابھی فجر کی اذانوں کا وقت نہیں ہوا تھا۔ مین گیٹ پر باوردی گارڈز کھڑے تھے۔ اس بنگلے کے تہہ خانے کے ایک وسیع وعریض کمرے میں مختلف قسم کی میٹھیں پڑی تھیں۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ دس فٹ لمبی اور پانچ فٹ چوڑی اسکرین لگی ہوئی تھی۔

کمرے میں تین افراد بیٹھے تھے۔ تینوں افراد بہترین تھری پیس سوٹوں میں بلبوس تھے۔ ان کی عمریں پچاس کے ہندسے کو عبور کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک فرد ایک بڑے کی بورڈ کو آپریٹ کر رہا تھا۔ اسکرین روشن تھی اور شیڈ پر بنے اکلوتے ہاتھ والے بت، شیڈ کے نیچے جلنے والی آگ، پجاری اور نو عمر حسین لڑکی سب نظر آ رہے تھے۔ پھر اس بت کی آواز سنائی دی۔

”پجاری! ہم نے تیری پوجا کو قبول کیا۔ جلدی کرو اور آخری بحیثیت دے تاکہ ہم تجھے تیری طاقتوں

کے بارے میں بتائیں۔“ بت کی کرخت آواز پورے کمرے میں گونجی۔

کمرے میں موجود تینوں شخص مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک جو کافی پی رہا تھا بولا۔

”ڈاکٹر جاوید! پلزی! تم اب جو کتنا ہو جاؤ۔“ ڈاکٹر جاوید وہ تھا جو کی بورڈ کو آپریٹ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر جاوید نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کرو ڈاکٹر ریمز! میں بالکل چوکنا ہوں۔“

تیسرا آدمی البتہ خاموش بیٹھا اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں وہ پجاری اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ پھر پجاری اس لڑکی کے قریب پہنچا اور لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے ہی والا تھا کہ خاموش رہنے والا آدمی تیزی سے بولا۔ ”ڈاکٹر جاوید! پلزی! ایکشن۔“

ڈاکٹر جاوید نے سر ہلایا اور کہا۔ ”اوکے۔ ڈاکٹر اقلیم!“

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے تیزی سے مشین کے چند بٹن دبائے۔ مین دبائے سے لڑکی جسے پجاری نے آگ میں دھکیل دیا تھا۔ فوراً حرکت میں آئی۔ اچھل کر آگ کے لالہ سے باہر نکل اور اس کے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا نما ہتھیار آگیا اور پھر لڑکی نے فضا میں تیرتے ہوئے اوپر جا کر ہتھوڑا مار کر بت کا ہاتھ توڑ دیا۔ اس کے بعد وہ ہوا میں تیرتی ہوئی کمرے کے دروازے تک آئی اور آٹا فانا ہوا میں تیرتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

”ویل ڈن!“ ڈاکٹر اقلیم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اب کمرے میں موجود تینوں ڈاکٹرز کے چہروں پر تجسس کی کیفیت تھی۔ جیسے وہ کسی خاص واقعہ کے انتظار میں ہوں۔ سب کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں پجاری آنکھیں بند کئے سہا ہوا کھڑا ایک پکا نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی لہریں چھائی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور ڈرتے ڈرتے بت کی طرف دیکھا۔ جس کا بازو ٹنڈ منڈ

ہو چکا تھا۔

اچانک کمرہ اترتی غضب ناک آواز سے لرز اٹھا۔ ”بسواس؟ بت کے منہ سے قہر و غضب سے بھری آواز آئی۔ تو پجاری رکوع کے بل جھک گیا۔ یقیناً

بسواس اس پجاری کا نام تھا۔ ”برندرا مورتی“ حاصل کرنے کیلئے تو نے برسوں تپسیا کی۔ مجھے خوش بھی کیا

اور نو عمر ناریوں کی بحیثیت دیتا رہا۔ آج تیری تپسیا کا انت تھا۔ تو سہل ہونے کو تھا تیری غلطی سے میرا بازو

کٹ گیا۔ اب تیری پر انجسٹ اسی صورت میں ہوگی جب تو مجھے نقصان پہنچانے والے کو ٹرک میں

پہنچاؤے گا۔ اور اب خود کو پہنچانے کے لئے یہی کرنا ہے، جلدی سے کر لے یہ کام، ورنہ تیرا انت اتنا درد

ناک ہوگا کہ تیری آتما سنسار میں بھٹکتی رہ جائے گی اور اسے شانتی نہیں ملے گی۔“ بت کی آواز پورے

کمرے میں پھیلتی چلی گئی۔

اور پھر تینوں ڈاکٹرز نے اسکرین پر دیکھا کہ آگ بالکل بجھ چکی تھی اور پجاری کھڑا اٹھتیاں بھیج رہا تھا۔ اس کی آنکھیں قہر و غصہ سے بھر گئی تھیں۔

ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ڈاکٹر اقلیم بولا۔ ”اس نے برسہا برس تک جاپ یعنی چلہ کاٹا تھا

اور آج کامیاب ہونے والا تھا کہ رب العزت کے کرم سے اس کے کالے ارادے مٹی میں مل گئے ہیں۔

مبارک ہو۔“

”تم کو بھی۔“ ڈاکٹر ریمز اور ڈاکٹر جاوید نے ایک زبان ہو کر کہا۔

پھر ڈاکٹر ریمز نے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تک تو کامیابی ہوگئی ہے۔ اب

شیطان کے بت نے بسواس کو جو ٹارگٹ دیا ہے۔ وہ اسے بہت جلد پورا کرے گا۔“

ڈاکٹر جاوید نے اپنا چشمہ اتار کر ریمز پر رکھا اور اپنا ریا لوئنگ چیئر پر جھولنے ہوئے بولا۔ ”فکر نہ کرو

جاوید! ہمارے بنگلہ کی روحانی سیکورٹی بہت ٹھیک ہے۔ بسواس یہاں آنے کی کوشش کرے گا۔ تو اس کے دانت

کٹھے ہو جائیں گے۔“

ڈاکٹر اقلیم سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”سیکورٹی تو اچھی ہے مگر اس شیطان کے نیچے بسواس کو ٹرک میں

پہنچانے کا طریقہ بھی تو سوچنا ہے۔“ اور پھر تینوں سوچ میں ڈوب گئے۔

☆.....☆.....☆

تینوں کھاتے پیتے بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ریمز اور ڈاکٹر جاوید بچپن کے ساتھی

تھے۔ انہوں نے اکٹھے اسکول اور کالج لائف گزاری۔ ان دونوں کو کمپیوٹر سے شدید دلچسپی تھی۔ سو

انہوں نے BSC کے بعد امریکہ میں جانے کا فیصلہ کیا۔ گھر سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ سو گھر سے

اجازت ملتے ہی وہ امریکہ جا پہنچے وہاں کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں انہوں نے MSC کے لئے داخلہ لیا۔

یونیورسٹی میں مسلمان ممالک اور دوسرے ممالک سے بھی لڑکے پڑھنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن ان کی

انڈر اسٹینڈنگ اقلیم سے ہوئی۔ اس کا تعلق بھارت سے تھا۔ وہ بھی MSC کرنے آیا تھا۔ لیکن اس کے

خیالات بڑے انوکھے تھے۔ ایک دن وہ تینوں ایک کیفے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اقلیم بولا۔ ”یار! یہ جدید

دور ہے ہر کوئی مادیت پسند ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ جادو وغیرہ سچ ہے۔“

ریمز برگر کھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں! جادو برحق ہے۔ لیکن اس دور میں، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی جادوگر ہو۔“

”نہیں! جادوگر ہوں گے۔ لیکن وہ اتنے زیادہ سامنے نہیں آتے۔ ویسے بھی ان دنوں جعلی سٹلی علوم

والے اتنے ہونگے ہیں کہ کھرے کھوٹے کی پہچان ختم ہوگئی ہے؟“

”ویسے اقلیم تم نے یہ بات کیسے چھیڑ دی؟“ جاوید نے پہلے ریمز کی تردید کی اور پھر اقلیم سے سوال کیا۔

اقلیم ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ہمارا جو بنگلہ ہے۔ اس کے قریب ہی ایک ہندو رہتا تھا۔ وہ

بوڑھا شخص تھا۔ اکثر وہ جادوؤں وغیرہ کے بارے میں

بتا رہا تھا کہ ”جو آدمی دنیا میں اذیت سے مرنا ہے اس کی آتما بھٹکتی رہتی ہے۔ اور جادو سیکھنے سے آدمی کو اتنی شکتی ملتی ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک مورتی کا ذکر بھی کرتا تھا کہ وہ مورتی حاصل کرنے والے کو، سمجھو دنیا جہاں کے خزانے مل گئے۔ مگر وہ مورتی حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔“ اقلیم نے وضاحت کی تو جاوید نے پوچھا۔ ”یہ کیسی مورتی ہے، اور اسے حاصل کرنا کیوں مشکل ہے؟“

اقلیم نے جواب دیا۔ ”وہ بوڑھا کہتا تھا کہ وہ مورتی بہت طاقتور ہے اور جس جگہ وہ رکھی ہے وہاں قدم قدم پر کنڈل (حصار) ہیں۔ ان کنڈلوں کو توڑنے کے لئے لے جے عرصے تک تپیا اور پوچھا کرنی پڑتی ہے اور اگر تپیا میں کوئی غلطی ہو جائے تو پوچھا کرنے والا نشت ہو جاتا ہے۔“ اس بوڑھے کا دعویٰ تھا کہ وہ اس عمل کو جانتا ہے جس کے ذریعے مورتی تک پہنچا جاسکتا ہے۔“

”اگر وہ اس عمل کو جانتا ہے تو وہاں پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کی اس نے؟“ ریمز نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا مگر اقلیم نے اپنی بات جاری رکھی۔

”بوڑھے کا کہنا تھا کہ وہ عمل کرنے والے کو بے پناہ طاقت مل جاتی ہیں۔ جن کو کام میں لاکر وہ مورتی حاصل کر سکتا ہے۔“ چونکہ میرا گھر اس کے گھر کے قریب تھا۔ اس لئے میں اکثر اس کے پاس جا بیٹھتا اور اس کی باتیں سنتا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اور اس بارے میں اس کی منطق نرالی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ شادی کا مطلب ہے کہ اپنی فطری پیاس بجھائی جائے۔ لہذا بہتر ہے کہ پہلے بے پناہ طاقت حاصل کر لو اور پھر فطری پیاس بجھا لو۔ لیکن شادی کر کے نہیں۔ شادی سے آدمی بندھ جاتا ہے۔“

”بڑی نرالی منطق تھی اس کی۔“ ریمز نے مسکراتے ہوئے کہا تو اقلیم بھی ہولے سے مسکرا دیا۔

جاوید نے پوچھا ”لیکن یار اقلیم! امریکہ کے اس مادہ برست ماحول میں تمہیں اس جادو کو بوڑھے کی یاد کیسے آگئی؟“

”چلو ابھی اسائنمنٹ بھی تیار کرنا ہے۔ چھوڑو

ان باتوں کو۔“ پھر وہ تینوں کیفے سے اٹھ کر ہوٹل میں چلے آئے۔ لیکن تینوں اس مورتی کے بارے میں سوچ رہے تھے اپنی اپنی جگہ۔

پھر وہ تینوں اپنی اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ہر ویک اینڈ پر وہ ضرور ملتے اور اکثر و بیشتر مورتی اور اس بوڑھے کے بارے میں بھی باتیں کرتے۔ لیکن اب وہ اس ٹاپک کو سمجھ رہے تھے۔

ایک ویک اینڈ پر اقلیم نے کہا۔ ”دوستو! ہم تینوں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ایک کام کرنا چاہتا ہوں مگر کیلئے نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسے سارے چاہئیں جو میرے خیالات سے متفق ہوں۔ میرے خیال میں تمہارے میرے خیالات کافی حد تک ایک جیسے ہیں۔ کیا تم اس کام میں میری مدد کر سکتے ہو؟“ ریمز نے انھیں آئیز لہجے میں پوچھا۔

”لیکن کام کیا ہے؟ کچھ تو پتا چلے۔“ اقلیم نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں اس بوڑھے اور مورتی کے بارے میں بتایا تھا اور پتا ہے وہ بوڑھا اب کہاں ہے؟“ اس نے سنسنی خیز لہجے میں ان سے پوچھا تو دونوں کے سر نفی میں مل گئے۔

تب وہ کہنے لگا۔ ”میں اکثر اس بوڑھے کی باتیں سنتا تھا۔ مجھے اس کی کچھ باتوں کی سمجھ آتی تھی۔ میرے خیال میں وہ اس مورتی تک پہنچنا چاہتا تھا۔“

”مورتی تک پہنچنا چاہتا تھا؟ لیکن تمہیں اس بارے میں کیسے پتا چلا؟“ جاوید نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

تو اقلیم کہنے لگا۔ ”اس کی باتوں سے، میں اس وقت فٹس ایئر میں تھا۔ اور مختلف ہارناؤز پڑھتا تھا۔ سو مجھے اس کے خیالات کا تھوڑا تھوڑا پتہ چل گیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں یہ سب کچھ بکواس تھا۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر مجھے یقین کرنا پڑا۔ میں FSC کر چکا تھا کہ ایک دن اس بوڑھے کے گھر گیا۔ وہ گھر میں نہیں تھا۔ جبکہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ باہر نہیں گیا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد واپس

آجائے گا۔ اس لئے میں وہیں بیٹھ گیا اس کے کمرے میں وہاں مختلف کتب پڑی تھیں۔ پرانی بوسیدہ سی۔ میں نے وقت گزاری کے لئے ایک کتاب اٹھالی۔ وہ کافی ضخیم بوسیدہ سی کتاب تھی۔ اس کے ٹائٹل پر سنسکرت میں کوئی عنوان لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے پہلے تقریباً 50 صفحات پر ہندی میں لکھا ہوا تھا۔

”جس سے مجبور ہو کر میں اسے پڑھنے لگا۔ وہ کتاب پرانے زمانے کے بڑے بڑے جادوگروں یا مخفی طاقتور چیزوں کے بارے میں تھی۔ بڑی مزیدار کتاب تھی وہ لیکن وہ ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی۔ میں نے صرف دس صفحے پڑھے۔ اسی دوران میرے گھر سے ایک ملازم آ گیا کہ میرے بابا بلا رہے ہیں مجھے، وہ بوڑھا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مجھے وہ کتاب اتنی دلچسپ لگی کہ اسے گھر اٹھا لایا، سوچا کہ بعد میں، میں اسے بتا دوں گا اور معذرت کر لوں گا۔ میں گھر آیا۔ بابا نے کسی تقریب میں جانا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ سو انہوں نے مجھے بھیج دیا۔ اس کے بعد میں نے دوسرے دن اس کے گھر جا کر پتہ کیا تو وہ نہیں تھا۔

اڑوں پروس سے پتہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ کل وہ گھر سے نکلا تھا۔ پتہ نہیں کہاں گیا؟ اس کے بعد اس کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ شاید کسی جادوؤں کے سلسلے میں غائب ہوا ہے۔ پھر میں اس کے گھر سے لائی ہوئی کتاب پڑھنے لگا۔ بہت پر اسرار باتیں لکھی تھیں۔ اس میں، اور پھر میرے لئے یہ مسئلہ بن گیا کہ وہ کتاب آگے سنسکرت میں تھی اور میں سنسکرت نہیں پڑھ سکتا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی میں نے پڑھا تھا۔ اس نے میرے خیالات میں ہلچل مچادی۔ ان دنوں میں BSC میں تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر جادو سے ایسی عجیب و غریب باتیں ظہور ہوتی ہیں تو سائنس کون سا کم ہے؟ سائنس بھی تو ایک جادو ہے دور جدید کا۔ سو میں نے مختلف تجربات شروع کر دیئے۔

میں کمپیوٹر کے ذریعے جادو کے کلمات کرنے کا خواہش مند تھا۔ کمپیوٹر تو تھائی میرا پسندیدہ سچیکٹ۔ پھر میں نے سوچا کہ کمپیوٹر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ تبھی میں اپنی کوششوں اور خواہشات کی تکمیل کر سکوں گا۔ سو میں BSC کر کے یہاں آ گیا۔ اب تو تم کو پتا چل گیا ہوگا کہ میں کس کام کے لئے مدد چاہتا ہوں؟“ اقلیم نے مسلسل بولتے ہوئے ان سے سوال کیا جو اس کی باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

چند لمحوں کے لئے وہاں خاموشی چھا گئی۔ پھر ریمز بولا۔ ”کیا اس بوڑھے کا مزید کوئی پتہ چلا؟“ اقلیم نے نفی میں سر ہلایا تو جاوید بولا ”ہمارا خیال تھا کہ یہاں سے واپس جا کر ہم سافٹ ویئر کا بزنس شروع کریں گے، تم کہتے ہو کہ تمہارے تجربات میں مدد کریں تو.....“ جاوید بول رہا تھا کہ ریمز بولا۔ ”ہم سوچتے ہیں پھر تمہیں بتائیں گے۔“ اقلیم کہنے لگا۔ ”کیوں نہ ہم تینوں اکٹھے بزنس کریں۔“

وہ دونوں اس کی تجویز پر غور کرنے لگے۔ تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا اور ان تینوں کے درمیان طے ہو گیا کہ وہ اکٹھے سافٹ ویئر کا بزنس شروع کریں گے اور اقلیم کے تجربات میں بھی مدد کریں گے۔ اقلیم کا کہنا تھا کہ اگر ہم اپنے تجربات میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً سفلی علوم سے بچانے کے لئے لوگوں کی مدد کر سکیں گے۔ بہر حال ان کے درمیان معاہدہ ہو گیا۔

MSC کرنے کے بعد وہ اپنے ملک کولوث کر آئے اور معاہدے کے مطابق مشترکہ کاروبار شروع کر دیا۔

تقریباً تین برس گزر گئے۔ ان کا بزنس کافی ممالک میں پھیل گیا تھا۔ ان کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے تجربات میں بھی لگے ہوئے تھے۔ اقلیم نے سنسکرت سیکھ کر بوڑھے ہندو کی ساری کتاب پڑھ لی تھی۔

کتاب میں بڑی حیرت انگیز باتیں اور عمل لکھے

تھے۔ اقلیم بوڑھے کی باتیں کردہ مورتی کے بارے میں بھی جان چکا تھا۔ اس مورتی کا نام ”برندرا مورتی“ تھا۔ اور وہ مورتی ایک شیطان کے قبضے میں تھی اور وہ مورتی تو پجاری کے لئے بہت اہم تھی لیکن شرط یہ تھی کہ وہ مورتی تب حاصل کر سکتا ہے جو تمام شراناک کو پورا کرے یعنی شیطان کی خوشیوں کو پورا کرے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے ایک عمل بھی تھا کہ اگر کوئی اس کو حاصل کرنے کا خواہش مند ہو تو اس کتاب جو ایک منتر موجود تھا۔ اسے تنہائی میں بیٹھ کر پڑھے اور دنیا سے ناٹ توڑ لے اور وہ منتر پڑھتے ہوئے دل میں شیطان کا تصور ہونا چاہئے۔ وہ منتر اس وقت تک پڑھتا رہے۔ جب تک کہ شیطان خود منتر پڑھنے والے کے پاس نہ آئے اور اسے مزید ہدایات نہ دے۔ اس میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے کی عمر گزر جائے اور اسے مراد نہ ملے، یا مراد ملنے کے قریب ہو کہ غلطی ہو جائے تو پھر سب کا سب کاکارت ہو جائے گا۔

کتاب میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ مگر ان کا اصل موضوع تو ”برندرا مورتی“ ہی تھا۔ بہر حال وہ تجربات کرتے رہے۔ لیکن منزل تک نہ پہنچ سکے۔ انہی دنوں رمیز اور جاوید کے گھر بیٹے پیدا ہوئے مگر اقلیم کا آنگن ابھی خالی تھا۔ وہ بھی راضی رضائے الہی تھا۔

پھر ان تینوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کا سوچا اور جرمی چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایم فل کیا اور پھر PHD کے لئے مونزیال چلے گئے۔

مونزیال میں ایک دن وہ سیر کرنے کے لئے نکلے ایک نسبتاً ویران جگہ پر آئے تو اقلیم نے جو ڈرائیو کر رہا تھا اچانک گاڑی روک دی۔ اور اسٹیرنگ چھوڑ کر اپنا پیٹ پڑ لیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے اثرات تھے۔ رمیز جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گھبرا کر پوچھنے لگا۔ ”کک کیا ہوا ہے اقلیم؟“ جاوید بھی گھبرا گیا تھا اقلیم کے چہرے پر پسینے کے قطرے نظر آنے لگے تھے اور وہ بدستور اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ جاوید نے پوچھا تو وہ

کراہ کر بولا۔ ”وہ مم..... میرے، چپ، پیٹ، مم..... میں در، درد.....؟“ اس کے منہ سے یہ بھلائی آواز نکلی تو رمیز اور جاوید گھبرا آ گئے۔ ”اس ویرانی میں کیا ہو سکتا ہے؟“ ابھی وہ اس مسئلہ کے حل کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک آواز آئی۔ ”بیٹا! مصیبت آگئی نا.....؟“

دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو مبہوت رہ گئے۔ ایک نورانی چہرہ والے بزرگ سفید لباس پہنے کھڑے تھے۔ سفید داڑھی سینے تک آ رہی تھی۔ نہایت شیریں زبان میں کہہ رہے تھے۔ ”مصیبتیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں۔ انسان کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ ہر مصیبت کے پیچھے کوئی مصلحت ہوتی ہے۔“ رمیز اور جاوید کچھ نہ بول سکے جبکہ اقلیم ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ وہ بزرگ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آئے اور اقلیم کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اقلیم نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے چہرے سے کرب کے اثرات زائل ہونے لگے۔

بزرگ فرمانے لگے۔ ”تم نے بہت نیک کام کی ابتدا ہے۔ جاؤ ہم تمہیں کامیابی کی نوید دیتے ہیں۔ جاؤ اور جا کر ظہر کی نماز ادا کرو، تمہیں رہنمائی ملے گی۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ تمہارے آنگن میں ایسا پھول کھلے گا جو سب سے زیادہ خوشبو والا ہوگا۔ اللہ تمہیں اور تمہارے دوستوں کو کامیاب کرے۔“

بزرگ کی باتیں سن کر ان کی آنکھیں جھک گئیں۔ پھر انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو انہیں جھٹکا لگا۔ بزرگ غائب تھے۔ لیکن کار میں انوکھی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جو اقلیم کے سر سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ”یہ کیا؟“ رمیز کے منہ سے نکلا تو اقلیم نے کہا۔ ”الہام! ہمیں اپنے مقاصد کی کامیابی کے لئے کسی روحانی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ جو پوری ہوگئی۔ اب کسی مسجد میں چلتے ہیں۔“

جاوید نے پوچھا۔ ”کون سی مسجد میں اور یہاں مسجد کہاں ہوگی؟“ مجھے تو ان بزرگوں کی باتیں سمجھ نہیں آئیں؟“

اقلیم نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”روحانی باتوں کی سمجھ دیر سے آتی ہے اس لئے اس میں الجھنا نہیں چاہئے اور بزرگ نے ظہر کی نماز ادا کرنے کے لئے کہا ہے اس لئے ہم مسجد میں چلتے ہیں۔ اب اپنے آپ کو مت الجھانا، ہمیں تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔“

جلد ہی وہ ایک اسلامک سینٹر پہنچ گئے۔ ظہر کی اذان ہو چکی تھی۔ وہ جب وضو کر کے مسجد میں پہنچے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ انہیں سنیں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ وہ جلدی سے جماعت میں شامل ہو گئے۔ پھر جماعت ختم ہوئی۔ امام صاحب نے دعا مانگی اور سب لوگ باقی نماز ادا کرنے لگے۔ وہ تینوں بھی نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو امام صاحب بولے۔ ”آپ تینوں حضرات ادھر آ کر نماز پڑھیں۔“ انہوں نے مخراب کے قریب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اقلیم وہیں چلا گیا۔ انہیں سنیں بھی ادا کرنی تھیں۔

جب وہ فارغ ہوئے تو دیکھا کہ مسجد خالی تھی۔ سب نمازی جا چکے تھے۔ سوائے امام صاحب کے۔ اچانک اقلیم کی نظر مخراب کے قریب پڑے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ امام صاحب کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ اچانک اقلیم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ”جاؤ ظہر کی نماز ادا کرو۔ تمہیں رہنمائی ملے گی۔“ یقیناً یہ اس سلسلہ کی کڑی ہے۔ اقلیم نے سوچا اور اس کاغذ کو اٹھا لیا۔ سفید رنگ کے اس کاغذ پر باریک الفاظ میں منسکرت زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اور اقلیم تو منسکرت جانتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اقلیم، رمیز اور جاوید جو کہ اب ڈاکٹر اقلیم، ڈاکٹر رمیز اور ڈاکٹر جاوید بن چکے تھے۔ اپنے ملک واپس آ گئے تھے۔ ڈاکٹر رمیز کے گھر سب مدعو تھے۔ قصبہ کوٹھ رہے تھے۔ خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر رمیز کا پانچ سالہ بیٹا عدنان اور ڈاکٹر جاوید کا چار

سالہ بیٹا اقبال کھیل رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں بھی کر رہے تھے۔ سزا اقلیم انہیں حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ”کاش میرا بھی کوئی بچہ ہوتا؟“ انہوں نے دکھ سے سوچا۔

اچانک سزا رمیز بولیں۔ ”ارے بھائی! اب کچھ کھا بھی لیں۔ اقلیم بھائی آ گئے ہیں۔ اب کہیں نہیں جائیں گے۔“ یہ سن کر سزا جاوید شرارت سے کہنے لگیں۔ ”دیے اب آپ اقلیم بھائی کو لگام ڈال دینا بہت پڑھ لیا انہوں نے، اب گھر بھی توجہ دیں کچھ۔“ ان کی بات کا مطلب سمجھ کر سزا اقلیم سرخ ہو گئیں جبکہ اقلیم بھی جھینپ گیا۔

رمیز فقہرہ لگا کر بولا۔ ”زبردست بھابھی زبردست! اقلیم کو تو ہماری بہن کا خیال ہی نہیں۔ بس تجربات پر ہی لگا رہتا ہے۔“ اس نے یہ بات شرارت سے کہی تھی۔ ”اور ہاں اگر قابو نہ آئے تو ہم بھی مدد کریں گے۔ آپ کی۔ جرمی و مونزیال سے ہمیں یہ ایم فل اور PHD کمرالائے لیکن ہماری بہن کو کوئی مون منانے بھی نہیں لے گئے۔“ ڈاکٹر جاوید نے کون سا چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا کہ چپ رہے۔ ان چاروں نے ڈاکٹر اقلیم کو اچھا خاصہ نشانہ بنایا۔ بے چارہ۔ اقلیم خاموش ہی رہا۔

بہر حال یہ تقریب خوشی سے گزر گئی۔ ڈاکٹر رمیز اور ڈاکٹر جاوید ڈاکٹر اقلیم کے ساتھ مل کر اپنے کام میں لگ گئے تھے انہیں یہ محسوس تھا کہ ڈاکٹر اقلیم کو مونزیال کی مسجد سے جو کاغذ ملا تھا۔ اس پر کیا کچھ لکھا تھا۔ ڈاکٹر اقلیم نے انہیں بتایا۔ ”دراصل ہمارے مقصد کی تکمیل کے لئے روحانی مدد ہوئی ہے۔ اس مدد سے ہم ایک ایسی مشین بنا سکتے ہیں جو ہمیں جاودگروں کے ٹھکانے معلوم کرنے اور ان کے کالے عزائم سمیت ان کو واصل جہنم کرنے میں مدد دے گی۔“ وہ دونوں حیران رہ گئے کہ کیا ایسی مشین بھی بن سکتی ہے جس سے جاودگروں کے کمالات دکھائے جاسکتے ہوں؟ ڈاکٹر جاوید نے پوچھا۔ ”اور تمہیں اس

بوڑھے جادوگر کے بارے میں پتا چلا اس کاغذ سے؟“
 اقلیم نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”جب وہ مشین
 بن جائے گی تو پھر سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔“
 رمیز بولا۔ ”بز رگ نے کہا تھا۔ آنگن کے
 پھول کے بارے میں کہ وہ سب سے زیادہ خوشبو والا
 ہوگا تو اس کا کیا ہوا؟“
 اقلیم مسکرایا اور کہنے لگا۔ ”وہ میرے خیال میں
 مجھے اولاد کی نوید ہے اور زیادہ خوشبو کا مطلب کہ وہ بہت
 ذہین ہوگی یا کوئی ایسا کارنامہ سر انجام دے گی۔“
 ”آمین آمین اللہ تیرے آنگن میں جلد پھول کھلائے۔“
 اس تقریب والے دن بھابی کا چہرہ دیکھ کر مجھے بہت
 دکھ ہوا تھا۔ جاوید نے کہا۔
 اور پھر وہ تینوں اس انوکھی مشین کی تیاری میں
 لگ گئے۔

ڈاکٹر اقلیم وغیرہ کو PHD کئے دس سال سے
 زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ اس دوران ان کا بزنس وسیع
 پیمانے پر پھیل چکا تھا۔ اس دوران انہوں نے کئی
 کارنامے سر انجام دیئے تھے اور سافٹ ویئر کی دنیا میں
 انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اقلیم نے اپنے
 دوستوں کی مدد سے ایک ایسی مشین تیار کر لی تھی۔ جو ہر
 لحاظ سے انوکھی تھی۔ وہ مشین ڈاکٹر اقلیم نے اپنے بنگلے
 کے تہ خانے میں رکھی تھی۔ اس مشین کا میکازم اس
 طرح کا تھا کہ ایک چھوٹے ڈیپ فریزر جیسا اس کا
 CPU تھا۔ اس کی اسکرین دس فٹ لمبی اور پانچ فٹ
 چوڑی تھی۔ اسی حساب سے اس کے ساتھ مکینز اور پرنٹر
 بھی منسلک تھے۔ اس کا بیورڈ لاتعداد بٹنوں پر مشتمل
 تھا اور ماؤس نہیں تھا۔ اس لحاظ سے ایک طرح کا وہ
 کمپیوٹر تھا۔ مگر اس کی انوکھی صلاحیت یہ تھی کہ مخصوص
 میٹھ پوز کرتے ہوئے اس کے ذریعے جادوگروں کے
 خفیہ ٹھکانوں کا پتہ چلا یا جاسکتا تھا۔ مثلاً کسی جادوگر کے
 بارے میں معلوم کرنا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ یا اس کا
 ٹھکانہ کہاں ہے؟ تو ایک مخصوص طریقہ جو مونزیال کی
 مسجد سے ملنے والے کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ استعمال کرتے

ہوئے اس جادوگر کے بارے میں معلومات حاصل کی
 جاسکتی ہیں۔
 مزید حیرت انگیز بات یہ کہ اس انوکھی مشین کے
 ساتھ ایک چھوٹی سی چپ بنائی گئی تھی وہ چپ اگر کسی
 آدمی کے سر میں فٹ کر دی جائے تو اس کا زہر سٹم
 مشین کے کنٹرول میں آجاتا اور مشین کنٹرولر اس آدمی کو
 اپنے اشاروں پر نچا سکتا تھا۔ مزید وہ چپ جس کا تعلق
 اس مشین کے CPU سے تھا۔ اتنی طاقتور تھی کہ
 متناسب جسم کے آدمی کو اس کے ذریعے چند منٹوں کے
 لئے ہوا میں اڑایا جاسکتا تھا اور یہی سب سے انوکھی
 خاصیت تھی اس مشین کی۔
 بہر حال طویل عرصہ بعد جب مشین بن گئی تو وہ
 تینوں خوشی سے نہال ہو گئے۔ آخر ان کی برسوں کی
 آرزو پوری ہو گئی تھی۔
 ڈاکٹر اقلیم نے مسکرت کی وہ کتاب جسے اس
 نے بوڑھے ہندو کے کمرے سے حاصل کیا تھا دوبارہ
 پڑھی اور اپنے دوستوں کو سنائی پھر ان کی اس موضوع پر
 طویل بحث ہوئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اس
 عجیب و غریب مشین کو بھی استعمال کیا اور مونزیال کی مسجد
 سے ملنے والے اس کاغذ سے بھی استفادہ کیا۔ آخر وہ
 اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کتاب میں لکھی جانے والی تمام
 جادو کی چیزوں میں سب سے زیادہ طاقتور برندر امورٹی
 ہی ہے۔ جسے حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ وہ
 بوڑھا جادوگر۔ اگر وہ اسے حاصل کر لے گا تو یقیناً
 دوسروں کا جینا حرام کر دے گا۔ اب ان کا اصل ٹارگٹ
 اس بوڑھے کو مورٹی حاصل کرنے سے روکنا تھا۔ لہذا
 انہوں نے اس پر کام شروع کر دیا۔
 جب وہ مشین پر اس کے بارے میں ریسرچ
 کرنے لگے تو حیران رہ گئے۔ مشین اس بارے میں کوئی
 مثبت جواب نہیں دے رہی تھی۔ ڈاکٹر اقلیم کے ساتھ
 جاوید اور رمیز بھی حیران تھے۔ وہ کیا جواب دیتے لیکن
 ڈاکٹر جاوید نے ایک مشورہ دیا۔ ”یہ مشین ابھی تیار ہونی
 ہے اور برندر امورٹی“ تو بہت طاقتور ہے کیوں نہ پہلے

ہم چھوٹے قسم کے کم شکتی والے جادوگروں کی خبر لیں۔“
 اقلیم نے تائید میں سر ہلایا۔ اور رمیز کہنے لگا۔
 ”ہاں اس طرح ہمیں اس مشین کی غویوں، خامیوں
 کے بارے میں بھی صحیح طریقے سے پتا چل جائے گا۔“
 اور وہ تینوں اس پر متفق ہو گئے۔ اور کم شکتیوں والے
 جادوگروں سے زیادہ زیادہ شکتیوں والوں تک جانے
 لگے۔ وقت گزرنے لگا۔ ان کے ہال بھی سفید ہونے
 لگے۔ ان کی اولادیں جوان ہونے لگیں۔
 البتہ ڈاکٹر اقلیم کی بیٹی انوشا ابھی چھوٹی تھی لیکن
 تھی بڑی ذہین۔ اپنے باپ کی طرح کمپیوٹر سے دلچسپی
 رکھتی تھی۔ دس سال کی عمر میں وہ حیرت انگیز طور پر مکمل
 کمپیوٹر سیکھ گئی تھی، اب وہ اتنی تیز کمپیوٹر آپریٹ کرتی کہ
 ڈاکٹر اقلیم حیران رہ جاتا۔
 ان تینوں کی ایجاد کی ہوئی مشین کے کارنامے
 بھی دن بدن بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے نئی، کالے
 کرکوت والوں کے کالے کرکوت خاک میں ملائے اور
 انہیں سپرد ناز کیا۔ ساتھ ہی مشین میں نئی جدتیں بھی پیدا
 کیں اور اسے مزید اچھی طرح سمجھا۔ ان کی یہ مشین
 خفیہ تھی۔ منظر عام پر نہیں آئی تھی۔
 پہلے پہل وہ پریشان رہتے تھے کہ ان کی یہ مشین
 ان کے بعد کون آپریٹ کرے گا کیونکہ رمیز کا بیٹا آدمی
 مل جاتا چاہتا تھا جبکہ ڈاکٹر جاوید کا بیٹا ایز فورس میں،
 ان دونوں کو کمپیوٹر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ سو وہ
 پریشان رہتے تھے۔
 لیکن جلد ہی ان کی یہ پریشانی دور ہو گئی۔ انوشہ
 اقلیم کمپیوٹر سے شدید دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ اکثر باپ سے
 بھی اس بارے میں بات کرتی تھی۔ ڈاکٹر اقلیم اپنی بیٹی
 پر غر کرنا تھا۔ ڈاکٹر رمیز اور ڈاکٹر جاوید بھی اسے اپنی بیٹی
 کی طرح چاہتے تھے۔
 یہاں دنوں کی بات ہے جب انوشہ دسویں میں
 تھی۔ وہ اس بنگلے میں رہتی تھی۔ جہاں مشین پڑی تھی۔
 ایک دن انوشہ نے سوچا کہ ”آخر تہہ خانے
 میں وہ کون سی چیز ہے کہ اس کے پاپا اور دونوں انکل

وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ تجسس سے مجبور ہو کر اس نے
 کمرے میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ سزا اقلیم کلب میں
 تھیں۔ انوشہ کے لئے اچھا موقع تھا۔ اس نے اپنے
 والد کے کمرے سے چابی ڈھونڈ لی اور مطلوبہ کمرے
 میں جا پہنچی۔ وہ اس عجیب و غریب مشین کو دیکھ کر حیران
 رہ گئی۔ ”یا اللہ خبر! کیا بلا ہے؟“ اس کے منہ سے نکلا۔
 وہ کمرے میں گھوم گھوم کر اسے دیکھنے لگی۔ CPU
 اسکرین، کی بورڈ، آخر اس کی آنکھوں میں چمک
 آگئی۔ اس کا آئی کیو AO (150) تھا۔ مشکل سے
 مشکل بات بھی انکھوں میں سمجھ جاتی۔ اس نے اسے آن
 کیا اور پھر کی بورڈ کے سامنے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ
 کی بورڈ کی بٹن کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کی بورڈ پر
 انگلیاں چلانا شروع کر دیں۔ بڑی سی اسکرین روشن
 ہو چکی تھی اور وہ مختلف پروگرامز بدل رہی تھی۔
 ایک سیمنار تھا۔ جہاں ڈاکٹر اقلیم وغیرہ مدعو تھے
 اب یہاں سے فارغ ہو کر وہ سب واپس آ رہے تھے۔
 وہ تینوں ڈاکٹر اقلیم کے بنگلے پر جا پہنچے۔ اقلیم نے گھر
 اطلاع کر دی تھی کہ وہ آ رہے ہیں۔ اب وہ حیران رہ گیا
 یہ دیکھ کر کہ اس کی بیٹی اس کو ریسو کرنے کے لئے بنگلے
 کے گیٹ تک بھی نہ آئی۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا تو
 وہ کہنے لگی۔ ”اپنے کمرے میں ہوگی۔ ٹھہریں میں اسے
 بتاتی ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد آ کر اس نے کہا۔ ”وہ اپنے
 کمرے میں نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔“
 ڈاکٹر جاوید نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ کسی فرینڈ
 کے پاس چلی گئی ہو۔“
 ڈاکٹر اقلیم بولے۔ ”دراصل مجھے یہ عادت ہو گئی
 ہے کہ کہیں سے بھی واپس آؤں تو پہلے اس کا چہرہ
 دیکھوں۔ سلطانہ جب وہ آئے تو مجھے کال کر دینا اب ہم
 اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔“
 وہ اپنی بیوی کو ہدایت کر کے اپنے دوستوں کے
 ساتھ تہہ خانے کی سمت چلے۔
 تہہ خانے میں پہنچ کر انہوں نے جو دیکھا اس
 نے ان کے سر کا فیور اثر ادا کیا۔ مشین والے کمرے کا دروازہ

کھلا تھا اور سامنے روشن اسکرین نظر آرہی تھی۔ تینوں حیران رہ گئے۔ وہ دبے پاؤں کمرے کے دروازے پر پہنچے تو انوشہ کو کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے دیکھ کر ان کی آنکھوں کے دیدے پھیل گئے۔ انوشہ اپنے انداز میں تیز تیز انگلیاں چلا رہی تھی۔ اور اسکرین پر جو سین تھا۔ اس کو دیکھ کر وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کیونکہ وہاں ایک بہت بڑا کمر دکھائی دے رہا تھا۔

کمرے کے درمیان ہوا میں ایک شید معلق تھا اور اس پر ایک بہت بڑے بد شکل بت کی تصویر تھی۔

شید کے نیچے شعلے تھے آگ کے۔ آگ کے سامنے ایک بھیانک سا بوڑھا ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا، اچانک اسکرین پر سین بدل گیا۔ گھنے جنگلات دکھائی دینے لگے۔ پھر منظر بدلا اب کوئی تحریر دکھائی دے رہی تھی۔ پھر وہ تحریر زوم ہوئی یقیناً انوشہ اس کو پڑھ رہی تھی۔ تینوں ڈاکٹر ز پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ وہ PHD تھے اور کمپیوٹر کی دنیا کے مانے جانے والے دماغ تھے۔ انہوں نے PHD کر کے یہ مشین ایجاد کی تھی اور پھر اسے سمجھنے میں بھی برسوں لگا رہے تھے۔ لیکن یہ لڑکی 16 سال کی، دسویں میں پڑھنے والی اس کو اتنی تیزی سے آپریٹ کر رہی تھی۔ جتنی تیزی سے وہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

تینوں کے دماغوں میں ایک شیریں آواز گونجنے لگی۔ ”ہم دعا کرتے ہیں تیرے آنگن میں ایسا بچوں کھلے گا جو سب سے زیادہ خوشبودار ہوگا۔“

ان کے دل مسرت سے بھر گئے۔ اقلیم کی تو آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔ پھر وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ آہٹ سن کر انوشہ نے سر اٹھایا تو پہلے وہ گھبرا گئی پھر ہنس کر بولی۔ ”پاپا اور انکل! یہ تو بڑے مزے کی چیز ہے۔ میرے خیال میں آپ تینوں حضرات نے ہی بنائی ہوگی۔“ وہ مصوہیت سے بول رہی تھی۔

ڈاکٹر اقلیم نے اسے گلے لگالیا۔ ”بہت خوب میری بچی۔ تم نے دل خوش کر دیا۔“ اس نے اس کی تعریف کی اور ڈاکٹر جاوید اور ڈاکٹر رمیز نے بھی اسے سراہا۔

”معاف کرنا پاپا! آپ اکثر و بیشتر اس کمرے میں رہتے ہیں اور دونوں انکل بھی۔ مجھے تجسس ہوا کہ آخر ہے کیا اس کمرے میں۔ سو آج میدان خالی پا کر میں نے آپ کے کمرے سے چابی چرائی اور یہ دریافت کر لی لیا۔ پھر میں نے اسے آن کر کے چلانا شروع کیا۔ ہسٹری والے فولڈر کو پڑھ کر مجھے اپنے اوپر بہت فخر ہوا کہ میرے پاپا اور انکل اتنے عظیم ہیں لیکن چابی چرانے کی کوتاہی معاف کر دیں۔“ انوشہ نے سسکل بولتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھ لئے۔

یہ دیکھ کر ڈاکٹر جاوید کہنے لگے۔ ”بیٹی! تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ تم بہت ذہین ہو۔ اس مشین کو بنانے اور سمجھنے کے لئے ہمیں برسوں لگے۔ درمیان میں روحانی مدد بھی ہوئی۔ حالانکہ ہم PHD ہیں لیکن تم نے منٹوں میں اسے آپریٹ کر لیا۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔“

ڈاکٹر اقلیم اور ڈاکٹر رمیز اسکرین پر سو جو تحریر پڑھ رہے تھے۔ اچانک ڈاکٹر اقلیم بولا۔ ”وہ مل گیا وہ مل گیا جس کی ہمیں تلاش تھی۔“ اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

”کیا مل گیا؟“ ڈاکٹر جاوید نے پوچھا تو وہ سر ہلاتے ہوئے چیز پر جا بیٹھا اور بولا۔ ”بیٹو بتاتا ہوں انوشہ تم بھی بیٹھو“ وہ سب بیٹھ گئے۔ تو اقلیم نے کہا۔ ”وہ بوڑھا ہندو جادوگر! جو برندرا مورتی کی تلاش میں تھا۔ اس کا پتا ٹھکانہ مل گیا ہے۔“ اس نے خوشی سے کہا تو ڈاکٹر جاوید اور ڈاکٹر رمیز بھی چونک پڑے جبکہ انوشہ انہیں دیکھنے لگی حیرانی سے۔

ڈاکٹر رمیز کہنے لگا۔ ”اگر ایسا ہے تو یہ بہت بڑی کامیابی کی بات ہے۔“ ڈاکٹر اقلیم سر ہلاتا ہوا کی بورڈ کے سامنے جا بیٹھا اور کمپیوٹر آپریٹ کرنے لگا۔

3 گھنٹے بعد سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ اور وہ آئندہ کالائیکل بھی تیار کر چکے تھے۔ بوڑھا جس کا نام بسواس تھا۔ شیطان کی نظر کرم حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور شیطان نے اسے گیارہ سال پوجا کرنے کو کہا تھا، اس نے وہ پوجا ایک جنگل میں موجود

ایک کمرے میں کرتی تھی۔ جس میں ایک شیطان کا بت موجود تھا وہ کمرہ اور بت عرصہ پہلے شیطان نے اپنے ایک چیلے سے بنوایا تھا جو اس سے خاص طاقتیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔

بہر حال بسواس کو گیارہ سال پوجا کرنی تھی اور اس پوجا کا طریقہ کچھ اس طرح تھا کہ ہر سال کے انتقام پر اسے 15، 16 سال کی ایک حسین لڑکی کی بیٹھ دینی پڑتی۔ شیطان کے چرنوں میں جلتی آگ میں اور پہلے سال اس کو یہ کرنا تھا کہ پورا سال پوجا کر کے جب سال ختم ہونے میں گیارہ گھنٹے رہتے ہوں۔ اسے پوجا چھوڑنی تھی اور بیٹھنے کے لئے لڑکی کو ڈھونڈنا تھا۔ یہ شرط تھی اس پوجا کی۔ ان گیارہ گھنٹوں میں ہی اسے لڑکی کی تلاش کرنی تھی زیادہ وقت لگ جاتا مقررہ وقت سے تو پھر وہ ڈھٹ کر دیا جاتا۔

اور پھر جوں جوں سال گزرے اس لحاظ سے وہ گھنٹے کم ہوتے جاتے۔ یعنی پہلے سال اگر گیارہ گھنٹے تھے تو دوسرے سال دس۔ تیسرے سال 9، اسی طرح آخری بھی گیارہویں سال اسے ایک گھنٹہ ملنا تھا۔ اس ایک گھنٹہ میں اسے لڑکی تلاش کرنی تھی۔ یہ گیارہ سال کی ظلم تپسیا اس لئے تھی کہ جہاں برندرا مورتی رکھی گئی تھی۔ اس جگہ گیارہ ظلم تھے۔ ہر سال کی پوجا سے ایک ایک ظلم ٹوٹ جاتا اور گیارہ سال بعد مکمل طاقتیں حاصل ہو جاتیں۔ پھر برندرا مورتی مل جاتی۔

بہر حال بوڑھا بسواس دس ظلموں کا توڑ حاصل کر چکا تھا اور گیارہویں ظلم کے لئے پوجا کر رہا تھا۔ یہ اس کا آخری مرحلہ تھا۔ پھر تخت یا تختہ ہو جاتا۔

ڈاکٹر اقلیم نے جو منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا سب سے اہم کردار انوشہ تھی۔ وہ اس طرح کہ جب بسواس کی پوجا ختم ہونے میں چند گھنٹے رہتے ہوں تو انوشہ کو اس مشین کے ذریعے اس جنگل میں پہنچا دیا جاتا۔ جب اس کے سر میں فٹ ہوتی اور اس کا کنٹرول ڈاکٹر جاوید کے پاس ہوتا۔

ابھی بسواس کی پوجا ختم ہونے میں ایک ماہ باقی

تھا۔ اس دوران ڈاکٹر اقلیم اور اس کے ساتھیوں نے اس کیس پر مزید بحث کی۔ ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ ڈاکٹر اقلیم نے کچھ عرصہ پہلے جب بسواس کے بارے میں جانا چاہا تھا۔ تو مشین کا جواب نفی میں تھا۔ اب یہ کیسے ممکن ہوا؟

تو ڈاکٹر جاوید نے کہا۔ ”اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ مشن بنائی ہے جبکہ اس کا ڈیزائن ہمیں روحانی طور پر مونسریاں والے بزرگ نے دیا تھا۔ انہوں نے بھی پیشین گوئی کی تھی کہ اقلیم کے آنگن میں جو بچوں کھلے گا۔ وہ سب سے زیادہ خوشبودار ہوگا اور اب انوشہ بیٹی اتنی ذہین ہے کہ ہم بچپن سے ہی اس کی ذہانت کا مشاہدہ کرتے آرہے ہیں۔ یقیناً یہ ذہانت اسے خصوصی طور پر عطا کی گئی ہے۔ ہم نے PHD ہو کر بھی اور روحانی مدد حاصل کر کے بھی اس مشین کو سمجھنے میں برسوں لگائے لیکن انوشہ بیٹی ایک گھنٹے میں ہی سمجھ گئی تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انوشہ کی روحانی طور پر مدد ہوتی ہے اور اس شیطان کا آخری وقت آ گیا ہے۔“ ڈاکٹر جاوید نے تفصیل سے کہا۔

ڈاکٹر رمیز بولا۔ ”ہاں! بالکل میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں کیونکہ کہتے ہیں نا کہ اللہ شیطانی کام کرنے والوں کو ڈھیل دیتا ہے۔ اور پھر اچانک ری کھینچ لیتا ہے۔ بسواس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔“

ڈاکٹر اقلیم نے تائید میں سر ہلایا پھر بولا۔ ”ویسے میرا خیال ہے کہ انوشہ کو یہیلی کا پٹر کے ذریعے اس جگہ پہنچایا جائے۔ ایک مناسب جگہ پر یہیلی کا پٹر کھڑا کر دیا جائے۔ اور انوشہ سیر کے لئے نکلے اور ٹیلٹے ٹیلٹے بسواس کی نظروں میں آ جائے۔“ وہ ساری تفصیل بتاتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

بوڑھا بسواس اس کمرے میں جہاں شیطان کا بت ہوا میں معلق تھا۔ آگ کے سامنے بیٹھا مंत्र پڑھنے میں مصروف تھا۔ بھڑکتی آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے اس کی شکل بہت بھیانک لگ رہی تھی۔ آج وہ نہایت

خوش تھا۔ اس کا آخری سال مکمل ہونے کو تھا۔ اس کے بعد اسے وہ طاقتیں حاصل ہو جاتیں جن کے ذریعے وہ برادر امورتی حاصل کر لیتا۔

بہر حال جب وقت مکمل ہونے میں ایک گھنٹہ رہ گیا تو اس نے منتر پڑھنا چھوڑا اور کیڑی کی تلاش میں نکل پڑا۔ اگرچہ وہ بے حد خوش تھا۔ لیکن اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کیونکہ اگر اسے مطلوبہ کیڑی نہ ملتی تو وہ نشت کر دیا جاتا۔ جب وہ اس کمرے سے باہر نکلا تو اسے اپنی طاقتوں کے ذریعے پتہ چلا کہ یہاں سے تھوڑی دوری پر ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا ہے اور اس میں ایک نوجوان خشین لڑکی اور پائلٹ کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ اس خوشی سے نہال ہو گیا۔ ”اب میری منزل مجھے ملنے والی ہے۔“ اس نے سوچا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہیلی کاپٹر میں موجود لڑکی جو یقیناً انوشہ تھی۔ بسواس کے پاس کمرے میں پڑی تھی وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں تھی۔ درحقیقت اس وقت اس کا دماغ ہندوستان کے شہر دہلی میں موجود ڈاکٹر جاوید کے کنٹرول میں تھا۔

وقت ختم ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ باقی تھے۔ بسواس نے شیطان کی اور زیادہ خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان پندرہ منٹوں میں منتر پڑھنا شروع کر دیا اور پھر مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ بسواس نے انوشہ کو آگ کے الاؤ میں ڈھیل دیا اور اور پھر.....“

ڈاکٹر جاوید نے انوشہ کو بڑی مہارت سے کنٹرول کیا تھا۔ اب وہ ہیلی کاپٹر میں پہنچ چکی تھی۔ ہیلی کاپٹر اب اپنی سابقہ منزل کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ اقلیم وغیرہ بہت خوش تھے آخر انہیں اپنی محنت کا پھل حاصل ہو گیا تھا۔

چونکہ بسواس کا میابی کے قریب تھا۔ اس لئے شیطان نے اسے وارننگ دی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ توڑنے والے کو نرک میں پہنچائے۔ ورنہ اس کا انت دردناک ہوگا۔ سو بسواس بت کا ہاتھ توڑنے والے کی تلاش میں لگ گیا۔ لیکن وہ ناکام رہا۔ اس لئے کہ اس کی

تمیبا کو نقصان پہنچانے والے ڈاکٹر اقلیم، ڈاکٹر جاوید، ڈاکٹر رمیز اور انوشہ روحانیت کے زیر اثر تھے۔ اور پلید جاوید کو روحانیت تک کیسے رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ سو وہ بھی بری طرح ناکام ہو گیا تھا اس نے ایک عرصہ تک برادر امورتی حاصل کرنے کی خواہش میں گزارا۔ مگر اب اس کا درد ناک انت ہونے والا تھا۔

ادھر ڈاکٹر اقلیم کے بنگلے کے تہہ خانے میں درد ناک آوازیں گونج رہی تھیں اور وہ آوازیں بسواس کی تھیں جو اس انوکھی مشین کے ذریعے سنائی دے رہی تھیں۔ بڑی اسکرین پر بڑا درد ناک منظر نظر آ رہا تھا۔ بسواس کے جسم کے کلوے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ سسک سسک کر مارتا تھا۔ شیطان کسی کا نہیں ہوتا۔ بیشک وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔

”چلو یہ بھی واصل جہنم ہوا۔“ ڈاکٹر رمیز بولا۔ تو انہوں نے شکر ادا کیا۔ پھر ڈاکٹر اقلیم نے مشین بند کی۔ اور تہہ خانے سے نکل آئے۔ تینوں کی بیویاں دوسری منزل پر موجود تھیں۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے شوہر کس عظیم کام سے فارغ ہوئے ہیں اور انوشہ کی قابلیت بھی ظاہر ہو گئی تھی۔ انوشہ بھی ہیلی کاپٹر کے ذریعے اپنے بنگلے میں پہنچ چکی تھی۔ عورتیں حیران تھیں کہ انوشہ دہشتی اور بھڑکتی ہوئی آگ میں سے بیخبر و عافیت کیسے باہر نکلی۔ تو ڈاکٹر اقلیم نے بتایا کہ یہ سب اس مشین کی وجہ سے ہوا، اور انوشہ کے کپڑوں اور پورے جسم پر فائر پروف کیمیکل لگایا گیا تھا۔

تینوں دوست بہت خوش تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اللہ نے انہیں کامیابی عطا کی، اب ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ آئندہ بھی وہ ایسا قدم اٹھائیں گے ان اشخاص کے لئے جو انسانیت کے خلاف ایسے گندے علم کے ذریعہ کچھ کریں گے۔ بنگلے میں جیسے جشن کا سماں تھا اور اس خوشی میں سب نے مٹھائی کھائی۔



ڈر

اسارہ نو شین۔ فیصل آباد

رات کے ساڑھے بارہ بجے اچانک دروازہ کھلا اور ایک بالشت کی گڑیا دروازے پر کھڑی مسکرانے لگی اور پھر اس کا وجود بڑا ہوتے ہوتے اس نے مکمل ایک لڑکی کا وجود دھار لیا اور پھر وہ آگے ہی آگے بڑھنے لگی۔

ذہن پر سکتہ اور اچنبھے میں ڈالتی ہوئی ناقابل یقین تحیر انگیز اور حیرت انگیز کہانی

میں اپنے بچوں کو سختی سے منع کر رہی تھی کہ دوپہر میں باہر جا کر نہ ٹھیلیں مگر دونوں نے میری بات کو نظر انداز کر دیا اور باہر بھاگ گئے۔ اس بات کا مجھے شدید غصہ تھا اور میں نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ اب جب یہ دونوں واپس آئے تو ان کی خوب پٹائی کروں گی۔ کافی دیر کے بعد جب دونوں کھیل کر واپس آئے تو مجھ سے لپٹ گئے اور دونوں کجلدی تھی کہ ماما کچھ کھانے کو دیں کیونکہ بہت بھوک لگی ہے۔ غصہ کہیں دور چلا گیا اور مجھے ان کی بھوک مٹانے کی فکر لگ گئی۔ جلدی جلدی کھانا دیا۔ مگر میں دیکھ رہی تھی آج کل دونوں میری بات کو یوں نظر انداز کر دیتے تھے اور اپنی من مانیوں کرتے تھے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ انہیں وہ واقعہ سناؤں جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں نے دونوں کو بیٹھایا اور بولنا شروع کیا۔ آج تم تم دونوں کو ایک سچا واقعہ سنائی ہوں۔

”جب میں چھوٹی تھی تو میں بھی تم لوگوں کی طرح اپنی امی کی بات نہیں مانتی تھی۔ ضد اور من مانی کرتی تھی جودل میں آیا بس وہی کرتا ہے۔ چھٹیوں میں میری امی مجھے لے کر خالہ کے گھر گئیں۔ ان کا محن بہت بڑا تھا اور اس میں میری کاردرخت بھی تھا۔ مجھے

خالہ کے بچوں نے بتایا کہ خالہ نے انہیں پیری کی طرف جانے سے منع کیا ہے۔ وہاں آسب ہے میں ان پر ہنسنے لگی کہ یہ کتنے ڈرپوک ہیں خالہ نے کہا اور انہوں نے مان لیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور پیری کے درخت کی طرف دوڑ لگادی۔ وہ لوگ مجھے آوازیں دیتے رہ گئے۔ میں نے پیری کے درخت کے نیچے پہنچ کر انہیں آواز دی کہ بتاؤ کہاں ہے آسب؟ پیری کے نیچے کچھ خوبصورت بیر گرے ہوئے تھے میں نے وہ کھانے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی ان کو چڑاتی رہی اور ان کی بزدلی پر ہنستی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پاؤں جل رہے ہیں۔ میرے پاؤں کے نیچے آگ لگی ہوئی تھی میں وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی مگر پاؤں جیسے زمین نے زور سے پکڑ لئے ہوں۔ چپٹا چاہتی تھی مگر حلق سے آواز نہیں نکلی رہی تھی پاؤں جلنے کی تکلیف سے میں بے ہوش ہو گئی کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں بستر پر تھی اور سب میرے لئے فکر مند تھے۔ میری امی اور خالہ مجھے ہوش میں آنا دیکھ کر ڈانٹنے لگیں کہ جب منع کیا گیا تھا تو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ امی نے مجھے ”ڈھیٹ“ اور ”خودسر“ تک کہہ

میری چاہت

اے ابن آدم..... ایک تیری چاہت ہے..... اور
ایک میری چاہت ہے۔ ہوگا وہی جو میری چاہت
ہے..... پس اگر تو نے سپرد کر دیا اپنے آپ کو اس
کے جو میری چاہت ہے..... تو وہ بھی تجھے دوں گا
جو تیری چاہت ہے..... اگر تو نے مخالفت کی اس
کی جو میری چاہت ہے تو تھکا دوں گا تجھ کو اس
میں جو تیری چاہت ہے پھر ہوگا وہی جو میری
چاہت ہے۔

(شرف الدین جیلانی - سنڈوالہ یار)

ان کے جانے کے بعد میں نے امی اور خالہ
سے معافی مانگی کہ اب ہمیشہ ان کی بات مانوں گی۔ ان
کی بات سے انحراف نہیں کروں گی۔ کیونکہ مجھے پتا چل
گیا تھا کہ ان کی بات نہ مان کر میں اپنا ہی نقصان
کروں گی اور خود کو تکلیف میں ڈالوں گی۔

میری بات سن کر دونوں بچے مجھ سے لپٹ
گئے۔ اور خوف زدہ انداز میں بولے۔ ”امی آئندہ ہم
بھی آپ کی ہر بات مانیں گے۔ آپ جو کہیں گی ہم
وہی کریں گے آئندہ دوپہر کے وقت باہر بھی نہیں
جائیں گے۔ ہمیں معاف کر دیں۔“

میں نے دونوں کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ تھوڑی
دیر بعد دونوں میرے ساتھ لیٹے دوپہر کے وقت
سورہ پڑھتے۔

میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی جو میں
اپنے بچوں کو سمجھانا چاہتی تھی میری مار اور ڈانٹ ڈپٹ
سے زیادہ وہ میری کہانی سے سمجھ گئے تھے اور ڈانٹ
سے زیادہ اس کا اثر دیر پا ہوگا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔



ہے میری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور پھر ایک فلک
بگڑا جی میرے منہ سے نکلی۔

میری جی جن کس سارے گھروالے ہڑ بڑا کر اٹھ
بیٹھے۔ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا، میری زبان
ٹھک اور حلق خشک ہو رہا تھا میرے ابو نے ہتھوڑا تو
لمب چوک پڑی۔

پوری رات میری حالت بہت غیر رہی
اور جب صبح کا اجالا پھیلا تو میری طبیعت کچھ منصل۔

میرے اکل صبح ایک عامل کو اپنے ساتھ لائے
دو ٹھکے دیکھ کر کافی دیر کچھ پڑھتے رہے ان کی آنکھیں
بندھیں کافی دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں مجھ پر
اور پانی پر پھونک ماری اور وہ دم والا پانی مجھے پینے
کو دے دیا۔ پانی پینے کے بعد مجھے لگا میں کافی
بہتر ہوں انہوں نے کہا کہ ”اس بچی پر آپ سب کا اثر
ہے، آپ لوگ تین دن تک دم کروائیں ٹھیک
ہو جائے گی۔“

3 دن تک مجھے دم کروایا گیا۔ مجھے خود بھی
ٹھوس ہو رہا تھا کہ اب میں بہتر ہوں۔ خالہ نے کہا
اسے منع کیا تھا کہ اس طرف نہ جائے مگر اس نے تو قسم
کھا رکھی ہے بڑوں کی بات نہ ماننے کی۔

عامل نے مجھے ناراضگی سے گھورا
اور کہا۔ ”بڑوں کی بات ماننے میں فائدہ ہوتا ہے۔
اگر تم بات مان لیتی تو اب اتنی تکلیف سے دوچار نہ
ہو پڑتا تھیں۔ بڑے جو بھی ہوتے ہیں ہمیشہ ہمارے
فائدے کے لئے اور ہمیں مشکلوں سے بچانے کے لئے
کہتے ہیں اور جو بچے ان کی بات نہیں مانتے وہ تمہاری
طرح اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔“

میں نے شرمندگی سے کہا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں
آئندہ اپنی ماں کی ہر بات مانوں گی کبھی ان کی بات
نہیں اٹھاؤں گی کروں گی۔ جو کرنے کو کہیں گی وہ کروں گی
جس سے روکیں گی اس سے رک جاؤں گی۔“

عامل نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا
اور کہا۔ ”تمہاری بچی بڑی سمجھ دار ہے۔“

لرزہ طاری ہو جاتا تھا میں خاص طور پر رات کا سوچ
سوچ کر بہت زیادہ اپ سیٹ ہو جاتی تھی کیونکہ ان
دنوں میں ان دیکھی بلا کے زیر اثر آچکی تھی وہ بلا ہمیشہ
رات میں ہی میرے سامنے آتی تھی ظاہری طور پر یا پھر
خواب میں۔

دن دھل گیا شام ہو گئی بارش کی وجہ سے ویلے
بھی دن میں کوئی کوئی محلے یا گلی میں نظر آتا تھا وہ بھی
بہت اہم ضرورت کے تحت ورنہ اتنی کڑکتی سردی
اور بارش میں کون گھر سے نکلتا۔ شام ہوتے ہی
گھروں میں لائٹیں کی روشنائیں پھیل گئیں ان دنوں بجلی
زیادہ عام نہیں تھی صرف پیسے والے لوگ ہی اپنے
گھروں میں بجلی لگواتے تھے۔

اور شام کے بعد رات کا اندھیرا پورے علاقے
پر چھا گیا۔ پورا علاقہ سناں اور پران نظر آنے لگا
، ایسا لگتا تھا کہ پورے علاقے میں کوئی جاندار رہتا ہی
نہیں اس دن تو کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی
نہیں سنائی دیتی تھی۔ تمام چند پرند اپنی اپنی جگہوں
پر سہمے ہوئے آنکھیں بند کئے دیکے پڑے تھے رات کا
تھوڑا بہت کھانا جیسے تیسے کھا کر گھروالے اپنے اپنے
بستر میں دبک گئے۔

میں بھی اپنے بستر میں دبک گئی اور پھر کوشش
کرتے کرتے نیند کی آغوش میں چلی گئی رات کا نہ
جانے کونسا پہر تھا کہ خواب میں وہی گڑیا مسکراتی ہوئی
نظر آئی دروازے پر کھڑی وہ چنداچ کی گڑیاں کا وجود
آہستہ آہستہ بڑا ہونے لگا اور پھر اس گڑیا نے ایک مکمل
لڑکی کا وجود دھار لیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ میری طرف
بڑھنے لگی۔ میرے قریب آ کر وہ رگ رگ اور اپنا دایاں
ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا پھر وہ گویا ہوئی۔

”میں اکیلی رہتے رہتے اب بہت اداس ہو گئی
ہوں اب میں تجھے اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی ہم
دونوں ساتھ میری کی درخت پر رہیں گے چل میرے
ساتھ..... چل اٹھ.....“ اور اس نے میرا ہاتھ زور سے
پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ خوف و حیرت

ڈالا۔ اکل نے انہیں چپ کرایا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا
بچی ہے غلطی بچوں سے ہی ہوتی ہے۔ ان کے سمجھانے
بجھانے پر امی اور خالہ چپ ہوئیں۔ ورنہ ان کی ڈانٹ
میری جان نکال رہی تھی۔

رات کا نچانے کونسا پہر تھا جب ہلکی سی آواز
سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے دیکھا دروازے میں
ایک گڑیا کھڑی ہے اور میری طرف دیکھ کر ہنس رہی
ہے میں نے چیخا چلانا شروع کر دیا سب گھروالے
اٹھنے ہو گئے میں نے کہا وہاں دروازے میں گڑیا
کھڑی تھی اور میری طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ سب
نے دروازے کی طرف دیکھا وہاں کچھ بھی نہیں تھا
سب نے اسے میرا وہم قرار دیا۔ اور سونے چلے گئے
میں بہت خوف زدہ تھی مجھے ساری رات نیند نہ آ سکی۔
صبح میں اپنے بیک سے کپڑے نکالنے لگی تو ایک کٹا ہوا
بازو پکڑوں کی جگہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔

میری چیخیں نکل گئیں سب گھروالے بھاگے
آئے میں نے انہیں سب کچھ بتایا مگر وہاں کوئی کٹا ہوا
بازو موجود نہیں تھا۔ میری خالہ نے تو میری امی کو کہہ
دیا کہ تمہاری بیٹی لگتا ہے پاگل ہو گئی ہے اس کے ذہن
پر کوئی اثر ہوا ہے۔ میرا امی میرے لئے از حد پریشان
تھیں۔ میں اب رات کو ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد
خوفناک چیزیں دیکھ کر چیخ پڑتی۔

ایک دن صبح سے ہی آسمان ابرا آلود تھا اور وقفے
وقفے سے بوند باندی بھی جاری تھی۔ لوگ اپنے اپنے
گھروں میں دیکے بیٹھے تھے اور پھر سونے پر سہا کہ یہ
کہ کڑکتی ہوئی سردی کا موسم۔

بچوں کے اوپر لحاف ڈال دیا گیا تھا۔ اگر صحن
میں بھی ٹکڑو دانٹ بجنے لگتے تھے آہستہ آہستہ دن سرکنا
رہا اور شام کے بعد پھر رات کی آمد آتھی اور پھر رات
کا گھپ اندھیرا۔ ہر سوں مسلط ہو جاتا تھا۔

صبح سے ہی میری حالت بہت دیگر گوں تھی میں
ڈری ڈری سہمی سہمی سوچوں کی اتھاہ گہرائی میں غوطہ زن
تھی خوف اور ڈر کی وجہ سے مجھ پر وقفے وقفے سے جیسے

بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

قسط نمبر 7

دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بھاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو رطخ حیرت میں ڈال دیں گے



آزمائی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دونوں کتے اس کے نظریات اور منصوبے کے مطابق نہیں تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لاٹھی بھی ٹوٹ جائے اور سانپ بھی مرجائے اس کے ذہن میں تو کوئی اور ہی تدبیر آئی تھی۔ وہ رشید کے لئے ایک چوہے دان بنانا چاہتا تھا۔ جس میں مقابلہ کرنے سے پہلے ہی رشید اس میں پھنس جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مکڑی کے جالے میں مکھی پھنس جاتی ہے۔

وسیم کے ذہن میں اچانک یہ خیال بجلی کی طرح آیا تھا۔ اس کے ذہن میں اس چوہے دان کا خیال ایک خاک کی صورت میں پیدا ہوا تھا..... اسے یاد تھا کہ آخری مرتبہ وہ اس جزیرے پر آیا تھا۔ اس نے جزیرے کے مرکز میں گرے۔ درخت پر انکوری تیل لپٹی ہوئی دیکھی تھی..... اب اس میں نئی شافیں بھی پھوٹ آئی تھیں۔ پھر اس نے بڑی تیزی اور تندہی سے..... اپنا کام شروع کر دیا۔

وہ درخت جس کے گرد انکوری تیل لپٹی ہوئی تھی۔ وسیم نے اس کو صاف کئے اور تقریباً ایک ایک چالیں فٹ لمبی ری تیار کی جو اطمینان بخش حد تک مضبوط اور پائیدار تھی..... وسیم کو معلوم تھا کہ وہ چوہے

وسیم ان خیالوں میں ایسا گم تھا کہ اسے رشید کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

پھر اسے یک نخت یہ احساس ہوا کہ رشید بھی جزیرے کے مشرقی کنارے پر اتر چکا ہوگا اور اب وہ سیدھا اس کی طرف چلا آ رہا ہوگا۔ رشید اپنے بارے میں پر اعتماد ہوگا وہ اسے خیر آزمانی میں مات دے دے گا۔ خیر آزمانی کے لئے مد مقابل کا قریب آنا لازمی شرط ہے۔ اگر حریف قریب نہ آئے تو خیر زنی کا ماہر کچھ نہیں کر سکتا۔

اگر اس کے پاس ایک خیر ہو تو وہ اسے پھینک کر مار بھی نہیں سکتا۔ اسے ہمیشہ یہ خوف رہے گا کہ..... اگر وار خالی گیا تو وہ تنہا اور غیر مسلح رہ جائے گا..... رشید کے حق میں یہی نکتہ بہترین رہے گا کہ وہ یہ جنگ ایک خیر سے لڑے تاکہ اسے وسیم پر جسمانی طور پر اور برتری حاصل رہے۔ اسی طرح وہ آسانی وسیم کو زیر کر سکتا تھا۔ وسیم کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ رشید مشرقی ساحل سے سیدھا جزیرے کے مرکز کی جانب رخ کرے گا۔ جزیرے کا مرکز اس کی یعنی وسیم سے بہت قریب تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے پہنچنے میں زائد وقت لگے گا..... وہ رشید سے جسمانی زور آزمانی اور خیر

ہے۔“ رشید نے بلند آواز میں کہا۔ وہ گھٹی جھاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔“ مجھے تم پر شرم آتی ہے.....! کوئی بھی اچھا شکاری ایسے چالوں کو فوراً ہی تاڑ لیتا ہے۔ کیا تم نے مجھے اندھا سمجھ رکھا ہے تم بے وقوف آدمی ہو.....!“

وسیم نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ یہ زیادہ بہتر اور مناسب تھا۔ رشید کا متحیرانہ انداز بھی اسے بولنے پر مجبور نہ کر سکا۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یہ طنز برداشت نہ کر پاتا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رشید نے اس کی موجودگی کا پتہ چلانے کے لئے اندھیرے میں ایک تیر چلایا ہے۔ وسیم کا خیال تھا کہ وہ طنز کر کے اسے طیش دلا رہا ہے تاکہ وہ اس کے سامنے آجائے اور تیروں کا نشانہ بن جائے۔ پھر ادھر رشید نے ایک تیر کمان میں چڑھایا اور مخالف سمت جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس طرح وسیم کو ایک سنہرا موقع ہاتھ لگا جس سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ ایسا احمق نہ تھا جیسا کہ رشید نے اسے سمجھ لیا تھا۔ نہ ہی وہ رشید کو احمق سمجھتا تھا۔ جو دشمن کو احمق سمجھتا ہے وہ خود سب سے بڑا احمق ہوتا ہے، رشید کو احمقانہ حرکت اسے اس کی توقع نہ تھی۔

”اب اس کے لئے رشید سے بچنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ وہ رشید کی عقابی نگاہوں سے اونچھل رہے اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ جتنا زیادہ رہے۔ یہ اس کے حق میں بہتر ہی ہوگا۔

وہ پھرتی سے جھاڑیوں کے عقب سے نکلا اور پوری قوت اور انتہائی تیز رفتاری سے رشید کی مخالفانہ سمت دوڑا۔ اسے احساس ہوا کہ رشید نے اس کا تعاقب بند کر دیا ہے۔ اس نے سرگمراہ پیچھے کی طرف دیکھا تو رشید کو اپنے سو قدم کے فاصلے پر بڑے ہی پرسکون انداز سے کھڑے پایا۔ اس نے ایک تیر کمان میں چڑھایا ہوا تھا اور بے حد اطمینان کے تھوہک کا نشانہ لے رہا تھا۔ اب وسیم کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اب رشید یقیناً اسے اطمینان سے نشانہ بنائے گا۔

وسیم کے پاس اب بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

پھر اسے سامنے جھاڑیاں نظر آئیں تو اسے اندھیرے میں امید کی کرن نظر آئی۔

وہ اس صورت میں رشید سے اپنے آپ کو بچا سکتا تھا کہ وہ جھاڑیوں تک پہنچ جائے۔ لیکن مسئلہ ان جھاڑیوں تک پہنچنے کا تھا۔ جیسے ہی ایک تیر اس کے ذہن میں آئی اس نے ایک لمحہ بھی دیر نہیں کی۔ پھر وہ جھاڑیوں کی طرف کودنا بن کر لپکا۔ پھر چند قدموں کی دوڑ لگانے کے بعد وہ دانستہ ریت پر گر گیا جہاں وہ چند لمحے کھڑا ہوا تھا۔ وہ پھر سرعت سے ریت پر کھڑے ہو کر تیزی سے دوبارہ بھاگا۔ لیکن اس مرتبہ وہ دگ زیک انداز میں بھاگ رہا تھا۔

اب وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ انتہائی تیزی سے دائیں جانب مڑا۔ اور پھر جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر ان کی طرف ایک لمبی جست لگائی جیسے ہی وہ ان جھاڑیوں میں گھس گیا تیر اس کے کولہے میں پیوست ہو گیا۔ چوں کہ وہ کھڑی کمان سے نکلا ہوا تیر تھا اس لئے وسیم اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے پاس کچھ محسوس کرنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ خاردار جھاڑیوں میں گرنے سے اس کے جگہ جگہ خراشیں آگئی تھیں۔ وہ زمین سے اٹھا اور اندھا دھند جھاڑیوں میں گھس گیا اور پھر گھستا چلا گیا۔ تیر بدستور اس کے کولہے میں پیوست تھا۔ تھوڑی دیر بھاگنے کے بعد وسیم نے مڑ کر دیکھا کہیں خون کے قطرے اس کے بھاگنے سے راستے کی نشاندہی تو نہیں کر رہے ہیں؟ لیکن خون اتنی کم تعداد میں نکل رہا تھا کہ وہ سارے کے سارا اس کی پتلون میں جذب ہو رہا تھا۔ دروکی پہلی ٹیس کے ساتھ ہی اس کا ذہن کام کر رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اب شاید مقابلہ ختم ہو چکا ہے۔ رشید نے خنجر کی جگہ تیر کا استعمال کر کے لڑائی کی شرائط کی خلاف ورزی کی تھی۔ اب اس پر مقابلے کو جاری رکھنے کا کوئی اخلاقی فرض باقی نہیں رہتا۔ اب اس کا صل یہ ہے کہ وہ کسی طرح جزیرے سے فرار ہو کر شہر پہنچے اور شہر جا کر

پولیس میں یہ رپورٹ درج کرا دے کہ رشید نے اس پر حملہ کرنے کے ارادے سے کیا ہے اور یہ خنجر کی موجودگی اس کے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس طرح رشید کو قاتلانہ حملے کے الزام میں دس بارہ برس کی قید ہو جائے گی۔ اور اس کے مستقبل کے تمام خواب ریت کے گھر وندے کی طرح مسمار ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں ترنم اس کی ہو جائے گی۔ کیوں کہ وہ بارہ پندرہ برس رشید کا انتظار کرنے سے رہی۔

ایک نخت وسیم کو احساس ہوا کہ وہ غلط سمت جا رہا ہے۔ جزیرے کا مغربی کنارہ ایک پتلی اور لمبی پٹی کی شکل میں سمندر کے اندر دوڑتک چلا گیا تھا۔ وہاں سے تقریباً پانچ سو فٹ کے فاصلے پر وہ چٹانی سلسلہ تھا جو سیدھا خشکی سے جا ملتا تھا۔ وہ چٹانی سلسلہ ایک پتلی سی پٹی کی شکل میں تھا جو جوار بھانا کے وقت پانی کے اندر روپوش ہو جاتا تھا اور جب پانی اتر جاتا تھا وہ پانی سے باہر نظر آتا تھا۔ اس کے لئے بہترین ترکیب یہ تھی کہ وہ جزیرے کے مغربی کنارے پر جا کر پانچ سو فٹ کا فاصلہ تیر کر پار کرے اور چٹانی سلسلے پر پہنچ جائے۔

وہ وہاں آسانی سے شہر جا سکتا تھا۔ اسے صرف یہ کرنا تھا کہ وہ کسی محفوظ جگہ چھپ کر بیٹھ جائے اور رشید جب اسے تلاش کرتا ہوا آگے بڑھ جائے تو وہ خاموشی سے جزیرے کے مغربی ساحل کی طرف بڑھ جائے۔ ایسی صورت میں جب کہ رشید تیر کمان سے لیس تھا اور خود زخمی حالت میں تھا۔ اسے رشید سے مقابلہ کرنے کا خیال اچھا محسوس نہ ہوا اور اب پوزیشن ایسی تھی کہ وہ اپنے خنجر سے رشید کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔

رشید جزیرے کی مشرقی سمت سے وسیم کو تلاش کرتا ہوا اور بوسوگھٹا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے اپنے شکار کے اس طرح آسانی سے بچ کر نکل جانے پر سخت افسوس تھا۔ اس نے وہ جگہ جہاں وسیم چھپا بیٹھا تھا۔ وہاں اسے خون کے قطرے زمین پر پڑے دکھائی دیے

تھے جس سے اس کے علم میں یہ بات آگئی تھی۔ وسیم زخمی ہے اور پھر شرائط کے مطابق وسیم کے پاس صرف ایک خنجر ہے۔ لہذا وسیم اس سے بچنے کی غلطی نہ بھولے سے بھی نہیں کرے گا۔

وسیم کے اس طرح جنگل میں روپوش ہو جانے سے اسے بے حد تشویش تھی۔ اس کا سارا مزاج کرکڑا ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اس کے لئے صورت حال سنگین ہو کر رہ گئی تھی۔ رشید نے خود کو وسیم کی جگہ رکھ کر سوچا کہ اس صورت حال میں وہ کیا کرے گا.....؟ اس کا سیدھا سادا سا جواب یہ تھا کہ وسیم جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا..... کیوں کہ اب وہ اس سے مقابلہ کرے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے چوں کہ شرائط کی خلاف ورزی کی تھی اس لئے وہ جزیرے سے فرار ہو کر شہر جائے گا اور وہاں پولیس اسٹیشن پہنچے گا اور اس کے خلاف قاتلانہ حملے کی رپورٹ درج کرا دے گا تاکہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ وہ کسی بھی قیمت پر وسیم کو جزیرے سے فرار ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اب تو وسیم کا جلد از جلد مر جانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ خود اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ وسیم کے بچ جانے پر وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اب وسیم کی موت ہی خود اس کی آزادی، نیک نامی اور ترنم سے شادی کرنے کی ضمانت تھی۔

رشید کو ذرا سے غور و فکر کے بعد یہ احساس ہو گیا کہ وسیم فرار ہونے کے لئے کس راستے کو اختیار کرے گا تاکہ وہاں سے پانچ سو فٹ کا فاصلہ تیر کر طے کر سکے اور پھر پانی میں ڈوبے ہوئے چٹانی سلسلے کے ذریعے شہر تک پہنچ جائے۔ رشید نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے یہ کرنا ہوگا کہ شکار کسی بھی قیمت پر اس کے جال سے نکل کر جانے نہ پائے۔ لیکن شکار کو تلاش کرنے میں وقت لگے گا۔ اس لئے کہ شکار نہ صرف بہت تیز اور ہوشیار ہے بلکہ بے حد خطرناک ہو گیا ہے۔ وسیم نے اپنے فرار ہونے کی سمت تبدیل کر دی

تھی اور وہ گھوم پھر کر دوبارہ جزیرے کے مرکز کی طرف آ گیا۔ اس نے چھپنے کی ایک محفوظ جگہ ڈھونڈی اور زمین پر بیٹھ کر اپنے کولے میں پیوست تیر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں اسے بہت دقت پیش آئی۔ کیوں کہ وہ اس جگہ کو دیکھ نہیں سکتا تھا جہاں تیر پیوست تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ انگلیوں سے تیر کی گہرائی اور زاویے کا اندازہ لگا کر تیر نکال لیا۔ ایسا کرنے میں اسے بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن اس نے اپنے دانت مضبوطی سے بٹھکے لئے تاکہ اس کے منہ سے کوئی آواز اور کراہ نہ نکل سکے۔ تیر کے باہر نکلنے ہی خون اس کے زخم سے ابل پڑا۔ اس کے خنجر کی مدد سے اپنی پتلون کا وہ پانچا پھاڑ لیا جو خون میں تر نہیں تھا اور اسے بھاڑ کر زخم پر پٹی باندھ لی۔ گو پٹی میں خاصا خون لگ گیا لیکن اس کی وجہ سے خون بڑی حد تک لگنا بند ہو گیا۔

وسیم کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ یہ وقت سستانے اور آرام کرنے کا نہیں ہے کیوں کہ وہ موت کے حصار میں ہے۔ رشید اسے تلاش کرنا ہوا یقیناً اس کی طرف آ رہا ہوگا۔ جو غلطی اس نے غلط سمت دوڑ کر کی تھی اور جس کا اسے احساس ہوا تھا اس طرح رشید کو اپنے مرکز کی طرف آئے بغیر جزیرے کے مغربی کنارے تک پہنچنا بے حد دشوار تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ وہ غور سے اس خون آلود تیر کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے سرخ سرخ خون کو تیر کی نوک پر دیکھ کر وسیم کے جسم میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑنے لگی۔

رشید کو اس پر جو فوجیت تھی وہ تیر اور کمان کی تھی۔ وسیم کھڑا ہو گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں اب خون کا ایک ننھا سالا ب بن گیا تھا۔ جو تیر سے نکلنے ہی اچانک اس کے زخم سے بہنے لگا تھا۔ وسیم کچھ دیر تک سکتے کی سی حالت میں اس خون کے تالاب کو دیکھتا رہا۔ جزیرے سے فرار ہونے کا خیال اس کے دل سے بالکل نکل چکا تھا اور رشید سے اس خون کی پوری قیمت وصول کرنے کا خیال اس کے دل کے ہر کونے میں تیزی سے جڑ پکڑ رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر

اس کا سامنا رشید سے ہوگا اور وہ پورے جزیرے کو اس کی تلاش میں چھان مارے گا۔ اور اس کا چپچپے تک نہیں دیکھ لے گا وہ بچپن و سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ کیوں نہ اب وہ رشید کو قانون کے حوالے کر کے ہی دم لے گا۔ اس لئے وہ رشید سے غافل رہنے کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ رشید اسے روکنے کے لئے ناکہ بندی کی کوشش کرے گا۔ لیکن اب وسیم نے فرار کا خیال دل سے نکال پھینکا تھا۔ کیوں کہ اب یہ جنگ ایک لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے نہیں رہی تھی بلکہ دو جانی دشمنوں کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔

اس نے ترم سے یہ بات کہی تھی کہ وہ سہاگ کی پہلی رات رشید کا سرمہ دکھائی میں دے گا۔ وہ ایسا کوئی درندہ صفت، سفاک اور ظالم نہیں تھا۔ البتہ رشید ضرور ایسا کر سکتا تھا۔ وسیم لڑائی سے پہلے بہت پر امید تھا۔ پر اعتماد تھا۔ مگر اس نے رشید کے بارے میں جو اندازے لگائے تھے وہ غلط ثابت ہوئے تھے جن کی قیمت اسے خون سے ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کے دشمن کو اس پر بڑی فوقیت تیر کمان کی تھی۔ لیکن اب اس کے پاس ایک تیر آ گیا تھا اور اسے ایک کمان کی ضرورت تھی۔ دوسرا تیر جو اس کے سر پر سے گزرا تھا وہ کہاں تھا اور اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔

وسیم اس جگہ گیا جہاں اس نے اپنی پیلٹ کے ذریعے سے چلک دار تنے کے درخت کو جھکا کر دوسرے درخت سے باندھا ہوا تھا وہ اس درخت کو آزاد کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کی اس طرح کی آواز پیدا ہوئی تھی کہ اسے سن کر رشید اس کی پوزیشن کا باآسانی اندازہ لگ لیتا۔ اس نے اس کی مدد سے اس درخت کو اس طرح باندھ دیا اور اپنی پیلٹ پھندے سے آزاد کر لی۔ پھر وہ ایک ایسی خم دار مٹی کو تلاش کرنے لگا جو کمان کا کام دے سکے۔ وہ آہستہ آہستہ جزیرے کے مغربی ساحل کی

طرف بڑھتے ہوئے ایسی مٹی تلاش کرنے لگا۔ اسے اپنے مطلب کی ایسی پٹیاں اور ایک جڑی..... جوڑی پٹی سے اس نے کمان کے دونوں ردوں کو مضبوطی سے باندھ لئے۔ اس طرح جو تیر کمان رشید کی تیر کمان کے مقابلے میں کم تر تھی لیکن مثال کے قابل ضرورت تھی اور کام دے سکتی تھی۔ اس نے رشید کے تیر کو کمان پر چڑھا کر پچاس فٹ کے فاصلے پر ایک چیز کو نشانہ بنایا۔ تیر نشانے سے دس فٹ کے فاصلے پر سناٹا ہوا گزر گیا۔ دوسری مرتبہ اس نے اپنے ٹارگٹ کا فاصلہ کم رکھا اور مشقیں شروع کر دیں۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اگر ٹارگٹ پر رشید جیسا لمبا ترنگا آدی ہو تو وہ تیس فٹ کے فاصلے سے بھی نشانہ لے سکے گا۔ لیکن ایک تیر اس مقصد کے لئے ناکافی تھا۔ اس نے چند مضبوط لکڑیاں چنیں اور انہیں جلدی جلدی چھیل کر تیر کی شکل کا بنالیا اور اس کے منہ آگے سے جوڑا کیا۔ اب مسئلہ ان کا تھا۔ اس کے لئے اسے جزیرے کے ساحل تک جانا۔ وہاں اس نے چند سپیاں ڈھونڈیں۔ ان کے دو ٹکڑے کئے اور ان تین تیروں میں اپنی پیلٹ میں بچی ہوئی پتلی ٹکڑوں سے باندھ دیا۔ بڑی مضبوطی سے خوب کس کر۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو شاید اسے بنائے ہوئے تیروں کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

اسے اپنے بنائے ہوئے تیروں اور کمان پر زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ اسے شہ قیاس تھا کہ اس کے بنائے تیر ٹکڑوں کے فاصلے سے بھی صحیح نشانہ پر لگ نہ سکیں گے۔ لیکن کچھ نہ ہونے پر کچھ ہونے سے انسان کو بڑی تقویت ملتی ہے۔ لہذا وہ اپنی تمام تیاریاں مکمل کر کے رشید کا انتظار کرنے لگا۔

رشید اس مرتبہ بڑی خاموشی سے آیا۔ وہ پہلے کی طرح گڈنڈی پر آ رہا تھا اور رک کر دائیں بائیں نگاہیں اور جہاں بھی وسیم کے چھپنے کا شہ ہوتا وہ اندر سے ایک ایک خون خوار شکاری کتے کی طرح اس کا ہاتھ لیتا اور پھر اسے نہ پا کر گڈنڈی پر آ جاتا۔ اس

مرتبہ وہ ایک گڈنڈی کو گھور رہا تھا۔ وہ وسیم کے بچھائے ہوئے کسی بھی جال میں چھپنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کے دشمن کے پاس صرف ایک خیر تھا۔ تو کیا وہاں.....؟ آخر وہ اس کا دشمن تھا۔ وہ دشمن کو کمزور سمجھنے کا قائل تھا اور نہ ہی اسے کوئی ذرا سا بھی موقع دینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ ذرا سی رعایت اور بے پروائی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی۔

وسیم..... رشید کی ایک ایک حرکت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک برق سرعت سے ایک منصوبہ آیا۔ ان جھاڑیوں سے نکل کر جہاں وہ چھپا ہوا تھا کھلی جگہ میں جلدی جلدی ریت کھودنے لگا۔ رشید اب بھی اس سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ جلد ہی اسے ایک گھونگال گیا۔ اسے مٹی میں دبا کر واپس اپنی جگہ آیا۔

رشید جب اپنی تدبیر کے مطابق گڈنڈی پر اس کے قریب آیا اور پہلے دائیں طرف جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا تو وسیم نے اس پر نظریں جمادیں۔ اس نے رشید کے بدن کو جھٹکا لیتے ہوئے دیکھا۔ غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے اور وہ اس کی نظروں کی گرفت میں ہے۔ وہ جھاڑیوں کے جھنڈ سے تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا خیال تھا وسیم اس جھنڈ میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ وسیم کے قریب جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جب کہ وسیم گڈنڈی کی دوسری جانب چھپا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

رشید نے تیر کمان میں چڑھایا ہوا تھا اور بڑی محویت کے عالم میں اسے اپنے تمام خواہشوں کی مدد سے وسیم کو دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وسیم نے گیند پھینکنے کے انداز میں نشانہ باندھ کر گھونگے جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف اچھال دیا۔ گھونگھا فضا میں اوپر بلند ہو کر سیدھا جھاڑیوں کے جھنڈ میں گرا۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر رشید کو یقین ہو گیا کہ وسیم اس جھنڈ میں چھپا ہوا ہے۔ وہ حملہ کرنے کے انداز میں تیر کمان پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور تیر قدموں سے اس جھنڈ کو

دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا لیکن بے حد محتاط تھا۔ وہ اپنے دشمن کو ادھر پر حاوی ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔

وسیم سرعت سے اپنی جگہ سے نکلا اور بلی کی طرح دبے پاؤں تیزی سے گلیڈنڈی کے دوسری طرف بڑھا۔ رشید جویت کے عالم میں بدستور جھاڑیوں کے اس جھنڈ کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب وسیم اس سے تیس فٹ کے فاصلے پر پہنچا تو وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے رشید والا تیرکمان پر چڑھایا اور چلا کھینچا۔

”رشید! میں یہاں ہوں۔“ وسیم نے اسے انتہائی سرد لہجے میں مخاطب کیا۔ ”ادھر دیکھو۔“

پھر جو کچھ ہوا وہ وسیم کی توقعات کے خلاف تھا۔ رشید اپنی جگہ سے اتنی تیزی سے اچھلا جیسے ہندو کی نالی سے گولی نکلتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وسیم کی طرف مڑتے مڑتے جیسے ہی اس کی نظر وسیم پر پڑی اس نے ہنسنی ہوئی کمان سے تیر چھوڑ دیا۔ وسیم نے رشید کے سینے کا نشانہ لے رکھا تھا۔ جیسے ہی رشید کا جسم چند لمحوں کے لئے ساکت ہوا اس نے پوری قوت سے تیر چلایا۔

یہ وہی لمحہ تھا جب رشید نے اپنا تیر چھوڑا تھا۔ جو رشید نے بغیر نشانے کے چلایا تھا۔ وہ ایک زنانے کے ساتھ وسیم کے کان کے پاس سے نکل گیا۔ وسیم نے نشانہ لے کر تیر چلایا تھا لیکن اس کے باوجود وہ نشانے پر نہیں لگا۔ جبکہ سینے کے بجائے پسلیوں میں گھس گیا تھا۔

رشید آدھا زمین پر تھا اور آدھا فضا میں۔ اس نے جلدی سے دوسرا تیر نکالا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے تیر ایک طرف پھینک دیا اور پھر اس نے خنجر نکال لیا۔ یہ دیکھ کر وسیم نے اپنے تیر کمان پھینک دیئے اور رشید کی طرف لپکا۔ اپنے ناکارہ تیروں اور کمان پر ترجیح دیتا تھا۔ خنجر سے مقابلہ کرنے میں اسے زیادہ اطمینان تھا اور بے جگری سے لڑ سکتا تھا۔ اس کی ہمت اور طاقت عموماً آتی تھی۔ وہ رشید سے پانچ قدم پر رک گیا۔

اب دونوں دشمن ایک دوسرے کے مقابل کھڑے آکھوں میں آنکھیں ڈالے غضبناک نظروں سے دیکھ رہے تھے اور رشید دھڑکی لگ رہا تھا۔ رشید گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے حقارت نفرت اور درندگی جھانک رہی تھی۔

بجلی کی سی سرعت سے رشید کا خنجر والا ہاتھ ایک دم سے پیچھے ہوا۔ وہ حرکت اتنی تیز تھی کہ جس کا آنکھوں سے دیکھا جانا ناممکن تھا اور پھر تیر کی طرح خنجر رشید کے ہاتھوں سے نکل کر وسیم کی طرف لپکا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وسیم اس کے جواب میں بے بس تھا۔ اسٹیل کا خنجر بجلی کی طرح اس کی طرف آ رہا تھا۔ بے اختیار وسیم نے ہانک کے انداز میں اپنا ہاتھ خنجر روکنے کے لئے آگے بڑھایا۔ شاید وسیم کی قسمت اچھی تھی۔ اگر وہ خنجر ہاتھ کی کہنی کے قریب نہ لگتا تو وہ سیدھا سینے میں اتر جاتا۔ خنجر اتنی قوت سے پھینکا گیا تھا کہ وسیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کی کہنی کو توڑتا ہوا اندر گھس گیا ہو۔ کیوں کہ اب وسیم کے زندہ رہنے کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ وسیم نے رشید کا خنجر کہنی سے کھینچ کر بغیر دیکھے پیچھے کی طرف اچھال دیا۔ فوراً ہی اس کی کہنی سے خون بہنے لگا۔ لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ سیدھے ہاتھ میں وہ خنجر دبائے رشید کی طرف بڑھا۔ اسے صرف ایک ڈر تھا کہ نہتا ہونے کے بعد رشید کہیں بھاگ نہ جائے۔ وہ رشید کا پیچھا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے کولے کا زخم سوچ رہا تھا۔ اگر رشید بھاگ کر کھڑا ہوتا تو وہ اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ رشید سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رشیدی فطری طور پر بزدل تھا۔ رشید شاید تنہا ہونے کے بعد واقعی بھاگ جاتا۔ لیکن وہ ایک طویل عرصے وسیم کو حقارت بھری نظروں سے دیکھنے کا عادی تھا۔ کسی اس کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ وسیم اسے جسمانی طور پر نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ

اس کی نفرت اتنی شدید تھی کہ وہ اپنی دوسری ناکامی پر غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس کا چہرہ دیوانگی کے عالم میں اس بری طرح مسخ ہو گیا کہ وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشتانہ پن صاف جھلک رہا تھا۔ وسیم کو قریب پا کر وہ اس طرح سے پیچھے ہٹا جیسے کوئی شیر اس پر حملہ آور ہونے والا ہو۔ پھر رشید تیزی سے زمین پر پڑی خشک ٹہنی اٹھانے لگا۔ جیسے اس کے نزدیک کوئی ہتھیار ہو۔

وسیم بہت محتاط اور چوکنا تھا اور اس کی بدلتی ہوئی کیفیات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے رشید دیوانے درندے کی طرح نظر آیا جو غصے اور دیوانگی سے اندھا ہو رہا تھا۔ رشید نے بڑی ٹہنی کو اٹھا کر ہوا میں اس طرح لہرایا جیسے وہ ہلکی سی چٹری ہو اور وسیم پر عقاب کی طرح جھپٹا۔ وسیم پھرتی سے اسے جھونک دے کر ایک طرف ہٹا اور اس کے ساتھ اس نے اپنا خنجر والا ہاتھ پوری قوت سے رشید کی طرف بڑھایا۔ خنجر رشید کی پسلیوں میں گھس گیا۔ رشید ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ خنجر اس کی پسلیوں سے باہر نکل گیا۔ وہ بدستور وسیم کے ہاتھ میں اس سے پہلے کہ وسیم کھینچ کر اپنا دوسرا وار کرنے کی سوچتا اس نے رشید کو دونوں ہاتھوں میں بھاری بھر کم ٹہنی لاش کی طرح پکڑے خود پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ اس لمحے وسیم سب کچھ بھول گیا۔ اس پر رشید کے جسم میں خنجر اتارنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس نے لکڑی کے وار سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر رشید سے ٹکرایا۔ اس کے خنجر والا ہاتھ دس تیر تک رشید کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس نے خنجر باہر کھینچا اور دوبارہ رشید کے سینے میں پوری قوت سے گھمایا۔ خنجر گوشت کو پھاڑتا ہوا اور پسلیوں کو توڑتا ہوا رشید کے سینے میں دھنستا ہوا چلا گیا۔ وہ عمل اس قدر پرسکون تھا کہ وسیم نے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس کی آنکھوں میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور دوسرے ہی لمحے وہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

وسیم کو جب ہوش آیا تو دوسری صبح کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ وسیم بہت دیر تک آنکھیں کھولے اپنی یادداشت کو ذہن کے تاریک گوشوں میں ڈھونڈتا اور جھانکتا رہا تھا۔ پھر اسے رشید کا مردہ جسم اپنی ٹانگوں پر پڑا ہوا نظر آیا۔ وہ اس لمحے بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کولے اور کہنی کے زخم سے کافی خون بہا تھا لیکن ہوش میں آنے پر اس نے اپنے زخموں کو بہتر حالت میں پایا۔ خون نکلنا بند ہو چکا تھا اور زخموں کے منہ پر خنک ہوا سے کھرنڈ ساجم گیا تھا۔ پھر اس نے دھکا دے کر رشید کو اپنی ٹانگوں سے ہٹایا اور لاش کے بے لہو چہرے کو دیکھنے لگا۔

جب ان دونوں کے دوست جزیرے پر دوسری صبح فاتح کو لینے پہنچے تو انہیں وسیم رشید کے مردہ جسم کے پاس لیٹا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان اور فلاسک میں گرم گرم کافی لائے تھے۔ فرسٹ ایڈ کا سامان بھی تھا۔ وسیم کا دوست ایک بڑا سا بریف کیس لایا تھا جسے لانے کے لئے وسیم نے کہا تھا۔ وسیم جو پیش گھٹنے سے بھوکھا تھا۔ وسیم نے ان دونوں سے کہا کہ رشید کی لاش کو کہیں دور لے جا کر کسی گہرے گڑھے میں دفن کر دو۔ کسی قریبی گڑھے میں دفن کرنا مناسب نہیں۔ اگر اتفاق سے کسی نیوی کی موبائل لالچ آگئی جیسا کہ کسی بھی وقت آسکتی ہے اس نے دیکھ لیا کہ لاش کی تدفین کی جارہی ہے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس کی بات مان کر وہ رشید کی لاش کو اٹھا کر جنوب کی جانب چل دیئے۔ جہاں بارش سے چھوٹے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے۔ وسیم نے دیکھا کہ ٹھن میں پراٹھے، ابلے ہوئے انڈے، مکھن ملائی اور انڈوں کا آمیت تھے۔ وہ ان سے پیٹ کی آگ بجھانے لگا۔ پھر اس نے فرسٹ ایڈ بکس دیکھا۔ اس میں درو کے کپسول، زخم کا مرہم اور مسکن گولیاں بھی تھیں۔ اس نے پانی کی مدد سے انہیں ایک ایک کر کے نگل لیا۔ وہ پانی بھی دو بوتلوں میں بھر کر لائے تھے۔ پھر وہ گرم گرم کافی پینے لگا تو اسے بڑا آرام، فرحت اور سکون کا احساس ہوا۔ اس نے رشید کو دفن

کرنے میں ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ اس لئے کہ اس کی حالت اس وقت اس قابل نہیں تھی کہ چند قدم بھی چل سکے اور پھر رشید کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اس قابل تھا وہ درندہ صفت تھا۔

چند قدم پر جو تالاب تھا وہاں وسم نے کپڑے اتار کر ایک کپڑے سے سارا جسم صاف کیا۔ منہ دھویا۔ پھر اس نے بریف کیس میں سے ایک جوڑا نکال کر پہن لیا اور خون آلود کپڑے ساتھیوں کو دینے کہ کسی قریبی گڑھے میں دفن کر دیں۔ اس بریف کیس میں جو اور چیزیں موجود تھیں وہ اس نے کیوں اور کس لئے رکھی تھیں وہ خود ہی جانتا تھا۔

وسم نے اپنے دوست مجید سے درخواست کی کہ اسے واپس شہر لے جانے کے بجائے اس مسافر جہاز پر سوار کر دے جو سندھ پ بار یہال اور ایک اور شہر ہوتا ہوا ڈھاکا جاتا تھا۔ پھر دونوں اسے لے کر دریا کی حدود کی طرف بڑھے۔ اتفاق سے دور سے ایک مسافر اسٹیمر آتا دکھائی دیا۔ کارگو بھی تھا اور مسافر اسٹیمر بھی۔ اس اسٹیمر کو ان کی سمت آتا دیکھ کر وسم شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کے دوستوں نے اس کی یہ بات سن کر شہر واپس نہیں جانے گا۔ عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

وسم کو احساس تھا کہ اب اسے اس شہر کو چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ کیوں کہ اب اس کے راستے میں کوئی دیوار نہیں رہی اور نہ ہی پیروں میں کوئی زنجیر۔ اب وہ ایک فاتح تھا۔ اس دنیا میں رشید کے عبرتناک انجام سے واقف تھے۔ مجید اور اتاپو۔

وہ تینوں وفادار اور قابل اعتماد دوست تھے۔ اسے معلوم تھا کہ کسی کی زبان سے بھی کبھی رشید کے انجام کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔ وہ شہر جاسکتا تھا۔ بیماری کے بہانے مجید کے ہاں چند روز علاج کے لئے رہ سکتا تھا۔ وہاں اس کے زخموں کو چھپا سکتا تھا اور زخموں کے مندل ہو جانے کے بعد وہ اپنی پرانی دوبارہ شروع کر سکتا تھا اور فاتح ہونے کی حیثیت سے ترنم کو حاصل کر سکتا تھا۔ اسے ترنم کے وعدے پر اعتبار تھا۔ وہ

اس کی پابند بھی تھی اور اس نے یہ ہر پیمانہ پٹیا تھا۔ لیکن ترنم کو تو رشید کی فتح کا پورا یقین تھا۔ اب اگر وہ فاتح کی حیثیت سے ترنم کے سامنے جائے گا تو ترنم بھی اس کے فاتح ہونے کا یقین نہیں کرے گی۔ وہ ہمیشہ یہی کہے گی کہ اس نے رشید کو دھوکے اور فریب سے شکست دے کر مردوں کی طرح مقابلہ کر کے نہیں۔ اور پھر وہ ایسے دھوکے باز فاتح سے نفرت کرنے لگے گی جو اس کے محبوب کو شکست دے کر اس کے جسم کا مالک بن گیا تھا اور پھر اس کا یہ خیال بھی ہوگا کہ وہ اسے کھلونا بنا کر خوب کھیلے گا۔ اور اس پھول کو دن رات روندنا مستلزم اسراف کی بے رحمی اور درندگی سے چکھتا رہے گا۔ اس میں محبت نام کی ایک رتق تک نہیں رہے گی۔ اسے جو ان ہی سمجھے گا۔ اسے مجبور کرے گا وہ اسے ہر طرح سے خوش کرے۔ اس کے پیر کی جڑی بن جائے۔ وہ اس نفرت کا بدلہ لے گا جو بات اس نے اس روز باغ میں کہی تھی۔

اگر رشید اسے شکست دے کر ترنم سے شادی کر لیتا تو کچھ رے ترنم پر رشید کی حقیقت سامنے آ جاتی اور اس کا اصل چہرہ جو بے حد مکروہ اور گھٹانا تھا اور جو چہرے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ دیکھ لیتی اور وہ اسے بزدل، کمینے اور اس پنج آدمی سے نفرت کرنے لگتی۔ پھر اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ رشید وہ نہیں ہے جو اسے نظر آتا تھا۔ لیکن اب رشید اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور مرنے کے بعد ترنم کی نظروں میں رہتی دنیا تک ہیر و بن گیا تھا۔

اس کے دل کے کسی کونے میں ایک اعتقاد کوشش رہا تھا کہ رشید بھی وہی تھا۔ وہ واپس شہر چلا جائے اور ترنم کو حاصل کرے جس کے حصول کی تمنا شدت اور جذبات کی رویں پرورش پارہی تھی اور اپنی باقی زندگی نفروں کی کڑی دھوپ میں گزارے۔ اب اس کے دل میں ترنم کی محبت کی رتق بھی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ کہیں گہرائیوں میں دفن ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ترنم نہایت حسین۔ جاذبیت

سے بھر پور۔ بجلی بھرے گداز اور پر شباب بدن کی۔ پر کشش اور رشید کی طرح میٹھی تھی۔ اس رات ترنم نے جس خود سپردگی اور دلہانہ انداز سے رشید کو اپنے آپ کو جس فانی اور مہربانی سے نوازا تھا وہ اسے کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ جوان تھا۔ طاقت ور تھا۔ اس کے دل میں جوانی کی انگلیں اگڑائیاں لے رہی تھیں۔ وہ اسے کھلونا اور کتیا سمجھ کر حقارت اور نفرت کا سلوک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ رشید نہیں تھا۔ ترنم نے اسے کیسی مار ماری تھی۔ مگر وہ جیت کر بھی ہار گئی تھی۔ اس نے نفرت کی۔ تو پھر وہ تدریجاً مار ماری تھی اب ساری زندگی وہ خود اس کی آگ میں جلتی رہے گی۔ اب اس کی عزت داغ دار ہو چکی تھی۔ اور پھر اب خالی برتن تھی۔ ایسی ذلت جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وسم ڈھاکا جانے والے جہاز میں سوار ہو کر اس وقت اس کشتی کو دیکھتا رہا جس میں مجید اور اتاپو بیٹھے ہوئے تھے جب تک وہ ایک باریک نقطہ بن کر دریا کی سرکش اور پر جوش موجوں میں اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

جب وہ ڈھاکا کا پہنچا تو اس نے ایک اسپتال میں نہیں دن تک رہ کر اپنا علاج کرایا۔ علاج تو ایک بہانہ تھا۔ آرام کرنا اور سوچنا تھا کہ اب اسے اپنی زندگی کیسے اور کس طرح گزارنی ہے۔ جیل میں اس نے جو کچھ سیکھا تھا اس نے اسے مثبت زندگی اور دلچسپی اور مظلوم انسانیت کی خدمت کا بیڑا اٹھالیا۔ اس نے بڑی بڑی ہم سرکیں اور کارنامے انجام دیئے۔ یوں اس کی آمدورفت ہندوستان کا ہے لگا ہے ہوئی رہی تھی۔ پھر وہ بلیک ٹانگہ بن گیا۔ اسے اپنا ماضی یاد آ جاتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی نیلوفر کی زندگی میں جھانکا نہیں۔ لیکن یہ اس کے لئے بڑی مسرت افزا خبر تھی کہ اس کا شوہر صحت یاب ہو کر ملازمت کر رہا تھا۔ وہ آسودہ حال زندگی گزار رہا تھا۔ ترنم کو بڑا شکی مزاج شوہر ملا تھا جس نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس کا سارا غور، گھمبہ، تکبر اور

پندار حسن خاک میں مل چکا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ اسے خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسے جو سزا مل رہی تھی وہ اپنے کاکے بھگت رہی تھی۔

☆.....☆.....☆
اب وہ بلیک ٹانگہ عرف دیوکار تھا۔ ممبئی شہر میں رہ کر دہری زندگی گزار رہا تھا۔ ایک روز وہ سہ پہر کے وقت شام کے اخبارات دیکھ رہا تھا کہ بھینی بھینی خوشبو کی مہک نے نہ صرف اسے معطر کر دیا بلکہ اس کے دفتر کو بھی۔ یہ مہک کسی لڑکی یا جواں سال عورت کے لباس سے پھوٹی ہوئی اس کے دفتر میں پھیل گئی تھی۔ راہ داری سے شاید کوئی صنف نازک جھکتی، تھرتھکتی اور لپکتی گزر رہی تھی۔ یا ابھی اس کے دفتر کے سامنے سے نہیں گزری تھی اور بس گزرنے والی تھی۔

یہ کوئی نئی اور حیرت اور تعجب کی بات نہیں تھی۔ بازاروں میں، تقریبات اور بسوں میں صنف نازک خوشبوؤں میں بسی ہوتی تھی۔ جیسے پانی سے نہانے کے بجائے سینٹ یا عطر سے غسل کیا ہو۔ شیشی انڈلی ہو جیسے شیشی مفت میں ملی ہو۔ عورت مردوں کو متوجہ کرنے کے لئے نامناسب، بھڑکیلے اور ایسے لباس میں ملبوس ہوتی ہے کہ وہ بے حجاب سی دکھائی دیتی ہے۔ یا پھر خوشبو سے متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب کہ اس کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ تو خود خوشبو ہوتی ہے۔

ٹانگہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر خوشبو جیسے دروازے کے نیچے سے گھس آئی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ دستک خوشبو دے رہی ہے۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

ممکن تھا کہ وہ ہڑ بڑا کے پیچھے ہٹ جاتا۔ لیکن شاید اس میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ ماضی میں جس حیرت اور صدمے سے گزر چکا تھا اب اس کے نزدیک بڑی بڑی باتوں کی اہمیت نہیں تھی۔ سرو جاس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہی مہتاب چہرہ۔ وہی زلفوں کی سیاہ ریشمی

گھٹائیں، وہی رخساروں کے کنول..... وہی ہونٹوں کے گلاب..... جھیل سی سیاه آنکھوں میں وہی چمک جیسے کوئی جوشیلا پچھ دنیا کے سارے بھید جان لینے کے لئے گھر سے نکلا ہو..... ذرا بھی توفیق نہیں آیا تھا۔ اس کی شگفتگی اور شادابی میں.....

ساجن نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا مگر سرو جانے کیسی سنگ دلی سے اسے دھوکا دیا تھا..... اس کے بعد تو ٹائیگر کے خیال میں اس کے وجود سے نقصان اٹھنا چاہئے تھا..... مگر وہ مہک رہی تھی۔ رات کی رانی کی طرح..... اس کا گمان غلط تھا کہ سرو جانے اسے سڑک کے پار کھڑے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”کیا اندر آنے کو بھی نہیں کہو گے؟“ اس کے لہجے میں مان بھی تھی..... اور متانت بھی، التماس بھی تھی۔ تمکنت بھی۔

ٹائیگر خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ قامت میں ٹائیگر سے قدرے نکلتی ہوئی تھی۔ اس کے پاس سے گزر کر دفتر والے کمرے میں آ گئی۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے چند لمحوں کے لئے ادھر ادھر جائزہ لیتی رہی۔ پھر دیوار پر آوازاں تصویروں کو دیکھنے لگی۔ پورا دفتر مہک اٹھا تھا۔

ٹائیگر نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ اس کے دفتر کی دیواروں پر جو تصویریں آویزاں تھیں ان میں ایک تصویر شہزادہ گھوڑے کی تھی۔ دنیا کا انتہائی تیز رفتار عربی اسل گھوڑا جس نے اب تک اپنی تیز رفتاری کی مثال قائم کی ہوئی تھی۔

”تم ابھی تک اس گھوڑے کو عزیز رکھتے ہو..... آخر وہ کب تک ریس کے میدان میں بادشاہ بنا رہے گا..... نشیب و فراز..... ہار جیت متقدری ہوتی ہے..... کل اس کی جگہ کوئی اور گھوڑا لے لے گا۔“

ٹائیگر نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، وہ جس لباس میں تھی نا مناسب اور بے حجاب سا کر رہا تھا۔ یہ تو فیشن تھا۔ عربی غیر محسوس انداز سے ریہرسل کی طرح بھینکتی جا رہی تھی۔ ساجن نے اسے جو پرس لا کر دیا

تھا۔ وہ فرانس کا تھا۔ ٹائیگر اسے دیکھتا رہا چند گھنٹے پہلے وہ اس کے متعلق کیسے محترم اور خوب صورت احساسات رکھتا تھا کہ وہ سر بہ سر ساجن کے لئے۔ آخر دم تک میاں بیوی نے شریک سفر رہنے کا جو وجہ ایک دوسرے کو دیا ہے۔ انہیں موت ہی ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہے۔

اب ٹائیگر کی دانست میں وہ کسی کے لئے بھی تھی۔ یہاں تک اس کے لئے بھی ہو سکتی تھی۔ وہ انسانوں کو پڑھنے میں اپنے آپ کو بہت ماہر سمجھتا تھا۔ لیکن پہلی بار اسے احساس ہوا کہ سرو جا کو شاید وہ بھی صحیح طور پر نہ پڑھ سکا اور اس وقت صحیح طور پر نہیں پڑھ رہا ہے۔ سرو جا کے چہرے پر ندامت، خوف اور تاسف کی کوئی علامت نہیں تھی..... وہ کسی بھی بڑی اداکارہ سے کم نہیں تھی۔ اس لئے اس نے خود پر قابو پا کر اپنے تاثرات کو عیاں ہونے نہیں دیا تھا۔ اس کے دفتر میں وہ پہلی بار آئی تھی لیکن اس کے کسی انداز سے اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

سرو جانے بغیر کی تمہید کے دھیمی آواز میں کہا۔ ”معلوم نہیں تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔“ وہ پلکیں جھپکاتے بغیر اس کی آنکھوں میں منجمد آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

ٹائیگر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ”کل شام میں تمہیں دیکھ لیا تھا۔“ سرو جا نے مثبت لہجے میں کہا۔ ”اور مجھے معلوم ہے کہ تم نے مجھے دیکھ لیا تھا..... اسی لئے میں پہلی فرصت میں اپنی غرض سے آئی ہوں۔ میں نے تمہارے بسترے سے بھانپ لیا تھا کہ تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔“ ”بس میں نے دیکھا اور خاموش رہا۔ اس لئے کہ میں کسی کے ذاتی معاملات میں بلاوجہ ناگ اڑانے کا عادی نہیں ہوں۔“

”میں یہ بات جانتی ہوں کہ ساجن نے مجھے چوں کہ اس کے ساتھ نہیں دیکھا اس لئے اپنی اعلیٰ کی وجہ سے اس انتشار اور اذیت سے دوچار نہیں ہے۔“

سرو جا کی زبان میں ذرا بھی ارتعاش نہیں تھا۔ آواز کا ترنم بھی برقرار تھا۔ وہ اس کی طرف جھک گئی۔ ”اگر اس معاملے کا تعلق ساجن سے نہ ہوتا تو تم بھی شاید اتنے پریشان اور دل گرفتہ نہ ہوتے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”لیکن چند لمحے کے لئے مجھے فرض کرو کہ تم ساجن کو بھی نہیں جانتے اور مجھے بھی نہیں..... فرض کرو کہ تمہاری عدالت میں ایک اجنبی جوڑے کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔ اس ضمن میں تمہیں میرا موقف سننا ہے۔ ٹھنڈے دل سے میری بات سن کے تم جو کچھ بھی کرو گے۔ میں تمہیں حق بجانب سمجھوں گی۔ کیوں کہ تم میرے ماضی اور حال سے واقف نہیں ہو بلکہ اندھیرے میں ہو۔“

☆.....☆.....☆

حقیقت بھی یہی تھی۔ ٹائیگر کی اس سے اور اس کے شوہر سے تقریبات میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ پھر ان کے درمیان خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ساجن اس لئے بھی اس کا دوست اور مداح تھا کہ اس نے ساجن کے ایک دوست کو ایک کیس میں اذیت، ذلت اور پریشانی سے نجات دلائی تھی۔ ورنہ وہ پھانسی چڑھ چکا تھا۔ اس لئے بھی ساجن اس کی بڑی عزت کرتا تھا بلکہ محبت کرتا تھا۔ یہ اعزاز ساجن کے دوستوں میں سے شاید ہی کسی اور کو نصیب تھا۔

ایک خلش کا خنجر چھ برس تک ساجن کے دل میں پیوست رہا..... ایک راز کی خلش کا یہ راز اس کے سینے میں نا سورا بن گیا تھا۔ ابتدا میں اس راز کا تعلق صرف ساجن تک ہی تھا۔ بعد میں ٹائیگر سے ہو گیا تھا۔ ساجن کے کرب میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ اس نے کسی کو راز دار نہیں بنایا تھا۔ یہ محض اتفاقاً صرف ٹائیگر کے علم میں آ گیا تھا۔ اس سے التجا کی گئی تھی کہ یہ راز اپنی ذات تک خفی رکھے۔ ٹائیگر نے بغیر کسی غرض کے ساجن کو غلاظت کے دلدل سے نکالا جس میں سے اسے گرا دیا گیا تھا تاکہ اس کی عزت کو روند جائے اور اسے بلیک میل کر کے لاکھوں ماہانہ وصول کیا

جاسکے..... جب ٹائیگر نے اسے اذیت ناک عذاب سے نجات دی تو وہ اسے پوچھنے لگا۔ ٹائیگر نے بلیک چیک واپس کر دیا۔ ساجن کو یقین نہ آیا کہ اس دنیا میں ابھی بے غرض، پر خلوص دوست لوگ موجود ہیں۔ ریا کاری اور منافقت کے اس دور میں اگر ایک مرد دوسرے مرد سے محبت کا دعویٰ کرے تو لوگ نہ جانے کیا مطلب اخذ کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ٹائیگر کا ساجن سے ایک ذریعہ خاص تھا اسے صرف لفظ محبت کے ذریعے سے بیان کیا جاسکتا تھا اور یہ محبت مثبت پہلو تھی..... ٹائیگر کو نہیں معلوم تھا کہ ساجن جتنا بڑا دولت مند ہے اتنا ہی عظیم الشان ہے۔ اسی لئے تو ساجن کو ذلت و رسوائی کے دلدل سے نکالا تھا۔ وہ ساجن کا وفادار بن گیا تھا۔

ساجن کوئی معمولی آدمی یا دولت مند نہیں تھا۔ ساجن لال کپور ہندوستان کے چوٹی کے دس بڑے سرمایہ داروں میں سب سے بڑا شکاریا جاتا تھا۔ جنہیں درجن بھر آئی بی ایم کمپیوٹروں پر اپنی دولت کا شمار کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس کے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ فقہہ الونو عظیم الشان ایڈیشن کا رخانے، رہائی و دفتری عمارتیں، مرغ بانی اور گلہ بانی کے فارم، وسیع و عریض چراگاہیں، پرنضا مقامات پر بیس بیس کمروں اور ممبئی کی ساحلوں پر بنگلے بلس..... ذاتی طیارے..... نا در روزگار تصاویر کی گیلری..... لمبوسات کے کمرے کی دیواریں محفوظ جواہر کا ذخیرہ اور نہ جانے کیا کیا۔

ساجن لال کپور سے ملنے پہلے ٹائیگر کے ذہن میں کسی بڑے ہندوستانی سرمایہ دار کا تصور عجیب سا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بیشتر بڑے سرمایہ دار حلیہ یا عادات کے اعتبار سے سرمایہ دار نظر نہیں آتے..... وہ عموماً بوڑھے جمبول اور پانی پانی پر جان دینے والے ہوتے ہیں مگر ساجن اس تصور اور مشاہدے سے بہت مختلف تھا۔

ساجن جو اس سال تو نہیں تھا لیکن بوہا پے کی حدوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ قلعوں کے چند سفید بالوں سے اس کی وجاہت میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ وہ فلموں

اسی کا ہو جا.....!

پرنده زندہ ہو تو چیونٹیاں کھاتا ہے مگر جب پرنده مر جاتا ہے تو چیونٹیاں اسے کھا جاتی ہیں۔ وقت کبھی بھی بدل سکتا ہے۔ ایک درخت ایک لاکھ ماچس کی تیلیاں بنا سکتا ہے مگر..... ماچس کی ایک تیلی ایک لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔ تو زندگی میں کسی بھی فرد کو مت ستانا..... کیونکہ اس وقت شاید آپ طاقتور ہوں مگر وقت آپ سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ زمین انسان کو رزق دیتی ہے لیکن..... جب انسان مرتا ہے تو اسے اپنا رزق بنالیتی ہے۔ تو اسے بنی نوع انسان! بادلوں کی گرج اور رات کی سیاہی سے اپنے رب کو پہچان..... چھوڑ دے سب خرافات، گناہ اور اسی کا ہو جا۔

(محمد وارث آصف-واں بھجراں)

”کیا میری پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔ جو آپ اس قدر اعتماد سے کہہ رہے ہیں.....؟“

”میں نے ویسے ہی ایک معتبر آدمی سے آپ کی بڑی تعریف سنی تو کشاں کشاں چلا آیا ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اب آپ سے مل کر بات کر کے اندازہ ہو گیا کہ واقعی بہت نیک شخص ہیں..... میں دو ایسے پرائیویٹ سراغ رساؤں کو جانتا ہوں جن کی خدمات دو نامور ہیرونوں نے حاصل کی تھیں۔ دس دس لاکھ کے معاوضہ کے عوض..... یہ دونوں ہیرونوں کو پہلی قلم ملی..... ان دونوں نے بولڈ مناظر سے راتوں رات شہرت، دولت اور مقام حاصل کر لیا۔ دولت کی ہوس نے انہیں راتیں کالی کر کے پر اسکیا۔ جب کوئی اداکارہ شہرت کے بام عروج پر پہنچتی ہے ان سے منہ کالا کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ ان کی کالی راتوں کو عکس بند کر کے بلیک میل کیا جانے لگا۔ پھر ان دونوں اداکاروں نے پرائیویٹ رساؤں کی خدمات حاصل

کی چیز نہیں ہے..... مجھے عزت جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میں اس دنیا میں عزت سے اس وقت تک جینا چاہتا ہوں جب تک آخری سانس باقی ہے۔“ اس نے پاٹ سے لہجے میں کہا۔

”میرے خیال میں اس بلیک میل سے نجات کے لئے آپ کسی بھی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“ ٹائیگر نے مشورہ دیا۔ ”چالیس پچاس ہزار میں آپ کی جان اور عزت چھوٹ جائے گی۔“

”ہاں.....“ وہ متعجب لہجے میں بولا۔ ”آپ اتنی بڑی رقم شکرا کر مجھے بڑے مخلصانہ مشورے دے رہے ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں اور کس لئے..... جب تک آپ سے میری ملاقات ہے۔ شہرانی بھی نہیں ہے۔ یہ بے غرضی کیسی ہے؟“

”اس لئے مجھے دولت کی ہوس اور لالچ نہیں.....“ ٹائیگر نے کہا۔ ”مجھے اس بات سے بڑی خوش ہوتی ہے کہ میں کسی مظلوم اور پریشان حال کے کام آؤں..... دولت آتی جانی چیز ہے۔ یہ بڑی ہرجائی ہوتی ہے۔“

”میں کسی بھی سراغ رساں کی خدمت اس لئے حاصل کرنا نہیں چاہتا کہ وہ ان مشورے اور غلاطی سے بھری تصاویر حاصل کرنے کے بعد مجھے بلیک میل کرنے لگے گا۔ اس کی نیت میں فوراً آجائے گا..... پیسہ کے برا لگتا ہے..... دولت جتنی اچھی ہے..... اس سے کہیں بڑی ہے۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”میری شخصیت ہی ایسی ہے..... ان سراغ رساؤں کی نظر میں میں سوئے کا انڈا دینے والی مرغی ہوں۔“

”میں ایک عام سا آدمی ہوں..... میری بھی نیت میں فرق آ سکتا ہے.....؟ میں آسمان سے اترا ہوا اداکار نہیں ہوں؟“

”آپ ہرگز ایسے آدمی نہیں..... آپ ایک فرشتہ صفت اور مخلص انسان ہیں، میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں؟“

حاضر ہوا ہوں۔ معاوضہ منہ مانگا پیش کروں گا۔“

”دس لاکھ روپے.....؟“ ٹائیگر نے مذاق میں کہا۔

”دس لاکھ کیا..... میں لاکھ بھی دے سکتا ہوں۔“ اس نے بڑی بنجیدگی سے کہا۔

”میں لاکھ.....؟“ ٹائیگر جیسے اچھل پڑا۔ اسے اپنی سماعت پر جیسے یقین نہ آیا۔ ”آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔“

ساجن نے جواب میں وہ بریف کیس کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا جو ساتھ لایا تھا۔ اس میں بڑے بڑے نئے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔

”یہ کل رقم چالیس لاکھ روپے ہے..... اس میں سے پچیس لاکھ روپے لے لیں۔ من چاہے تو پوری رقم رکھ لیں۔“

ٹائیگر کی حیرت دو چند ہو گئی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کہیں یہ شخص برسر اقتدار سیاسی پارٹی کی حریف پارٹی کا آدمی تو نہیں ہے جو صدر اور وزیر اعظم کو قتل کرانا چاہتا ہو..... اتنی بڑی رقم اس طرح پیش کر رہا ہے جیسے چار سو روپے ہوں۔

”اس قدر کراں قدر معاوضہ.....؟“ ٹائیگر نے چکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کسی سیاسی رہنما یا حکومت کے کسی وزیر یا.....“

”یہ خطرہ رقم ایک بلیک میل سے نجات دلانے کے عوض ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس شہر میں ایسے اجرتی قاتلوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو دس روپے کے لئے بھی قتل کریں۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”لیکن میں اس کی جان لینا نہیں چاہتا بلکہ اس کے قبضے میں میری جو غلاطی ہے میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”اس کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا چاہتے ہو.....؟“ ٹائیگر نے کہا۔

”اس لئے دنیا میں عزت اور جان سے بڑھ کر

کے کسی ہیرو سے زیادہ چاق و چوبند تھا۔ دولت اگلنے کی بیشتر کانیں اسے ورثے میں ملی تھیں۔ ان کی افزائش اس کی غیر معمولی ذہانت کے بل پر ہوئی تھی۔ قدرت نے جس حساب سے اسے نواز ا تھا اس تناسب سے وہ خرچ بھی کرتا تھا۔ صرف اپنی ذات اور اپنے متعلقین پر ہی نہیں اس کی دولت کا ایک مقبول حصہ سماجی خدمات پر بھی صرف ہوتا تھا۔ کئی چھوٹے بڑے اور پس ماندہ شہروں میں اس کے باپ کے نام پر واقف قائم تھے۔ ان کی آمدنی سے غریبوں اور ناداروں کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ طبی تحقیق، فنون، لطیفہ کے فروغ اور تعلیمی خدمات کے لئے ساجن لال کپور فاؤنڈیشن کے تحت بڑے بڑے فنڈ قائم کئے گئے تھے۔ تحقیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی اس کے ارادے کوئی نہ کوئی نمائی پروگرام اسپانسر کرتی رہتی تھیں۔ تعمیری فلمیں بنانے فلم سازوں کو اگر نقصان ہوتا تو اس کی تلافی کے لئے بھی ساجن نے ایک الگ فنڈ قائم کر رکھا تھا۔ یوں اس کا بانی ووڈ کی مشہور زمانہ فلمی دنیا سے بھی رابطہ تھا۔ بھی کھارہ کوئی اچھا ناول اور کہانی پسند آنے پر اس پر قلم ہوتا تھا۔ اس کی دوایک فلمیں ہٹ بھی ہوئی تھیں۔ لیکن فلمی دنیا کی تمام رنگینیوں اور بے پناہ آمدنی اس کی ذاتی توجہ کم ہی تھی۔

اس مثالی سماجی رتبے کے باوجود ٹائیگر جیسے سراغ رساں سے اس کا رویہ نہایت مریبانہ اور دوستانہ تھا..... نہایت ذاتی..... اس تعلق میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ شفقت بھی شامل تھی۔

یہ کوئی تین برس پہلے کی بات تھی جب ٹائیگر ممبئی آیا تھا اور اس دفتر میں ساجن قدرے بہروپ بھر کر آیا تھا۔ ٹائیگر ان دنوں اس سے ذاتی طور پر ناواقف تھا۔ البتہ اس نے ساجن کا نام اور اس کی شخصیت کے بارے میں سنا تھا۔ کسی بھولے سے واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

”میں نے آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ بنگال ٹائیگر ہیں۔ میں آپ کی خدمات حاصل کرنے

کیں۔ لہذا وہ ایک گھٹ میں دو حمرے کر رہے ہیں۔
انہیں ہر ماہ ایک لاکھ روپے اور انہیں خوش کرنا پڑتا
ہے۔۔۔۔۔ ان کی مجال نہیں کہ بلیک میلروں کی کوئی بات
سے انکاری ہو جائیں۔۔۔۔۔“

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔۔۔۔۔؟“
ٹائیگر بولا۔ ”جوبد نامی اور رسوائی سے اس قدر ہشت
زدہ ہیں۔“

”میرا نام ساجن لال کپور ہے۔“ اس نے
بتایا۔ ”میں ایک بزنس مین ہوں اور۔۔۔۔۔“
”اوہ۔۔۔۔۔“ ٹائیگر چونک کر بولا۔ ”اب میں
جان گیا کہ آپ کو اپنی عزت اتنی کیوں پیاری
ہے۔۔۔۔۔ ہر عزت دار کو اپنی عزت اپنی جان سے
پیاری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ایسا کرتے ہیں کہ کسی بڑے
ہول میں چل کر بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ آپ مجھے بتائیں کہ
آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا جو بلیک میلر آپ کی
عزت کا دشمن بنا ہوا ہے۔“

کسی بھی ہول کے مقابلے میں آپ کا دفتر ہر
 لحاظ سے مناسب اور بہتر ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”اس لئے
کہ وہاں میرا کوئی بھی شہساز، دولت اور بزنس مین آ سکتا
ہے جو مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر چونک جائے گا کہ دال
میں کچھ کالا ہے۔ یہاں کسی کے آنے کا اندیشہ نہیں
ہے۔ کوئی آنے گا تو آپ اس سے معذرت کر کے کوئی
اوردن مقرر کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔“

”جی جناب۔۔۔۔۔!“ ٹائیگر نے اثبات میں سر
ہلا دیا۔ ”تو آپ اپنی رام کہانی سنائیے۔“
”لیکن اس کا معاوضہ ملے ہو جانا چاہئے تاکہ
میں اپنے سر سے ایک بوجھ اتار دوں۔۔۔۔۔ معاوضہ پیشگی
دوں گا۔“

”بالفرض میں ناکام ہو جاتا ہوں تو اس صورت
میں آپ کا معاوضہ پانی ہو جائے گا۔“
”مجھے امید تو نہیں کہ آپ ناکام ہو جائیں
گے۔۔۔۔۔ پھر ہم سوچیں گے کہ کرنا کیا ہے۔“ ساجن نے
کہا۔ ”میں آپ کو پچیس لاکھ روپے پیشگی دوں گا۔۔۔۔۔“

کامیابی کی صورت میں مزید پندرہ لاکھ روپے۔۔۔۔۔“
”اس کے علاوہ آپ کو ایک شہ کام کرنا ہوگا۔“
ٹائیگر نے میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اس کی
طرف بڑھایا۔ ”یہ کل چار مریض ہیں جن کے علاج
معالجے اور اسپتال میں داخل کرانے کے لئے ایک بڑی
رقم درکار ہے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایک غریب ماں باپ کی
اکھوتی بیٹی ہے۔ اس کی شادی کے لئے جہیز کی ضرورت
ہے۔۔۔۔۔ آپ ان کے بارے میں پڑھیں۔ میں اتنی دیر
میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔ پھر چائے کے دوران آپ
کی زبانی اور آپ کی کہانی سنوں گا۔“ پھر ٹائیگر باورچی
خانے کی طرف بڑھ گیا۔

جس وقت ٹائیگر دوپ چائے اور بسکٹ لے کر
آیا ساجن اس کاغذ کو تہہ کر کے جیب میں رکھ رہا تھا۔
اس نے کہا۔

”یہ تو آپ نے میرے ذمے بہت چھوٹا سا کام
سونپا ہے۔۔۔۔۔ میرا ایک ادارہ ہے جو روز ہی ایسے کام
انجام دیتا رہتا ہے۔ اس لڑکی کا جہیز اور شادی بیاہ کے
دیگر اخراجات دو لاکھ کی رقم کل صبح پہنچا دی جائے
گی۔۔۔۔۔ ان چاروں مریضوں کو یہاں سے جانے کے
بعد کسی ایسے سے اسپتال میں علاج شروع ہو جائے گا۔
جب تک وہ مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو جاتے وہ زیر
علاج ہی رہیں گے۔“

پھر ساجن نے چائے کا ایک گھونٹ حلق سے
اتارتے ہوئے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔

مجھے کبھی عورت کی تمنا اور خواہش نہیں رہی اور
میری کمزوری۔۔۔۔۔ البتہ عورت کی رفاقت میری ضرورت
رہی۔ میری زندگی میں دو عورتیں آئیں۔ ہماری
ازدواجی زندگی دو برس سے زیادہ کامیاب نہیں رہی۔
اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میری پہلی بچی جو تیس برس کی
عورت تھی شادی سے پہلے اس کی دوستی اور تعلقات ہیں
برس کے ایک لڑکے سے تھے۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ مجھے قتل
کر دے۔ میں نے انہیں ایک دن ایک کمرے میں
میرے خلاف مضموبہ بناتے سن اور دیکھ لیا۔ میں نے

پولیس کو فون کر کے بلایا۔ وہ دونوں ناقابل حالت میں
تھے۔ میں نے پولیس کو ایک موٹی رقم دے کر کہا کہ وہ
اس واقعے کی تہہ نہ کریں۔ پھر میں نے بیوی کو طلاق
دے دی۔۔۔۔۔ دو برس بعد میں نے دوسری عورت سے
شادی کی۔ وہ ماڈل گرل تھی مجھے ایک شریک حیات کی
ضرورت تھی۔۔۔۔۔ دو برس کے بعد ہم دونوں میں علیحدگی
ہو گئی۔ پھر تین برس کے بعد میری زندگی میں سروجا
آ گئی۔ ہم دونوں کی ازدواجی زندگی اب تک تو کامیاب
جاری ہے۔

میری گاڑی کا ڈرائیور سری کانت ایک مرتبہ
مجھے ایک بہانے سے اپنے ہاں لے گیا۔ اس کی جوان
سال بیوی اور چودہ برس کی لڑکی نے میرا سواگت کیا۔
ماں بیٹی نہایت حسین اور پرکشش تھیں۔ سری کانت نے
دھوکے سے مجھے رومال سونگھایا جو گلو رو فارم میں بھیجا ہوا
تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بیڈروم میں تھا۔ میں
کیسے اور کس وقت آیا مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔۔۔۔۔ کچھ دیر بعد
ہوش آیا تو میری نظروں کے سامنے انتہائی شرمناک
منظر گھومنے لگے۔ ماں اور بیٹی کے ساتھ۔۔۔۔۔ پھر
دوسرے دن مجھے ایک لفافہ ملا جس میں بیس تصویریں
بھی تھیں۔۔۔۔۔ دس عدد سری کانت کی بیوی کے ساتھ۔۔۔۔۔
دس عدد اس کی بیٹی کے ساتھ۔۔۔۔۔ ان تصویروں سے یہ
ظاہر ہوتا تھا کہ میں نے گن پوائنٹ پر انہیں درندگی سے
نشانہ بنایا ہے۔

پہلے تو ہر ماہ پچاس ہزار کی رقم چھ ماہ تک دیتا
رہا۔۔۔۔۔ پھر ایک لاکھ۔۔۔۔۔ اب تین لاکھ۔۔۔۔۔ گزشتہ ماہ مجھ
سے کہا گیا کہ میں سروجا کو طلاق دے کر اس کی بیٹی پورینا
سے شادی کر لوں ورنہ یہ تصویریں تیر تاتھہ کے ہاتھوں دو
کرڈز میں فروخت کر دی جائیں گی۔ تیج تاتھہ نہ صرف
میرا کاروباری حریف ہے بلکہ جانی دشمن بھی ہے۔ اس
کے ہاتھ تصویریں لگنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نہ صرف
سروجا سے محروم ہو جاؤں گا بلکہ بھکاری سے بھی بدتر بن
جاؤں گا۔ میں کی کون نہ دکھا سکوں گا۔“

اس کی کہانی سن کر ٹائیگر نے اسے دلا دیا۔

”آپ کی بات کی فکر نہ کریں۔ یہ تو میرے ہاتھ کا کھیل
ہے۔۔۔۔۔ میں دو ایک دن میں تمام تصویریں ان کے
ٹیکنیو زسیت آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

☆ ☆ ☆
اس نے جو کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔ وہ دوسرے دن
سری کانت کے ہاں پہنچا۔ سری کانت پہلے جب وہ
ملازمت کر رہا تھا تب داروت کے علاقے میں ایک
بوسیدہ فلیٹ میں رہتا تھا۔ اب تین کمروں کے لکڑی
فلیٹ میں کرائے پر بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا تھا۔
اس نے سری کانت سے کہا۔ ”کیا آپ جانتے ہیں کہ
ساجن لال کپور کیسے مہلک بیماری میں مبتلا ہے؟“
”نہیں تو۔۔۔۔۔“ سری کانت نے سر ہلایا۔
”وہ ایڈز کی بیماری میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی
صرف تین ماہ کی رہ گئی ہے۔“
”کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ تینوں اس طرح اچھل پڑے
جیسے کرنٹ لگا ہو۔

سب سے زیادہ صدمہ سری کانت کی بیٹی پورینا
کو ہوا۔ اس پر چھپے کوئی بجلی سی آگری ہو۔ اس کے تمام
سننے کر چپاں بن کر اس کے سینے میں چھپ گئے۔ ان
تینوں کو سکتے کی سی حالت میں دیکھ کر وہ کہنے لگا۔
”آئندہ ہفتے وہ سروجا کو طلاق دے کر اس کے
دوسرے دن آپ سے شادی کر سکتی مومن منانے لے
جائے گا تاکہ وہ بیماری آپ کو منتقل کر دے۔ اس لئے
کہ آپ نے اسے بلیک میل کر کے اس سے لاکھوں
روپے ایشے ہیں۔“

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ ایڈز کی بیماری
میں مبتلا ہے۔“ پورینا نے چھنی چھنی آواز میں پوچھا۔
ٹائیگر نے بریف کیس کھول کر اس میں سے
ایک فائل نکال کر پورینا کے ہاتھ میں تھادی۔

”آپ خود ہی دیکھ لیں۔۔۔۔۔ جے جے اسپتال
کے ڈاکٹر سر جنرل فریڈن ڈاکٹر فریڈن کی میڈیکل
رپورٹ ہے۔ یہ خفیہ فائل ہے جو ایک نرس مالا سہا کو
دس ہزار روپے رشوت دے کر تین دن کے لئے

حاصل کی ہے۔“

پورینا، ماضی میں اسی اسپتال میں نرس رہ چکی تھی اور اس کی ماں بھی..... اس اسپتال سے انہیں اس لئے نکال دیا تھا کہ دونوں بدچلن اور بدکردار تھیں۔ ان کے کئی ڈاکٹرز سے تعلقات تھے۔ اسپتال کا ماحول خراب کر دیا گیا تھا۔ پورینا کی ماں نے بیٹی کے ہاتھ سے فاصلے کر دیکھی۔ پھر اس نے کہا۔

”ساجن کے تعلقات نہ صرف ماڈل گرلز بلکہ ہیروئنوں اور بازاری عورتوں سے بھی تھے۔ ظاہر ہے یہ مرض اسے لاقح ہونا تھا۔“

یہ بات کہتے کہتے اچانک اسے کچھ احساس ہوا۔ کیوں کہ وہ اور اس کی بیٹی بھی تو فاحشوں میں سے تھیں۔ اس لئے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر موضوع بدلا۔

”آپ کون ہیں.....؟ آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ پورینا کی ماں بولی۔ ”آپ کس لئے یہاں آئے ہیں؟“

”میں ایک انشورنس کمپنی کا سراغ رساں ہوں۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”مسٹر ساجن نے جو بیہ پالیسی لی ہوئی ہے وہ کروڑوں کی ہے۔ اس نے کمپنی کو دھوکہ دیا ہوا ہے۔ اس لئے کمپنی چاہتی ہے کہ اس کے کروت اس پر ظاہر کرے اس کی بیہ پالیسی کو کینسل کر دے اور پھر طبی رپورٹ۔“

”اس کے کروت..... میں سمجھی نہیں.....؟“ پورینا کی ماں کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

”آپ کے پاس اس کی کچھ نامناسب تصویریں ہیں۔ انشورنس کمپنی اسے آئینہ دکھا کر اس کی پالیسی ختم کر دینا چاہتی ہے۔“

”لیکن انشورنس کمپنی کو اس کے اخلاق و کردار سے کیا تعلق.....؟ اس کی صرف طبی رپورٹ سے تعلق ہونا چاہئے۔“

”جب ہم اسے طبی رپورٹ دکھائیں گے تو وہ بڑا شور و شوعا کرے گا اس لئے کہ اس نے جب

انشورنس کرایا تھا تب اسے یہ مرض لاقح نہیں تھا۔ لیکن جب اسے اس کی نامناسب تصویریں دکھائیں گے تو وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔“ ٹائیگر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”لہذا آپ وہ تصویریں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں۔ میں ایک لاکھ کی رقم لایا ہوں۔“

”وہ تصویریں چار لاکھ میں.....؟“ پورینا کی ماں تمسخر سے بولی۔ ”آپ کو شاید علم نہیں کہ اس کے کاروباری حریف اور ملک کے دو صنعت کار اور ارب پتی سچ تھے ان تصاویر کے دو کروڑ دینے کو تیار ہیں۔ اور پھر ساجن سروجا کو طلاق دے کر پورینا سے شادی کرنے پر آمادہ ہے۔“

”جب ڈاکٹروں نے مسٹر ساجن کو بتایا کہ ان کی زندگی صرف چار سے چھ ماہ کی ہے تو انہوں نے ایک حقیقت پسند آدمی کی طرح ایک وصیت نامہ تیار کیا ہے..... انہوں نے اپنی تمام دولت اور جائیداد اطلاق اور خیراتی اداروں کے نام لکھ دی ہے۔ ایک ٹرسٹ بنایا ہے جو کاروبار چلائے گا اس کی آمدنی فلاحی اور خیراتی اداروں کو ہر ماہ دی جائے گی..... سروجا کو اس کی زندگی تک ہر ماہ دس ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ اس کی زندگی صرف ایک برس کی ہے۔ کیوں کہ ساجن کو جو

مرض لاقح تھا وہ اسے بھی لگ چکا ہے۔ یہ مرض ہر اس عورت اور لڑکی کو ختمے میں مل چکا ہے جس سے ان کے تعلقات رہے..... آپ ماں بیٹی کو بھی یقیناً لاقح ہو چکا ہوگا۔ کیوں کہ ان سے ہر ماہ رقم وصول کرنے کے آپ اور

بیٹی باری باری جاتی رہی ہیں۔ رات سے صبح تک رہ کر آتی رہی ہیں۔ پہلی فرصت میں آپ دونوں اپنا اپنا چیک اپ کرائیں..... یہ مرض بڑا چور ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ بڑ پکڑتا ہے اور پھر ایک دم خود آتا ہے۔ آپ کے بچے کو بھی یہ مرض ہو سکتا ہے..... انہیں بھی چیک کرالینا ہوگا۔ کیوں کہ آپ سے انہیں منتقل ہو چکا ہوگا۔ اور

ہاں ایک اور ضروری، اہم اور خطرناک بات جو اس وصیت میں درج ہے..... میرا ڈرائیور ساری کانت جودس برس سے میرا ذاتی ڈرائیور رہا۔ میں نے ہمیشہ اس کا

خیال رکھا اور فوقتاً فوقتاً اس کی مالی مدد کرتا رہا..... خلوص اور انسانی جذبے کے تحت..... میں نے بھی اس کی بیوی اور بیٹی کو نہیں دیکھا تھا۔

ایک روز یہ نمک حرام اور ذلیل شخص مجھے ایک بہانے سے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں مجھے کلوروفارم سونکھا کر بے ہوش کیا گیا۔ پھر انجکشن سے میرا دماغ معطل کر کے اس کمینہ نے میری تصویریں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بنوائیں۔ شاید ماں اور بہن بھی ہوتی ان کے ساتھ بھی بنواتا۔ میرے علم میں نہیں تھا کہ دنیا میں کوئی ایسا ذلیل، سچ اور بیچ آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ دولت کے پیچھے اندھا ہوتا ہے اور ساری اخلاقی قدیں پامال کر دیتا ہے..... پھر وہ مجھے بلیک میل کرنے لگا۔ اس کی بیوی اور بیٹی باری باری ہر ماہ رقم وصول کرنے آتی رہیں۔ ماں اور بیٹی نرسنگ کے پیشے سے وابستہ رہیں چوں کہ ماں بیٹی نے اسپتال کا ماحول آلودہ کر دیا تھا انہیں نکال دیا گیا۔ پھر انہوں نے میرے خلاف منصوبہ بنا کر شرمناک تصاویر بنا کر بلیک میل کرتی رہیں۔ اس بات کی خبر پولیس کو دے دینا..... میرے پاس چوں کہ ان کے ٹیکیز نہیں ہیں۔ صرف تصویریں موجود ہیں وہ پولیس کو دے دیں۔“

ٹائیگر نے توقف کر کے اپنی تقریر کا رد عمل دیکھنے کے لئے ان کا چہرہ دیکھا..... ان پر جیسے کوئی بجلی سی آن گئی تھی۔ ان پر سکتے سا طاری ہو گیا تھا اور ان کے چہرے پر اہو ہو گئے تھے۔

”تھوڑی دیر بعد ٹائیگر نے کہا۔“ آپ لوگوں نے کیا سوچا.....؟ کیا فیصلہ کیا.....؟ کیا میرے ہاتھ تصویریں اور ٹیکیز فروخت کر رہے ہیں؟“

پورینا کی ماں سرسوتی بڑی تیز اور گھاگ عورت تھی۔ گھٹاٹ گھٹاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتی تھی۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”سچ تھے دو کروڑ کی رقم دے رہا ہے اور تم ایک لاکھ.....؟ ہمیں بلیک میل کرنے آئے ہو..... کیا تم ہمیں بے وقوف اور احمق سمجھتے ہو.....؟“

”اب تو سچ تھے دو کروڑ کیا دو روپے بھی نہیں دے گا۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ اب بساط الٹ چکی ہے۔“

”اس لئے کہ ساجن کی میڈیکل رپورٹ اور وصیت نامہ..... دیکھ کر.....“ ٹائیگر نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر ان کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ ”یہ وصیت نامہ ہے۔“

”ان تصویروں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ سرسوتی غرائی۔ ”تم ہمارا مال تک بیک نہیں کر سکتے۔“

”کیا تم نے ان تصویروں کا ایک سیٹ ساجن کو نہیں دیا تھا.....؟“ ٹائیگر نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ ”یہ بتانے کے لئے کہ تمہاری عزت، دولت اور شہرت ہماری مٹھی میں ہے۔ انہیں دیکھ کر کوئی فیصلہ کرو۔ ہر ماہ کتنی رقم دو گے..... میں اور پورینا ہر ماہ تم سے رقم لینے باری باری آتی رہیں گی۔“

”ہاں دیا تھا.....“ پورینا نے درمیان میں اعتراف کیا۔ ”میں نے خود لے جا کر تصویریں دی تھیں۔“

ٹائیگر کے علم میں ساجن نے یہ بات لائی تھی کہ اس نے ان تصویروں کو نذر آتش کر دیا تاکہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائیں لیکن اس نے یہ بات ماں بیٹی کو نہیں بتائی تھی۔ ٹائیگر نے جو تیر چلایا تھا وہ نشانے پر لگا تھا۔

”دیکھو..... ہٹ دھرمی اور ضد نہ کرو۔ میں جو ایک لاکھ کی رقم پیش کر رہا ہوں اسے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر قبول کرلو۔ ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....؟“ سری کانت جواتی دیر سے خاموش بیٹھائیں رہا تھا اس نے بھنا کر زبان کھولی۔

”میں وہ تصویریں لے کر سیدھا پولیس کے پاس جاؤں گا..... پولیس والوں کو کہوں گا کہ ایک لاکھ روپے دے کر ان خنیوں کو لے جا کر حوالات میں بند کر دو..... مسٹر ساجن کی موت تک یہ بات منظر عام پر نہ آنے دو..... یہ تصویریں اور ٹیکیز ان کے باپ بھی دے دیں گے..... صرف ان ماں بیٹی کے چہروں اور

تکوار..... اور پھر بلیک میلر کی خواہش ہوگی کہ تم کھ پتلی بن جاؤ..... اس لئے کہ تم نہایت حسین و جمیل ہو بلکہ کشش کا خزانہ ہو..... ایسا مشکل ہے کہ تم آج سے محفوظ رہو۔“

”آج کل..... ایک ہوا چلی ہوئی ہے..... اغوا، تاوان، تصویروں کی مدد سے بلیک میلنگ..... کیوں کہ دولت ہی دولت ہے..... پھر اس میں نہ محنت ہے اور نہ گھائے کا سودا..... پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں۔“ سرو جانے کہا۔ ”وہ بھی ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی ہے..... میں اذیت اور ذہنی انتشار کا شکار ہوں..... میں آخری سانس تک کھلونا بننا نہیں چاہتی..... میں راتوں کو اکثر سوچتی ہوں کہ کاش.....! میں اتنی حسین نہ ہوتی اور ساجن کی پتی نہ ہوتی..... اس عذاب سے دوچار نہ ہوتی۔“

”ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بلیک میلر ساری زندگی بہت لگا میں ہاتھ دھوتا رہے۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”اس کے وارے نیارے ہوتے ہیں۔ جرم بہر حال جرم ہوتا ہے..... بکرے کی ماں کب تک خیر منائی ہے۔“

”کیا میں تم سے امید رکھوں کہ تم میرا کیس حل کرو گے..... اور ساجن کو اس کی ہوا لگنے نہیں دو گے.....؟“ اس نے امید بھری نظروں سے ٹائیگر کو دیکھا۔ ”تم مجھے مایوس نہیں کرو گے.....؟“

”میرے کاروبار میں رازداری پہلی شرط ہوتی ہے.....“ ٹائیگر نے اسے دلادیا۔ ”تم جانتی ہو میری فیس کیا ہے.....؟“ اس نے توقف کر کے کہا۔ ”میرے کاروبار کی لچھ کو معاف کرنا..... کیوں کہ اس وقت میں تمہارے پتی کا دوست بن کر نہیں..... بلکہ سراغ رساں دیوکار بن کر بات کر رہا ہوں..... اس لئے بھی کہ تم میری خدمات حاصل کرنے آئی ہو۔“

”میں تمہاری منہ مانگی فیس ادا کرنے کو تیار ہوں۔“ سرو جانے کہا۔ ”تم فیس کی پروا مت کرو۔ کتنی رقم.....؟ میرے پاس تو لاکھوں کا بلیک میلنگ ہے۔ میں پوری فیس پیشگی بھی دے سکتی ہوں۔“

”تمہاری پوری کہانی سننے کے بعد اپنی فیس بتاؤں گا۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”فیس کیس کی نوعیت پر ہوتی ہے..... اس لئے کہ معاملہ کیا ہے.....؟ گھمبیر ہے..... خطرناک ہے یا پیچیدہ اور ناممکن سا ہے۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میری مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھاؤ۔“ سرو جانے سنجیدہ ہو کر کہا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں.....؟“ ٹائیگر انجان سا بن گیا۔

”مجھے تم پر ہر طرح کا بسواں ہے کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو اس لئے میں تمہاری خدمات حاصل کرنے آئی ہوں.....“ وہ بولی۔

”میں بہرہ ور بدل کر دو بڑے پرائیویٹ سراغ رساؤں کے پاس گئی تھی جو ماضی میں انسپٹر اور ڈی ایس بی تھے۔ ریشاڑ ہونے کے بعد انہوں نے یہ پیشہ اپنالیا۔ جن کی پورے شہر میں بڑی دھوم ہے۔ گویا طوفانی بول رہا ہے۔ معمولی سے معمولی کیس کے وہ ایک لاکھ روپے سے کم فیس نہیں لیتے ہیں۔ میں نے انہیں ایک فرضی کہانی سنائی۔ بہرہ ور بھرنے کے باوجود انہیں میرے حسن کا اندازہ ہو گیا۔ لیکن میری شناخت نہ ہو سکی۔ انہوں نے کہا کہ فیس تین لاکھ ہوگی جو مجھے ادا کرنی ہوگی۔ یعنی پیشگی..... پوری فیس ادا کرنا ہوگی.....“

جب آپ کو مطلوبہ تصویر مل جائیں گی اس وقت تک دو ایک دن میں وقت مقررہ پر تین گھنٹے کے لئے آ کر خوش کرتے رہنا ہوگا..... گویا آسان سے گرا سمجھور میں انکا..... میں نے کہا یہ بات کیا ہوئی۔ آپ مجھے غلاطی کے دلدل سے نکالنے کے بجائے پھر پستی میں گرانا چاہتے ہیں..... وہ بولے..... شریعتی جب آپ اسے خوش کر چکی ہیں جس کی وجہ سے بلیک میل ہو رہی ہیں اور پھر بلیک میلر بھی فائدہ اٹھا رہا ہے تو پھر ہم نے کیا تصور کیا.....؟ آخر ہمارا بھی ادھیکار بنتا ہے۔“

”میں ان دونوں کو جانتا ہوں جو اس مقدس پیشے پر بغاوت داغ بنے ہوئے ہیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”میں ادھر سے فرصت پاؤں یا اس دوران موقع ملا تو ان دونوں کو بلیک میل کروں گا۔ وہ ایک ایسی شادی شدہ لڑکی کو ہراساں کر رہے ہیں اور اس سے دل بہلا رہے ہیں اور دو بچوں کی ماں کو بھی..... وہ دونوں ایک نمبری شیطان ہیں۔“

”بھگوان تمہاری رکشا کرے..... اچھا اب تم میری کہانی سنو.....“ سرو جانے لگی۔ ”میرے والدین جب مجھے بنگلور سے لے کر گئے اس وقت میری عمر دو برس کی تھی۔ جب واپس آئے تو میں بارہ برس کی عمر کی ہو چکی تھی۔ بنگلور میں چھ برس رہنے کے بعد کاروبار کے لئے ممبئی شہر مستقل رہائش پذیر ہو گئے۔ جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تو میرے حسن نے دھوم مچادی۔ میری ہم جماعت لڑکیاں اور لڑکے بھی مشورے دینے لگے کہ میں کیوں نہیں فلمی دنیا میں چلی جاتی۔ دولت، عزت اور شہرت بھی ہے..... اس وقت تمہاری جیسی حسین اور پرکشش لڑکی اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ تم تمام ستاروں کو ماند کر کے رکھ دو گی۔“

مجھے گریجویشن کرنے میں ڈیڑھ برس کا عرصہ رہ گیا تھا۔ مجھے بھی بواشوق بلکہ جنون تھا کہ فلمی دنیا میں جا کر کروڑوں شائقین کے دلوں پر راج کروں۔ لیکن میرے والدین نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں جب تک گریجویشن نہیں کر لیتا اس وقت شو بزنس میں جانے کا نہ تو سوچوں گی اور نہ ہی خواب دیکھوں گی۔

میری ہم جماعت شیلما مشہور فلم ساز و ہدایت کار راج پال کی بیٹی تھی۔ جب اس نے ایک روز اپنے ہاں لے جا کر اپنے پتا جی سے ملایا تو وہ مجھے دیکھ کر جیسے پھڑک اٹھے۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے اپنی ایک نئی فلم میں ہیروئن بننے کی پیشکش کر دی۔ میں نے معذرت کر لی اور ان کی پیشکش مسترد کرنے کی وجہ بتادی۔ پھر انہوں نے میرے پتا جی اور ممی سے رابطہ کیا تا کہ ان کی پیشکش قبول کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ پتا جی نے صاف انکار کر دیا۔

عالمی مقابلہ حسین منعقد ہونے والا تھا۔

ہندوستان سے چار لڑکیاں اس مقابلے میں شرکت کرنے جا رہی تھیں۔ مجھ سے بھی کہا گیا۔ لیکن میرے گھر والوں نے صاف منع کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی قیمت پر اس مقابلے میں شرکت کی اجازت نہیں دیں گے۔ میری ایک ہم جماعت لڑکی نے بھی جو نہایت حسین اور بے پناہ سلیکی تھی اس مقابلے میں شرکت کرنے گئی۔ وہ دو ماہ کے بعد آئی۔ وہ عالمی حسینہ منتخب کر لی گئی تھی۔ دولت، عزت اور شہرت اسے نصیب ہوئی تھی۔ ہندوستان میں بھی اسے بڑی شہرت ملی تھی۔ اس کی سواگت کی گئی۔ وہ میری ہم زاد سہیلی تھی۔ اسے کئی فلموں کی پیشکش بھی ہوئی۔ میں نے اسے اپنے ہاں مدعو کیا۔ میں اسے اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔ اسے عزت، شہرت اور دولت کی مبارک بادی دی تو وہ بولی دولت اور شہرت..... عزت نہیں..... میں نے حیرت سے کہا کیا یہ عزت نہیں ہے جو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے..... اس نے جواب دیا کہ یہ عزت نہیں..... اسے عزت مت کہو..... مقابلہ حسن میں مجھے اپنی عزت چھوری کے ہاتھوں دان کرنی پڑی..... پھر مجھے ملکہ حسن کا تاج پہنا دیا گیا۔

اس نے مجھ سے کہا کہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے..... مجھے بھی یہاں فلموں میں ہیروئن کی پیشکش کی گئی..... لیکن اس کے لئے شرط یہی تھی کہ عزت کھونا پڑے گی..... فلم ساز، ہدایت کار اور کیرہرہ مین اور بھی دو ایک لوگوں کو خوش کرنا ہوگا..... یہ میری ایک دوست سجتا نے بتایا جو آج جگ مگاتا ہوا ستارہ ہے..... کوئی بھی ایسی ستارہ نہیں ہے جس نے یہ شرط پوری نہ کی ہو..... وہ کسی بھی اداکار کی بیٹی، بہن اور بیوی کیوں نہ رہی ہو اور ہے۔ اس شرط کے بغیر وہ فلمی دنیا میں نہیں آ سکتی.....

ہاں تو میں کیا کہنا چاہتی تھی میں کیا قصہ لے بیٹھی..... میں فلمی تقریبات میں شرکت کرنے لگی۔ ایک نام ور، انتہائی وجہہ اور خوب صورت ہیروئن کو دل دے بیٹھی..... اس کے پرستاروں میں لڑکیاں بہت

زیادہ تھیں۔ وہ اس پر مرتی تھیں۔ اس کی محبت میں گرفتار ہو کر نہ صرف آلودہ ہو چکی تھی بلکہ بہت دور بھی جا چکی تھی۔ یہ بات میرے علم میں تھی۔ لیکن اس کا یقین نہیں تھا۔

میں نے اسے پہلے پہل بڑی رومانی خط لکھے۔ ٹیلی فون پر بھی دیر تک جذباتی اور محبت بھری باتیں ہوتی رہیں۔ تم نے مجھے کل رات اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے تنہائی میں ملنے کے لئے خط لکھا۔ کیوں کہ ٹیلی فون اور موبائل پر اس سے بڑی مشکل سے رابطہ ہوتا تھا۔ اس نے مجھے فون کر کے پوچھا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم رات میں آ جاؤ تو ہم صبح تک رہیں۔ دلہا دلہن بنے رہیں۔ میں نے حامی بھر لی تو اس نے مجھ سے کہا کہ ”میرے ایک دوست کا نہایت شاندار لکڑی فلیٹ پلاٹ نمبر بیس پر ہے ہندوستانی میں کسی بلڈنگ میں ہے۔ ولے پارلے اسکیم میں۔“

اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔۔۔۔۔ جن میرا خواب، میرا دل اور محبت تھی۔ میں نہ صرف اس کی اداکاری بلکہ اس پر جان دیتی تھی۔ روز ہی اس کا سینا دیکھتی تھی۔ جب کسی فلم میں کسی ہیروئن کے ساتھ جذباتی منظر دیکھتی تو سوچتی کہ کاش میں اس ہیروئن کی جگہ ہوتی۔ جن نے ملنے کا پروگرام بنایا تو میں خود پر قابو نہ پاسکی۔

اتفاق سے اس روز شو بھا کی بہن کی مہندی تھی۔ میں نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ میں ساری رات وہاں رہ کر صبح آؤں گی۔ گھر والوں نے اجازت دے دی۔ یہ وہی فلیٹ تھا جس کے پتے پر میری جن سے خط و کتابت ہوتی اور ٹیلی فون پر بات۔۔۔۔۔ موبائل فون بھی اس دوست کا تھا۔ وہ کیوں اور کس لئے ایسا کرتا تھا میں نے سوچا نہیں تھی۔ مجھے آم کھانے سے مطلب تھا۔ شام ہوتے ہی میں اس سے ملنے روانہ ہو گئی۔ میرے دل نے کہا۔ ”پگلی۔۔۔۔۔! یہ تو کہاں جا رہی ہے۔۔۔۔۔؟ تو نے کچھ سوچا بھی۔۔۔۔۔؟ تو سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔۔۔۔۔؟“ لیکن میں نے دل کی

نہیں سنی۔۔۔۔۔ میں ان جانے سپنے دیکھتی جا رہی تھی۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میرے چشم تصور میں۔۔۔۔۔ میں تھی اور میرا ہیرو۔۔۔۔۔ وہ میرے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ان جانے راستے پر چل رہے تھے۔ راستہ دھول بھرا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ہم دونوں نے آزادی کا لبادہ پہنا ہوا تھا۔۔۔۔۔ لبادے کے زرو جواہر ٹوٹ ٹوٹ کر گر اور بکھر رہے تھے۔

جب میں فلیٹ پر پہنچی تو وہ میری بڑی بے تابی سے راہ دیکھ رہا تھا۔ پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سوئکار کر لیا۔ صبح جب میں اپنے گھر جا رہی تھی تو مجھ پر ایک سرشاری اور عجیب سی کیف و مستی چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنا سب کچھ اسے سوپ چکی تھی جس کا مجھے دکھ اور افسوس نہیں تھا۔۔۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنا سب کچھ کھو کر بھی بہت کچھ پایا۔ اس میں ایک نشا اور سرور تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں اس سے مصروفیت کی بناء پر نہ مل سکی۔ نہ فون اور نہ موبائل پر رابطہ ہو رہا تھا۔ پھر میں نے اسے ایک خط لکھا۔ تمہاری معیت میں میرا جو ایک ایک لمحہ گزرا وہ میری ساری زندگی کے لئے یادگار رہے گا۔ ہاں تو اب تم کب مل رہے ہو۔۔۔۔۔ میرا یہ خط ایسی آرزوؤں اور تمنائوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے وہ خط اس کے دوست کے پتے پر ارسال کر دیا۔

ایک روز میرے پتا جی ایک بہت بڑے ہوٹل اور برائے شیرٹن میں لے گئے جہاں ساجن نے کاروباری لوگوں، صنعت کاروں اور مختلف سماجی اور اہم شخصیات کو ڈنر پر مدعو کیا ہوا ہے۔ میرے پتا جی مجھے اس تقریب میں اس غرض اور ارادے سے لے گئے تھے کہ ساجن سے تعارف کرا دیں اور اس لئے کہ ساجن مجھے پسند کرے۔ انہوں نے کسی سے سنا تھا کہ ساجن کو ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ساجن مجھے پسند کر لے گا۔ کیوں کہ میں لاکھوں میں ایک ہوں چندے آفتاب چندے ماہ تاب ہوں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی فریفتہ ہو جائے گا۔ یہ بات انہوں نے

مجھ پر ظاہر نہیں کی تھی۔ ماں نے مجھے ایسا تیار کیا، لباس پہنایا تھا کہ محفل میں چودھویں کا چاند بن گئی تھی۔ مرد کیا۔ عورتیں اور لڑکیاں کیا ہر کسی کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ساجن لمحے بھر کے لئے مہبوت سا ہو کر رہ گیا تھا۔ میں شمع محفل بن رہی تھی۔ دوسرے دن ساجن نے شادی کا پیغام بھجوایا۔

اس پیغام نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ ایک طرف میرا محبوب ہیرو تھا جس سے میں بے پناہ محبت کرتی تھی اور میں نے اسے اپنا سب کچھ سوپ کر اسے جیسے غیر قانونی طور پر اپنا پتی سوئکار کر لیا تھا۔ اب میں اس کی تھی اور وہ میرا۔۔۔۔۔ دوسری طرف ایک ارب پتی تھا۔ وہ کوئی بد صورت بھی نہیں تھا۔ خوب صورت اور دلچسپ اور دراز قد بھی۔ محبت تو اندھی ہوتی ہے۔ وہ راج پاٹ بھی ٹھکر ادیتی ہے۔ جب میں نے ساجن کا رشتہ منظور کرنے سے انکار کیا تو ماں نے حیران ہو کر کہا۔ ”تمہاری عقل ٹھکانے ہے۔ اتنا بڑا رشتہ ٹھکرا رہی ہو جو پسنے میں بھی نہیں مل سکتا۔“

”ماں۔۔۔۔۔! تمہیں بتاؤں کہ سچی بات کیا ہے۔ میں فلمی ہیرو جن کو دل دے بیٹھی ہوں۔ وہ بھی مجھے چاہتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے ہیں۔ ہم دونوں شادی کر کے گھر بسالیں گے۔ یہ میرے لئے کتنی عزت اور اعزاز کی بات ہے کہ ہندوستان کی فلمی دنیا کا مایہ ناز ستارہ جس کی عزت اور شہرت کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بج رہا ہے۔ جس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ ہندوستان میں سب سے زیادہ ٹیکس دینے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔“

ماں نے بڑی خاموشی سے میری بات سنی پھر اس نے کہا۔ ”کیا تم نے دیکھا نہیں؟ جانتی نہیں ہو۔ کتنے ستارے فلمی دنیا کے افق پر ابھرے اور پھر ڈوب گئے۔ ان کا نام و نشان تک نہیں اور نہ ہی ان کا نام لینے والا ہے۔۔۔۔۔ اور ان میں جانے کتنے کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی دو تین فلمیں فلاپ ہوئیں وہ بھی غلاب ہو گئے بد صورت کے ڈھول بھانسنے

ہوتے ہیں۔ عقل سے کام لو۔۔۔۔۔ حقیقت پسند ہو۔ مستقبل کے بارے میں سوچو۔۔۔۔۔ ساجن ایک ارب پتی ہے۔ اس کی پتی بن کر خواہوں جیسی زندگی گزار دو گی۔“

”ماں۔۔۔۔۔! آپ کچھ بھی کہہ لیں۔۔۔۔۔ میں شادی کروں گی تو صرف اور صرف جن سے۔ ساجن سے نہیں۔“

”میں تمہیں تین دن کی مہلت دے رہی ہوں۔“ ماں نے کہا۔ ”تمہارے پتا جی ساجن سے تمہاری شادی ہر قیمت پر کرنا چاہتے ہیں۔“

میں ساری رات سو نہ سکی۔ ساجن اور جن کا موازنہ کرنی اور سوچتی رہی۔ جن میری آتما۔ میرا سپنا اور میری ذات کا جزو بن چکا تھا۔ میں کیسے ساجن کو اپنے وجود کو ملکیت بنانے دے سکتی تھی۔ لیکن دوسرے دن مجھ پر کوئی بجلی سی آن گری۔۔۔۔۔ جن اور اداکارہ شو بھانے لندن میں شادی کر لی تھی۔ وہ دونوں بنی مون منانے سوئٹزر لینڈ چلے گئے تھے۔ یہ سب کچھ انتہائی خاموشی سے اچانک اور غیر متوقع ہوا تھا۔ میڈیا کو کیا کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو کہ فلمی دنیا میں کتنی گندگی ہے۔ غلاطت ہے۔ جو گرتا ہے ٹٹلے کے بجائے دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ کس لئے صرف دولت کے لئے۔۔۔۔۔ بہن، بھائی، شوہر اور ماں باپ۔۔۔۔۔ ساس، سرور اور بہو۔ ان سب سے کہا جاتا ہے کہ پیسہ کماؤ۔ پیدا کرو۔۔۔۔۔ یہ مت دیکھو۔ کیسے اور کہاں سے آتا ہے۔۔۔۔۔ صرف آنا چاہئے۔ رشتوں کی پاکیزگی کچھ نہیں ہوتی۔ شو بھانے نس و لڈ ہونے کے بعد کالی راتوں سے خوب پیسہ کمایا تھا۔

میرے اندر کی زخمی عورت تھلا اٹھی۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا کرنا چاہئے مجھے۔ انتقام۔ خوف۔ ناک اور بھیا نک انتقام۔ اب ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ میں ساجن سے شادی کر لوں۔ پھر میں نے ساجن کا رشتہ منظور کر لیا۔

قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

عجیب اب کے بہار گزری ہے
تیرے بغیر بیقرار گزری ہے
تیرے بعد تو میرے اے میر
ساری خوشیاں سوگوار گزری ہے
(منیر احمد ساغر.....میاں جنوں)

تمہارے آنے کی اک آہٹ سی ہوتی ہے
نہ جانے کیوں دل میں ہلچل سی ہوتی ہے
تمہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے 'احسان'
تمہاری آنکھوں میں اکثر ایک شرارت سی ہوتی ہے
(احسان سحر.....میاں لویاں)

کہا اس نے محبت کو شریک غم بنا مجھ کو
میں کردوں گا زمانے کی خوشی سے آشناتم کو
(بلیس خان.....پشاور)

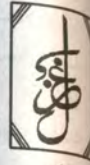
یہ پیار محبت کھیل نہیں یہ اک دوجے کا میل نہیں
یہ پائیزہ رشتہ ایسا جس نے کھیلا وہ کھیل نہیں
یہ پیار محبت بندھن ہے یہ رشتوں کا اک سنگم ہے
جو پیار کرے گا سچا، وہ پاس ہوا ہے قفل نہیں
(عثمان غنی.....پشاور)

دل جو ٹوٹا تو دل کے کونوں سے
تیری میری نشانیاں نکلیں
تو گیا تو میرے یاروں میں
کیسی کیسی کہانیاں نکلیں
(انتخاب: راجہ باسط مظہر.....حامد تھکلی گوجران)

خواہشوں کی ساری طلب بس تم پر ختم ہے
میری زندگی میں مسکراتی خوشی تم سے ہے
تم بن ہر سمت اندھیرا ہر سو اداسی ہے
میری تو آنکھوں میں چمکتی روشنی تم سے ہے
(انتخاب: احمد حسین.....نڈوالہ دیار)

ہم سے اک بار بھی جیتا ہے نہ جیتے گا کوئی
وہ تو ہم جان کے کھالیتے ہیں ماتیں اکثر
ہم نے ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن ہواؤں نے الٹ دی ہیں بساطیں اکثر
(انتخاب: شہریار علی.....حیدر آباد)

☆☆



صرف اندیشہ انہی ہی نہیں
پھول کی شاخ بھی ڈستی ہے یہاں
رخ کدھر موڑ گیا ہے دریا
اب وہ لوگ نہ وہ بستی ہے یہاں
رند درگور ہوئے اہل نظر
کس قدر مردہ پرتی ہے یہاں
زیست وہ جنس گراں ہے کہ ناصح
موت کے مول بھی سستی ہے یہاں
(انتخاب: نوشین خان.....کوٹ مظفر علی)

ذوب تو جانا ہے حسرت سے کنارا دیکھ لوں
اپنے گھر سے نکل کر اب شہر سارا دیکھ لوں
موت کو کبھو شہر چا منزل بڑی نزدیک ہے
جس کی خاطر تو ملی اس کو دوبارہ دیکھ لوں
سچ تو یہ ہے کون رکے پاس عمر بھر ہم کو
چند دن کا ہی اس بے وفا کا سہارا دیکھ لوں
پیار کیسا کھیل ہے دیکھو تو اس کو کھیل کر
کس قدر ہوتا ہے بازی میں خسارہ دیکھ لوں
اور بھی لوگ تھے طلعت بھرے بازار میں
کس نے مجھ کو پیار سے پکارا دیکھ لوں
(شرف الدین جیلانی.....نڈوالہ دیار)

مرتی ہوئی زمین کو بچانا پڑا مجھے
بادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے
یادیں تھیں دفن ایسی کہ بعد از فروخت بھی
اس گھر کی دیکھ بھال کو جانا پڑا مجھے
نمی رہتی تھی پلکوں پہ ہمیشہ
اس نمی کو صحرا تلک لانا پڑا مجھے
(انوری رمضان.....پنڈواذخان)

برسوں کی چاہت کو پل بھر میں بدلتے دیکھا ہے
ہر دم چاہنے والوں کو چاہت سے مسکراتے دیکھا ہے
وہ جو ہمیشہ اپنے پیار پر فخر کی باتیں کرتے تھے
ان کو ہم نے سچ بازار میں آنکھیں بدلتے دیکھا ہے

جب تک میرے اندر کوئی بادل نہیں ہوتا
بہ میرا بارش سے جل ٹھل نہیں ہوتا
برسوں سے اٹھا رکھا ہے انا کا پرچم
لیکن میرا بازو کبھی ٹھل نہیں ہوتا
ہاں ہے تجربات کی آگ میں شاعر
ایسے تو وہ شاعر صاحب غزل نہیں ہوتا
ہر شخص یہاں سود و زیاں سے ہے واقف
اس دور کا مجنوں بھی پاگل نہیں ہوتا
فطرت کے مسائل تو حل ہوتے ہیں فوراً
یہ مسئلہ حقیقی محبت کا ہے حل نہیں ہوتا
زمت کے شب و روز مجھے ہوش نہیں رکھتے
زفت میں بھی دل میرا بے کل نہیں ہوتا
اس کو بھی بچھڑ کر میرا رخ ہوا واحد
یوں تو پھیلتا میرا عشق نہیں ہوتا
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گیلوی.....کراچی)

فطرت کے بدلے غم سے سمجھوتہ کردوں کیسے
رنگوں پہ چھا گئے مگر دل پہ اختیار نہیں
فطرت نصیب ہیں لوگ رہتے ہیں جو پھولوں میں
نٹوں میں سلگتے رہتے ہیں دل کو قرار نہیں
چمکانی ہے اداسی کی لہر ہشتے مسکراتے چہروں پہ
کون کسی کو پرکے گا دل میں مگر پیار نہیں
روز جھپٹتے دیکھتے ہیں ہم پھول اپنے آگن میں
کسی کے آنے کی امید سہی مگر اب انتظار نہیں
لوگ خود کو روگ لگا لیتے ہیں جاوید
خوشیاں تھیں یہاں بھی اب وہاں بہار نہیں
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

کس قدر آگ برتی ہے یہاں
کس قدر شبنم کو برتی ہے یہاں

ہم نادان تھے پہنے سجائے تھے پیار کے
پھر ان سینوں کو روز بکھرتے دیکھا ہے
کہتے تھے جو ہر رستے پر تیرا ساتھ نبھائیں گے
ان کو ہم نے بن بٹلائے راہ بدلتے دیکھا ہے
جنہوں نے قسمیں کھائی تھیں دل توڑنے کی
ان کو ہم نے بل بھر میں قسمیں توڑتے دیکھا ہے
(محمد ہمایوں تولی..... اسلام آباد)

آسمانوں پر کوئی بشارت نہیں اور زمین لنگ ہے
وقت اک بیوہ ماں کی طرح سوگ میں مبتلا اور
سسکیاں لے کے چلی ہے کالی ہوا
خواہشوں کے کنول درو کی پھیل سے سر اٹھاتے نہیں
خواب تک بند آنکھوں میں آتے نہیں
ساری کچی کتا بوں میں یہ درج ہے
ایسے حالات میں
آسمانوں سے نبی بابتا ہی زمین کی طرح
بیچتے جاتے رہے ہیں
مگر ان کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے
نبی اب نہیں آئیں گے!!

(عاصمہ رمضان..... چنڈا واخان)

چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا کب کا
تمہارے چاہنے والا تو مر گیا کب کا
نہ میری روح میری ہے نہ میرا جسم میرا
ترا وجود تو مجھ میں اتر گیا کب کا
وہ ایک شخص جو سب کو سنبھالے رکھتا تھا
تمہیں خبر ہی نہیں ہے بکھر گیا کب کا
تو جس کے وعدوں کو دل سے لگائے بیٹھا ہے
وہ اپنی بات سے پیارے مگر گیا کب کا
وصی میں عشق میں رو بھی چکا ہوں مر بھی چکا ہوں
حدود جسم سے میں تو گزر گیا کب کا
(راجہ باسط مظہر..... گوجرانہ گاؤں حامد جھنگی)

سارے جہاں کی خوشیاں ان کا نصیب کردے
ہٹے رہیں خدا وہ انہیں خوش نصیب کر دے

کبھی دل نہ ان کا ٹوٹے، کبھی چوٹ نہ وہ کھائیں
ان کو وفا کے یارب اتنا قریب کر دے
ان کے لبوں پہ یارب سدا ہوا مسکرائیں
قسمت میں ہر پل ہنسا ان کا نصیب کر دے
چل کر جہاں بھی جائیں پھولوں کے رستے ہوں
منزل ہر خوشی کی ان کے قریب کر دے
(انتخاب: صدف حسین..... کراچی)

اے میرے ہدم لوٹ کے آجا
تجھ کو پکارے میرا یہ من لوٹ کے آجا
جانے کہاں تم کھو گئے ہو
دل ہے دیران میرا لوٹ کے آجا
پیار کی قسمیں کیا تم بھول گئے ہو
قسمیں نبھانے لوٹ کے آجا
تم کہاں گئے خوشیاں روٹھ گئیں
اب مجھ کو منانے لوٹ کے آجا
تیرے آنے سے پہلے دم ٹوٹ نہ جانے
سانوں کو ہے تیرا انتظار لوٹ کے آجا
(زاہدہ عطا محمد..... کراچی)

یہ زرد چٹوں کی بارش میرا زوال نہیں
میرے بدن پہ کسی دوسرے کی شال نہیں
اداس ہو گئی اک فاختہ چپکتی ہوئی
کسی نے قتل کیا ہے یہ انتقال نہیں
تمام عمر غریبی میں باوقار رہے
ہمارے عہد میں ایسی کوئی مثال نہیں
میں آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہوں
کہاں ملی تھی یہ دنیا مجھے خیال نہیں
کوئی خوشی ہو میں اپنی حدوں میں ہوں
میرا ملال بھی حد سے سوا ملال نہیں
(سنبل مایین مل..... سرگودھا)

تحقیق کی راہوں میں ہوتے نہیں فسانے
تحقیق تیری تھی اب گزرے وہ زمانے
میرا دل تیرا دل اب بھی ملے گا
میرا دل تیرا دل اب بھی ملے گا

ہماری دن ہمارے اب بن گئے افسانے
جو دل ہی نہیں واقف تھا غم کی جلن سے
آج آئے تم ہو کیوں میرے دل کو جلانے
جن آنکھوں میں خوشیاں جبی ہوئی تھیں
اب آئے ہو اسی پلکوں کو بھگانے
جس کو ہر دعا میں مانگتی تھی بخشش
اس نے کسی اور کے نام کے بجائے شادیانے
(انتخاب: بلقیس خان..... پشاور)

میری آنکھوں میں بہت خواب ہے
عجب ہے نا کہ بہت سراب ہے
تھیں ہیں الگ یہ چاہتیں ہیں الگ
مگر باوجود یہ کیسے نفرتوں کے عذاب ہے
یہ کیسی مدھوش سی چھا رہی ہے مجھ پر
یہ کیسے میرے نصیب کے سوکھے گلاب ہے
اس کی دیدار کی خاطر میں اس کی گلی جاؤں
میں اس کو دیکھوں، لیکن اس کے چہرے پہ نقاب ہے
اک دن میں بھی کروں گا اس سے ساری پیار کی باتیں
میرے دل میں تو صرف اس کا حساب ہے
آن وہ مل گئے سر راہ، مجھ سے منہ پھیر کے بولے
یہ پاگل دیوانہ کس کے لئے اتنا بے تاب ہے
(عثمان غنی..... پشاور)

رقص کرتی ہوئی سوچ کی لہریں
آن پھر رات کے آخری پہریں
یاد آیا مجھ کو میرا ماضی
میرا ماضی! کہ جس میں ٹکھن مرے
حسرت ویاس کے ان گنت سلسلے
غم ابھرتے گئے
اپنے حصے کا جیون میں جیتا رہا
نہر پیتا رہا
میں اپنے ملنے ماضی سے
جان چھڑا رہا
(زین جاوید..... چنڈا واخان)

چلو کچھ دیر بیٹھتے ہیں
محبت پر معایت پرے بنیاد باتیں ہیں
سبھی رشتے سبھی ناتے
ضرورت کی ہیں ایجا دیں
کہیں کوئی نہیں مرناسکی کے واسطے جاناں
کہ سب ہے پھیر لفظوں کا، ہے سارا ٹھیک حرفوں کا
نہ ہے محبوب کوئی بھی سبھی جملے سے کہتے ہیں
چلو کچھ دیر بیٹھتے ہیں

اسی کو یاد کرتے ہیں، جسے ہم زیت کہتے ہیں
کہ لینا سانس بن جس کے ہیں اک جرم لگتا تھا
کہ رنگ جس کے ہر اک لمحہ خوش و خرم گزرتا تھا
جسے ہم زندگی کہتے جسے ہم شاعری کہتے
غزل کا قافیہ تھا جو، تھا جو عنوان نظموں کا
وہ لہجہ جب بدلتا تھا، قیامت خیز لگتا تھا
وقت سے آگے چلتا تھا، بلا تیز لگتا تھا
جو سایہ بن کے رہتا تھا جد اب اس کے راستے ہیں
چلو کچھ دیر روتے ہیں
چلو کچھ دیر بیٹھتے ہیں

(احسان سحر..... میانوالی)

میں حال دل کا سنا رہا ہوں
یوں عمر اپنی گھٹا رہا ہوں
دیئے جو تو نے تھے دکھ مسلسل
وہ غم میں سب سے چھپا رہا ہوں
اشک اندر ابل رہے ہیں اے منیر
مگر میں سب کو ہنسا رہا ہوں
وقت نے بھر دیئے جو زخم دل کے
میں پھر سے ان کو دکھا رہا ہوں
جو چار سوں تھیں دل میں میرے
وہ دیوار دل کی گرا رہا ہوں
پھر کہاں تلک ستم میں نے جھیلے
میں کہاں تک پاؤں رہا ہوں
کلوے کلوے ہوا کیسے دل یہ میرا
پھینک کے پتھر یہ شیشہ دکھا رہا ہوں
سافر بعد ترے گئی یہ زلیست کیسے؟

میں زندگی سے بھی خفا رہا ہوں
منیر یہ اشک تیری رفاقتیں تھیں
لو میں آج تجھ کو لٹا رہا ہوں
(منیر احمد ساغر..... میاں چنوں)

اک روز جیتی جاگتی الفت ملے ہمیں
قمر مسکراؤ عین کا مجھ پر
مرمر کر زندہ رہنے کی عادت ملے ہمیں
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..... مکان)

لکھی ہے یہ غزل صرف تیرے لئے
ہم بنے بھی تو صرف تیرے لئے
کسی کو نہیں دیکھیں گی اب یہ آنکھیں
نظریں ترسیں گی بھی تو ایسے صرف تیرے لئے
ہر سانس نکلے گی بھی تو صرف تیرے لئے
ہر پیار سے پیاری لگتی ہو تم مجھے
میں نے پیار سیکھا بھی تو صرف تیرے لئے
(محمد مشتاق ساغر..... چنگی برہان)

ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے
فاصلہ قربتوں کا بڑھنے لگتا ہے
دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے
پریشانی کے عالم میں دم گھٹنے لگتا ہے
پرانی یادوں کے افسانے بن جاتے ہیں
آنکھوں میں بننا نقش بھی مٹنے لگتا ہے
کچھ بھی باقی نہیں رہتا یادوں کے سوا
جب سانس کا رشتہ جسم سے کٹنے لگتا ہے
ہر انسان کے ساتھ یہی مسئلہ ہے
کہ وہ انا کی چکی میں پسنے لگتا ہے
وقت خود ہی زخمی دل پر مرہم لگا دیتا ہے
آہستہ آہستہ زخم جدائی بھرنے لگتا ہے
خود ہی اپنے پیدا کردہ مسائل میں ڈاکر
ایک دن انسان گھٹ گھٹ کر مرنے لگتا ہے
(محمد ذاکر ہلال..... آزاد شیر)

روداد محبت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دودن کی مسرت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
کچھ حال کے اندھے سامنے تھے، کچھ ماضی کے عیار بن گئے
احباب کی چاہت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
کانٹوں سے بھرا ہے دامن دل، شبنم سے سلگتی ہیں پلکیں
پھولوں کی سخاوت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
اب وقت کے نازک ہونٹوں پر، مجروح ترنم رقصاں ہے
بیداد مشیت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
اب اپنی حقیقت بھی ساغر بے ربط کہانی لگتی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
(انتخاب: محمد عثمان علی..... میاں چنوں)

ہوا نہیں تو یہ ممکن ہونے لگ جائے
ہوا چراغ کا دکھ سن کر رونے لگ جائے
زمین کا ہاتھ پکڑنے کی اندھی خواہش میں
فلک سرکتا سرکتا نہ کونے لگ جائے
ہم ایسے لوگ سفر پر نکل بھی آئے اگر
تو سنگ میل مسافت کو رونے لگ جائے
یہ کیسا گھر درختے میں مل گیا مجھے
کہ در جگاؤں تو دیوار سونے لگ جائے
(سجاد حسین نومی..... پنڈو ادھان)

مولو! یہ تیری خاص عنایت ملے ہمیں
غم کی سیاہ رات سے فرصت ملے ہمیں
ہم تو تیرے وصال کو گنتے تھے ہر گھڑی
کس نے کہا تھا تجھ سے کہ فرقت ملے ہمیں
قاصد کو روتا دیکھ کر دل نے یہی کہا
اک روز راستے میں قیامت ملے ہمیں
قلب و جگر کے جب وہ سیما ہی ہو گئے
دشمنوں کو سپہ کر پنے کی عادت ملے ہمیں
نفرت ہی رخص کرتی ہے پلوں کی بچ پر

لکھوں نعت نبیؐ میں، اتنا مجھ میں کمال کہاں
نہ کرے جس دم ورد آپ کا، دل کو یہ مجال کہاں
حسین ہے مجھ کو نیائے آفتاب و قمر بھی

پہ یہ بھی سچ، میرے نبیؐ سا آئیں جمال کہاں
شیدائے مصطفیٰ ہوں، گدائے مجتبیٰ ہوں
اسی پہ ناز ہے مجھے اور میرا کوئی کمال کہاں
کروں دیدار آپ کا، حاصل ہو یہ سعادت مجھ کو
پر سوچوں تو میں کہاں اور میرا سوال کہاں
(افضل رباب..... کراچی)

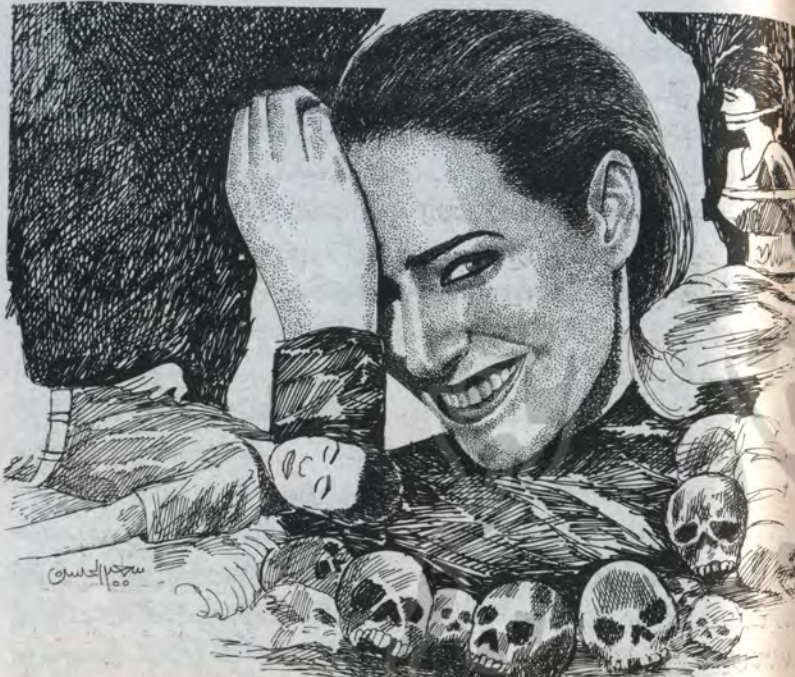
اکیلے پن میں بھی حیات گزر جاتی ہے
ملاقات وہی بار بار یاد آتی ہے
اس کی باتوں کو جب بھی سوچتا ہوں میں
ہونٹوں پر مسکان سی آکر گزر جاتی ہے
ہائے رے گزرے وقت تجھے میں کیا کہوں
امید لگتی ہے پر آس گزر جاتی ہے
باتوں باتوں میں جب ذکر تیرا چھڑ جائے
جاگ کر ہی سہی پر رات گزر جاتی ہے
شوخ نظروں سے تیرا سر کو جھکا کے کہنا
تیری یادوں میں شب و رات گزر جاتی ہے
کبھی ملتی تھی وہ دن میں کئی بار مجھے
اب قریب سے چپ چاپ گزر جاتی ہے
(سلیم عباس کنول..... چنیوٹ)

جس نے لوٹا تھا میرا گھر بار میرے سامنے
دیر تک روتا رہا وہ یار میرے سامنے
میں بھی دل سے اس کی کم ظرفی کا قائل ہو چلوں
میری چاہت سے کرے انکار میرے سامنے
دل ہی دل میں میری شخصیت کا وہ قائل رہا
کر سکا نہ پر کبھی اظہار میرے سامنے
جو گناہوں میں رہا میرے برابر کا شریک
بن رہا ہے اب وہ باکردار میرے سامنے
دے چکے مجھ کو تسلی تو ہوا ان کا یہ حال
رو پڑے میرے سبھی غم خوار میرے سامنے
کرتو لیتے عاقل حاصل اپنے ہم محبوب کو
بن گئی دنیا مگر دیوار میرے سامنے
(اے ایس عاقل سادون..... کراچی)

کیسے بھلا دوں؟
وہ گھڑی
وہ پل
جب پہلی بار ان آنکھوں نے
تیرا دیدار کیا تھا
جب ان دھڑکنوں نے تیرا نام لیا تھا
تیری آرزوؤں کی تھی
زبان نے قسم اٹھائی تھی کہ تیرے سوا کسی
کا نام نہ لیں گے
سانسیں مہک اٹھی تھیں
تیرے وجود کی خوشبو پا کر
اس دن سے لے کر آج تک
ہر دن تیرے دیدار کی آس جینے کی
تنتنا کرتی ہے
اور ہر پل تیرے بنا جینے کا خوف
مرنے کی آرزو کرتا ہے
اس ایک گھڑی نے میری زندگی
میرے دن رات بدل دیئے
میں کیسے بھلا سکتا ہوں
وہ گھڑی
وہ پل

(اذان عزیز..... ٹنڈو آدم)

سال نو تو آ رہا ہے دلہیز پر
الوداع ہو رہا ہے یہ سال
ان گنت دکھ سکھ رنج و ملال
مہنگائی غربت و افلاس کا جال
باپ کا سایہ اٹھنے کا ملال
شہر نگار میں خونی جھگڑے
ڈوب کر پیاروں کے مرنے کا ملال
سال نو آرہے ہو تم مرحبا!
سکھ اور دکھ کا لے کر قتال
دے دو سب کو قہقہے مکان، امید وصال
(عروج ماہین ط..... سرگودھا)
☆☆



ذرا سی بات

عامر ملک - راولپنڈی

اچانک چارپائی پر پڑا ہوا مردہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کی شعلہ بار آنکھیں انگارہ برسانے لگیں، اس کے منہ سے دو دو انچ لمبے دانت باہر کو نکل آئے، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے کو بڑھنے لگا کہ اچانک.....

خود غرضی کے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک انوکھی خواہش کا دردناک اور بھیا تک انجام

میں لائین بچانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے زور زور سے دروازہ کھولا تو اس نے اپنے منہ سے دو دو انچ لمبے دانت باہر کو نکل آئے، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے کو بڑھنے لگا کہ اچانک.....

چاند رویا تھا ستارے ٹوٹے جن کی تعبیر تو ممکن ہی نہیں ہے سرسبز بناتے ہیں ہم سے جب یار پرانے مچھڑے ہم نے ایسے بھی خواب دیکھے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے!! ہم نے اس وقت ڈیوڈی ناؤ ایک ہی لفظ میں جو بات مکمل کر دیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے!! ہم سے جس وقت کنارے چھوٹے ہم نے ایسے جناب دیکھے ہیں (عائشہ ارما..... پشاور)

ان کے چہرے پہ ہے ایسی رونق ساتھ رہتے تھے مگر پھر بھی مخالف تھے امتیاز ہم نے ایسے احباب دیکھے ہیں (ایس امتیاز احمد..... کراچی)

جیسے آندھی میں کوئی دیپ جلے دل کو دلہیز پہ رکھ دیتے ہیں اے دوست سن فریاد میری کبھی دنیا تھی آباد میری ہم چراغوں کی طرح شام ڈھلے میں پریم نگر کا باسی تھا گھر کے دروازے کو کوئی نہ کھتا رہا اور پیار کا اتنا عادی تھا رات بھر چاندنی سنگتاتی رہی کہ سانس پیار سے چلتی تھی رات بھر کوئی تنہا سستا رہا دھڑکن بھی گیت سناتی تھی آج پھر رات بسر ہوگی نوری جی نہ کھانا پینا عشق سدا (غلام نبی نوری..... کھڑیاں خاص)

اس کی یادوں کا تھا سفر لوگو نیند آتی کیا رات بھر لوگو زخم مجھ کو ملے جدائی میں میں رہا پھر بھی بے خبر لوگو کس طرح سے اسے مناتا میں لفظ سارے تھے بے اثر لوگو صرف آنکھوں میں اشک تھکے تھے خواب سارے تھے در بدر لوگو تنہا تنہا ہے آج بھی رانا زندگی ہوگی کیا بسر لوگو (قدیر رانا..... راولپنڈی)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ہم جانے دل کے سہارے ہم خون میں ہم رنگ جاتے ہیں کانٹوں کو چٹختے، چٹختے تینوں جیسے سراب کے پیچھے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے بھاگ رہے ہیں رفتہ رفتہ کو شمع کے مانند مکمل رہے ہیں رفتہ رفتہ بجھنے لگے ہیں (عثمان غنی..... پشاور)

ہم نے ایسے احباب دیکھے ہیں اور بھی حسن کو جو کردے حسین ہم نے ایسے جناب دیکھے ہیں اور انجان گلیوں کو عمر بھر دیکھیں مگر دل نہ بھرے تمہارے قدموں تلے ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں اے آباد کر رہے ہیں (☆☆)

میں۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ہمارے ایک قریبی رشتہ دار فیض عالم خان تھے۔ اس وقت وہ بہت ہی پریشان لگ رہے تھے ان کے سر پر سفید رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ بلیشیا کی میضی شلوار پہنے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں انہوں نے لاٹھی پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے جب انہیں پہچان لیا تو ان کے ہاتھ سے لاٹھی لینے کی کوشش کی مگر انہوں نے وہ بہت ہی مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”چچا اس وقت کیسے آنا ہوا؟“ کہنے لگے۔ ”بیٹا ذرا اپنے والد صاحب کو لوجھا دو تا کہ وہ میری کچھ مدد کریں۔ میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔“

میرے چگانے سے پہلے ہی ہماری آواز سن کر والد صاحب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اور پھر وہ خودی اٹھ بیٹھے تھے۔ اباجان نے ان سے پوچھا۔ ”بھائی فیض عالم خیر تو ہے ناں؟“ تو وہ بولے اور کہنے لگے۔ ”آج میری بیوی غائب ہوگئی۔ میں شام کو جب گھر واپس آیا تو مغرب کا وقت تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ نظر نہ آئی۔ میں نے سمجھا کہ شاید کنویں سے پانی لینے گئی ہو۔ یا کہیں اڑوس بڑوس میں ہوگی تو آجائے گی۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب اندھیرا پھیل گیا اور وہ نہ آئی تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں نے بڑوس والوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور کہنے لگے آج تو ہم نے تمہاری بیوی کو دیکھا ہی نہیں۔ ان کی چھوٹی بیٹی سے معلوم ہوا کہ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے میری بیوی کنویں سے پانی کا گھڑا بھر کر لائی تھی۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کہاں گئی؟ ویسے مجھے شک ہے کہ وہ شاید قریب کے جنگل میں نہ چلی گئی ہو۔“ میرے اباجان نے کہا۔ ”رات کو اس کا جنگل میں کیا کام؟ ویسے ہی کہیں ادھر ادھر ہوگی۔“ کہنے لگا۔ ”بھائی صاحب ایسا ہونی نہیں سکتا کہ وہ رات تک کسی کے ہاں رہ سکتی ہے۔ مجھے جنگل کا شک اس لئے پڑ رہا ہے کہ وہ کئی دنوں سے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ نزدیکی ہی ساگ اگا ہوا ہے سب عورتیں جن کر لاتی ہیں۔ میں بھی لے کر آؤں گی۔ مگر میں نے

تو اس کو منع کر دیا تھا۔ وہ اکثر ضد کرتی رہتی تھی۔ اور مجھے اس لئے بھی یقین ہے کہ ابھی تک چولے میں آگ بھی نہیں جلی اور نہ ہی کوئی ہانڈی وغیرہ پکی ہوئی ہے۔“ میرے والد نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ ابھی تک تمہارے لئے ساگ ہی جن رہی ہوگی۔“ وہ کہنے لگے۔ ”یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ شاید رات پڑ گئی ہو۔ اور یا تو اسے کسی درندے نے ہلاک کر دیا ہو یا وہ راستہ بھول کر آگے چلی گئی ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ وہ یہاں کی رہنے والی تو ہے نہیں کہ اسے جنگل کے راستوں کا علم ہو۔ لیکن شوق میں چلی گئی اور مجھے پریشان کر دیا۔“ اباجان نے کہا۔ ”اب تمہارا کیا خیال ہے کیا اسے اس وقت جنگل میں تلاش کرو گے؟“

”میرا تو یہی ارادہ ہے۔ اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آج میری مدد کریں کہ شاید اس کے زندہ یا مردہ ہونے کا پتہ چل جائے۔“ والد نے کہا۔ ”چلو میں تیار ہوں۔ ایک دو آدمی اور بھی ساتھ لے لو۔ اور یہ دوسری لائین بھی لئے چلتے ہیں۔“ یہ کہہ والد صاحب تیار ہونے لگے۔ ان کو دیکھ کر میں نے کہا۔

”اباجان۔ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔ میں تیار ہوتا ہوں۔“

”اباجان نہ مانے مگر میں نے ضد کی تو وہ راضی ہو گئے اور میں بھی ان کے ساتھ چچا فیض عالم کی بیوی کو تلاش کرنے کے لئے چل پڑا تو تھوڑی دور جا کر چچا فیض عالم نے چار آدمی اور بھی ساتھ لے لئے۔ ان میں ایک میرا بھوئی بھی زاد بھائی نعیم بھی شامل ہو گیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ شاید نیند میں اٹھنا اسے بہت ہی ناگوار گزرا تھا۔ اب ہم کل چھ فرد ہو گئے ان میں سب سے کم عمر میں ہی تھا۔

تین گھنٹے تلاش میں گزر گئے۔ فیض عالم سب سے آگے چل رہے تھے اور اپنی بیوی کا نام لے لے کر پکارتا جا رہا تھا۔ ویسے تو سارا جنگل چاندنی میں نہایا ہوا تھا مگر بعض جگہوں پر بالکل اندھیرا ہو جاتا تھا۔ جہاں سے

گزرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لائین کی روشنی کا کافی غایت ہو رہی تھی۔ تلاش کرتے کرتے ہم سب ہی تھک گئے تھے اب تو جنگل کے پرندے بھی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ صبح ہونے والی ہے۔ فیض عالم اب بھی اپنی بیوی کو پکارے جا رہا تھا۔ اب ہم سب ایک کشادہ جگہ پہنچ گئے۔ تب نعیم نے کہا۔ ”بھائی..... میں تو بالکل ہی تھک گیا ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ سے ہم سب لوگ وہیں آئے سانسے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ چچا فیض عالم کی بے چینی نمایاں تھی اب سب لوگ واپس جانے کے لئے مشورہ کرنے لگے۔ میں نے چچا فیض عالم سے کہا۔ ”چچا اب ہم نے جنگل کا کافی حصہ کھنکھال لیا ہے۔ مگر چچی کا کوئی نام و نشان نہیں ملا اس لئے اب یہاں پھرتے رہنا بے کار ہے۔ چلیں واپس گاؤں چلتے ہیں۔“

چچا فیض عالم کچھ دیر چپ رہ کر سوچتے رہے اور پھر کہنے لگے۔ ”ہاں تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ اب واپس ہی چلنا چاہئے مگر میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس راستے سے واپس جانا چاہئے۔ انہوں نے مشرق کی طرف اپنی لاٹھی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ایک اور آدمی نے کہا۔ ”میں فیض عالم! ہم لوگ ادھر نہیں جائیں گے تمہیں معلوم ہے کہ وہ جگہ بہت ہی خطرناک ہے۔ وہاں تو دن کے وقت لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔“

مگر فیض عالم نے کہا۔ ”اب اتنی محنت آپ لوگوں نے کی ہے تو تھوڑی سی ہمت اور کریں میرا شک دور ہو جائے۔“ یہ کہہ کر وہ سب کے آگے چل پڑے ہم لوگ بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ دراصل وہ جگہ بھول ہمارے ساتھی کے بہت ہی خطرناک تھی سامنے کی پہاڑی ایسی تھی کہ اس کے تمام پتھر سیاہ رنگ کے تھے اور اکثر ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے کھائی میں گرے رہتے تھے اور بعض پتھر تو سینکڑوں ٹن وزنی تھے۔ اس سے ذرا آگے بڑھیں تو پہاڑی کے بائیں طرف ایک بڑا سا پانی کا گڑھا تھا۔ جس کی لمبائی چھ گز کے قریب تھی اور چوڑائی بھی اس

سے کچھ ہی کم تھی۔ اس کے ایک طرف پہاڑی کا حصہ پانی کے اوپر اس طرح جھکا ہوا تھا کہ وہ بہت بڑا غار معلوم ہوتا تھا۔ وہاں کبھی کوئی نہیں جاتا تھا بلکہ آج تک بھی کوئی نہیں گیا تھا اور گڑھے کی گہرائی کا اندازہ بھی کوئی نہ کر سکتا تھا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ چند آدمیوں نے اس کی گہرائی ٹاپنے کی کوشش کی تھی اور ایک بہت بھاری پتھر ایک ری کے ساتھ باندھ کر اس کی گہرائی ٹاپنے کی کوشش کرنے کے لئے پانی میں ڈال دیا تھا۔ اور ری کے ساتھ مزید ری باندھتے گئے یہاں تک کہ ایک چار پانی کا پورا بان ختم ہو گیا۔ پتھر بھی تھک نہیں جاسکتا تھا۔

جس آدمی نے ری پکڑی ہوئی تھی اس کے ہاتھوں سے اب خون رسنے لگا تھا۔ اور ردی وجہ سے ری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تو اس کے بعد دوبارہ کسی نے ایسی کوشش نہیں کی تھی۔ اس لئے اس کی گہرائی کا کسی کو بھی اندازہ نہ تھا۔ کچھ عرصہ اس گڑھے کی وجہ سے اور کچھ وہاں کا ماحول ہی ایسا پر اسرار تھا کہ ایلا آدمی تو اس طرف سے گزرتا ہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ گاؤں میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ یہاں جنگلی بلائیں رہتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم لوگ ادھر جانے سے کتراتے تھے جب ہم لوگ پہاڑی سے کوئی آٹھ گز کے فاصلے پر پہنچے تو صبح ہو گئی تھی۔ اب ہم لوگ لائین کی روشنی کے محتاج بھی نہیں رہے تھے۔

اجانک چچا فیض عالم جو سب سے آگے تھے کہنے لگے۔ ”بھائی۔ وہ سامنے پتھر کے سہارے دیکھو۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی انسان کھڑا ہے۔“

ہم لوگوں نے ادھر دیکھا تو واقعی وہ کسی انسان کی پرچھائیں سی نظر آ رہی تھی۔ جب ہم آہستہ آہستہ نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی انسان ہے بلکہ ایک عورت ہے اور پہلی ہی نظر میں ایسا معلوم ہوا کہ وہ پتھر کے ساتھ لگ کر کھڑی ہے اور بازو جو پتھر کے اوپر کی طرف رکھا ہوا نظر آ رہا ہے اس میں ایک ٹوکی لٹک رہی ہے اور اس کا بائیں ہاتھ نیچے کو لٹک رہا ہے اور وہ سیاہ رنگ کے کپڑے پہنے ننگے سر کھڑی ہے۔ اس کا خوفناک چہرہ ہمیں صاف نظر آ رہا تھا بڑے بڑے دانت آگے

کو نکلے ہوئے تھے پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ عورت ہنس رہی ہے۔ مگر جب ذرا غور سے دیکھا تو دانت بے شک باہر نکلے ہوئے تھے مگر وہ سادہ تھے۔ یہ جان کر مجھے ہلکی سی آگئی۔

اور پھر فیض عالم آگے بڑھے اور اس کے پاس جا پہنچے اور اس کو سمجھوڑنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی وہ اس کو نورینکم بنو رنگم پکارنے لگے۔ اب تو انہوں نے رونا بھی شروع کر دیا۔ ہم سب بھی آزار اوروں سے کھڑے اپنی اپنی جگہ افسوس کر رہے تھے فیض عالم نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ جو نوکری اس کے بازو سے لٹک رہی تھی اسے اتار کر دور پھینک دیا اور کہنے لگا۔ ”تم نے اس کی وجہ سے جان دے دی۔ اگر تو ساگ نہ کھاتی تو کون سا فرق پڑ جاتا۔“

اس کی حالت دیکھ کر ہم لوگوں کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی اور آنسو تو رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ خیر تھوڑی دیر تک ہم اسی حالت میں رہے۔ پھر میرا لڑکا نعیم بولا ”چچا فیض عالم۔ اب صبر کرو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ تقدیر نے چچی کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ اب رونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں گاؤں چلنا چاہیے۔ اجالا بھی ہونے والا ہے۔“ ہم نے دو آنسوؤں کو گاؤں کی طرف روانہ کیا کہ وہ ایک چار پائی اٹھالائیں تاکہ میت کو گاؤں لے چلیں۔ اب میں ذرا میت کے اوپر قریب ہو گیا تو دیکھا کہ اس کے دائیں کندھے سے فیض کا ایک حصہ پھٹ کر پیٹ کی طرف لٹک رہا تھا جس سے اس کی دائیں چھاتی کا ایک حصہ بالکل برہنہ ہو گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھتے ہوئے شرم محسوس ہوئی تو میں وہاں سے ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب لوگ چار پائی لے آئے تو فیض عالم نے لائین مجھے پکڑا دی اور خود اپنی مرہ بیوی کو اٹھا کر چار پائی پر ڈال دیا جب وہ میت اٹھا رہا تھا تو میری نظر پھر اس کے عریاں حصے کی طرف اٹھ گئی۔ اب مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا کہ اس کی چھاتی پر ہلکے ہلکے زخموں کے نشان برابر لکیروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ یہ ضرور کسی بھیاک جانور یا کسی بلا کی حرکت تھی۔ مگر جو بات حیرت انگیز تھی وہ یہ کہ زخموں میں سے خون بہتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس سے مجھے یقین ہوا کہ اس بدنصیب عورت کو کب سے ہوئے بہت دیر ہو گئی اور یہ جو ختم مجھے نظر آیا ہے۔ یہ تو شاید ابھی تھوڑی دیر قبل کا تھا۔

میرا دم اغز مزید اٹھ گیا کہ آخر چچی نورینکم کی موت کس طرح واقعہ ہوئی ہے۔ کوئی درندہ اگر ان کو مارنا تو یہ ہمیں اس حالت اور اس انداز میں نہ ملتیں۔ اگر انہوں نے خودکشی کی ہے تو پھر یہ یہاں کھڑی کس طرح ہو گئی؟ اب مجھے وہ نوکری یاد آ گئی جو اس کے بازو کے ساتھ لٹک رہی تھی اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ نوکری تو ادھر ہی رہ گئی ہے۔ میں ان ہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ میت کس نے اٹھائی ہے اور ہم کب وہاں سے روانہ ہوئے۔

اب کافی روشنی پھیل گئی تھی اور جو دروازہ دی ہم نے چار پائی لینے کے لئے گاؤں روانہ کئے تھے۔ شاید انہوں نے گاؤں میں یہ خبر کر دی تھی۔ اس لئے گاؤں کے اور بھی کئی آدمی ہم لوگوں میں شامل ہو گئے تھے اور وہ لوگ فیض عالم سے اظہار افسوس بھی کر رہے تھے۔ اب میت کے ساتھ اچھا خاصا قافلہ بن گیا تھا۔ مجھے اب پھر نوکری کا خیال آیا اور میں ان لوگوں سے الگ ہو کر واپس پلٹ آیا۔ ان لوگوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی لیکن میرے کزن نعیم کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ بھی رک گیا اور جب وہ سب لوگ آگے بڑھ گئے تو وہ میرے قریب آیا اور کہنے لگا۔

”اب واپس کیوں جا رہے ہو کیا تمہاری کوئی چیز وہاں رہ گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں وہ نوکری دیکھنے جا رہا ہوں کہ آخر اس میں کون سی چیز تھی۔“

وہ بولا۔ ”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں وہ نوکری جھاڑی میں بچھنی ہوئی ملی۔ مگر وہ تو خالی تھی۔ ہم نے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ تو ہمیں ہرے ہرے پتوں کی ایک چھوٹی سی گلدی مل گئی۔ یہ یقیناً اس نوکری میں تھی۔ مگر وہ ساگ نہیں تھا۔ بلکہ ایسے ہی جنگلی پتے تھے۔ پسے لگ رہا تھا کہ کسی نے جلدی سے پتے نوج کر نوکری میں رکھ دیئے ہوں۔ نعیم نے سختی

خیر نظر میں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

”بھائی اللہ رحم کرے۔ معاملہ گڑبگلتا ہے۔ ان پتوں کا نوکری میں کیا کام تھا۔“ وہ کہنے لگا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ چچی نوکری آدمی نے مارا ہے۔ یہ سب کچھ یہاں ہی رہنے دو اور جلدی واپس چلو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہم لوگوں پر کسی قسم کا شک کرے۔ اب ہم جلد از جلد ان لوگوں کے پاس پہنچنا چاہتے تھے۔ راستے میں ہم لوگوں نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ لوگ میت کو فیض عالم کے گھر لے گئے اور میں اپنے گھر جا کر فوراً ہی سو گیا کیونکہ پوری رات کا جاگا ہوا تھا۔ دوپہر کو میری آنکھ کھلی تو میں وہاں گیا جہاں قبر کھودی جا رہی تھی قبر تیار تھی۔ مگر فیض عالم کے گھر ایک طوفان برپا تھا۔..... فیض عالم کے بڑے بھائی سرور خان کی بیوی نہیں چاہتی تھی کہ میت آج ہی دفن کی جائے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ جب تک نورینکم کے ماں باپ یا بھائی وغیرہ نہ آئیں اسے دفن نہ کیا جائے کیونکہ وہ دونوں آپس میں رشتہ دار تھے اس لئے بھی اس کا موقف صحیح تھا۔

مگر فیض عالم غصے میں لال بھسوکا ہو رہے تھے اور لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ ”میری بیوی مر گئی۔ میرا گھر برباد ہو گیا۔ مگر میری بھابھی کو میرا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ نہ معلوم یہ کل کس وقت فوت ہوئی ہوگی۔ اسے اگر آج دفن نہ کیا گیا تو کل تک اس کی لاش خراب ہو جائے گی۔ سرور خان بھی اپنی بیوی پر زور دے رہا تھا کہ میت دفن کرنے دو۔ اس کے رشتہ دار اب اگر آئے بھی تو فاتحہ ہی پڑھیں گے اور اگر بعد میں آئے تو تب بھی دعا کر کے چلے جائیں گے۔ ان کے آنے سے یہ دوبارہ زندہ تو نہیں ہو جائے گی۔“

مگر سرور کی بیوی ان کی بات ماننے پر بھی تیار نہ تھی۔ اس نے صبح ہی اپنے بڑے لڑکے کو نورینکم کے والدین کے گاؤں خبر دینے روانہ کر دیا تھا۔ جو ہمارے گاؤں سے تیس میل دور تھا اور اب اس کا خیال تھا کہ وہ آنے والے ہی ہوں گے۔ اب چونکہ قبر تیار تھی۔ اس لئے لوگ فارغ ہو کر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسے میں نماز کا وقت ہو گیا اذان ہوئی تو سب لوگ نماز

پڑھنے چلے گئے جوں ہی لوگ نماز سے فارغ ہوئے نورینکم کے والد۔ والدہ اور دونوں بھائی پہنچ گئے۔ دس منٹ تک وہ لوگ میت کے پاس ٹھہرے ہوں گے کہ نورینکم کی والدہ جو برابر بروئے جاری تھی اس نے نورینکم پر سے بے اختیار رو کر کپڑا اٹھایا تو فوراً ہی اپنے سینے پر دو ہاتھ مارنے ہوئے اپنے خاندان کو دور سے آواز دہی وہ قریب ہی کھڑا تھا چونکہ میت کے پاس عورتیں بہت تھیں۔ اس لئے وہ ذرا دور ہٹ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ بیوی کی غیر معمولی آوازیں کر رہے فوراً قریب آ گیا۔ بیوی نے کہا کہ ذرا یہ دیکھو ہماری بیٹی مری ہیں اسے مارا گیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے کے دروازے کی طرف مڑی۔ وہ بالکل بوڑھی تھی مگر اس وقت نہ معلوم اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ جیسے ہی دروازے میں اسے سرور خان نظر آیا تو اسے دوڑ کر اسے اس طرح پکڑا جیسے وہ لے گئی اور بولی۔ ”..... دیکھ خالما انسان! تم لوگوں نے اس غریب پر کتنا ظلم کیا ہے اور اوپر سے کہتے ہو کہ جنگل میں راستہ بھول گئی تھی سرور سے اس کی موت واقع ہو گئی ہے ایک بچہ بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ اس مظلوم کو قتل کیا کیا ہے۔“ سرور خان کے پیچھے فیض عالم بھی اندر آ رہے تھے مگر وہاں کی حالت دیکھ کر واپس پلٹ گئے۔ نورینکم کا باج خاموش کھڑا تھا۔ جب اس کی بیوی ذرا خاموش ہوئی تو اسے بولنے کا موقع ملا اور اس نے سرور خان کو مخاطب کر کے کہا کہ.....

”سرور خان! میں یہ معاملہ تمہارے اور عدالت میں لے کر جاؤں گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہم چپ ہو جائیں۔ میری لڑکی نے آخر کون سا ایسا جرم کیا تھا کہ اسے جان سے مار دیا گیا۔ برسوں ہی تو میں اور میرے بیٹے یہاں آئے تھے اور وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اس نے کھانا پکایا تھا اور ہم لوگ کھانا کھا کر گئے تھے۔ اس وقت وہ بالکل خوش باش تھی۔ اور آج میں اس کی لاش کے سرہانے کھڑا ہوں۔“ سرور خان نے بات بگڑتے دیکھی تو فیض عالم کو بلانے باہر چلا گیا مگر تھوڑی دیر بعد پریشان سا ہو کر

واپس آ گیا۔ اور بتایا کہ فیض عالم لاپتہ ہو گیا ہے سرور خان نے بہت کوشش کی نورینکم کا باپ کی طرح راضی ہو جائے اور معاملہ ہمیں ٹھنڈا ہو جائے مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا آخر نورینکم کا باپ اور بھائی تھانے میں رپورٹ کرنے چلے گئے۔ گاؤں کا نمبر دار پہلے تو حالات سے بے خبر تھا۔ مگر جب اسے معلوم ہوا کہ نورینکم کو قتل کیا گیا ہے تو اس نے لوگوں سے کہا کہ آپ سب اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔ کیونکہ رپورٹ درج کرانے کے لئے لوگ گئے ہوئے ہیں اس لئے پولیس کے آنے تک لاش دفن نہیں کی جائے گی۔ نمبر دار نے سب لوگوں کو کمرے سے نکال دیا حتیٰ کہ نورینکم کی بوڑھی ماں کو بھی زبردستی دوسرے گھر میں پہنچا دیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ صرف دو آدمی رات کو لاش کا پہرہ دیں گے۔ مگر اسے ایسے دو آدمی نہیں مل رہے تھے۔ اس نے کئی آدمیوں سے کہا مگر کوئی بھی اس کام پر تیار نہ ہوا۔ تو اس نے مجھے اور نعیم کو دیکھ کر کہا کہ ”تم دونوں رات کو یہیں رہو گے۔“

میں نے پہلے تو انکار کیا۔ مگر نمبر دار کا لحاظ آڈے آ گیا اس لئے میں اور نعیم مجبوراً رات کو گھر گئے ہم دونوں ہی کم عمر تھے مگر خدا کا نام لے کر ہمت باندھی۔۔۔۔۔ شام کو موسمی خراب ہو گیا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور بارش کے آثار بھی تھے۔ اس لئے سب لوگ جلد ہی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور ہم دونوں ہی اس کمرے میں رہ گئے۔ نعیم نے وضو کیا اور قرآن مجید پڑھنے لگا۔ دوپارے پڑھنے کے بعد اس نے قرآن پاک بند کر کے رکھ دیا۔

باہر بارش شروع ہو گئی تھی اور مکان کے اوپر سے تڑتڑ کی آواز آرہی تھی۔ میت کے سر ہانے کی طرف ایک کھڑکی تھی جو ٹھیک طرح سے بند نہیں ہوئی تھی۔ جب آسمان پر بجلی چمکتی تو اس کھڑکی کے راستے روشنی اندر آتی تھی اور ایک سیکنڈ کے لئے سارا کمرہ منور کر جاتی۔ مگر اس کے بعد پھر اندھیرا چھا جاتا۔ لائین کی روشنی اتنی زیادہ نہ تھی۔ اس سے سارہ کمرہ روشن نہ ہوا تھا۔ اس کی روشنی بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی اور ہم دونوں کو نیند بھی آرہی تھی۔ مگر ڈر کے مارے سو بھی نہیں سکتے تھے اور پھر لائین کی

روشنی اتنی کم ہو گئی کہ صرف دوفٹ کے فاصلے تک روشنی رہ گئی۔ نعیم نے اٹھ کر بتی ذرا اونچی کر دی۔ جب وہ بتی اونچی کر کے ہٹا تو روشنی میں صرف میری نظر اس چارپائی پر پڑی جس پر میت رکھی تھی۔

خدا کی پناہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ نورینکم زندہ ہو گئی ہے اور اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ اس کے دانت اسی طرح ایک ایک انچ باہر نکلتے ہوئے تھے اور اس کا منہ بڑے ہی بھیا تک انداز میں کھلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور دونوں ہاتھ آگے کو لمبے ہوئے تھے پھر میں نے دیکھا اس کی ٹانگیں لمبی ہو رہی ہیں اور پھر وہ چارپائی سے نیچے اتر کر ایک دم سیڑھی کھڑی ہو گئی۔ مجھے بالکل ایسے لگا کہ وہ میری طرف آرہی ہے۔

میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ نعیم میرے قریب ہی تھا اس نے ایک کتاب میری طرف بڑھا دی شاید بیچ سورۃ تھی یا سپارہ اور اس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ بہت مضبوطی سے پکڑ لئے میرے منہ سے دہی آواز بالکل نہیں نکل رہی تھی۔ نورینکم بازندہ لاش جو بھی سمجھیں۔ وہ اندھوں کی طرح چل رہی تھی۔ مگر اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ پھر میرے کانوں میں نعیم کی سرگوشی سنائی دی۔۔۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا ”ندیم! لگتا ہے لاش بگڑ گئی ہے۔ یہ ہماری غفلت کا نتیجہ ہے۔ مگر خدا کے لئے ہمت نہ ہارنا۔ آؤ اسے روکیں۔ اگر یہ باہر نکل گئی تو نہ معلوم کیا ہوگا۔“ اس نے مجھے کہا کہ کلمہ شریف پڑھتے رہو۔ بلند آواز وہ بھی آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔ مگر میں کلمہ ہی پڑھ رہا تھا۔ پہلے تو میری آواز نہ نکل سکی۔ اور میں دل ہی دل میں کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا مگر بار بار پڑھنے سے میری آواز بلند ہوتی گئی۔ نعیم مجھے کھینچ کر دروازے کے پاس لے گیا اور ہم زندہ لاش سے پہلے ہی دروازے میں پہنچ کر اس کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کلمہ شریف اور آیت الکرسی پڑھ رہے تھے اور لاش اب ایک جگہ ساکت ہو گئی تھی۔

وہ وقت آج بھی مجھے یاد آتا ہے تو میرے پاؤں کے تلووں میں سے پسینہ جاری ہو جاتا ہے۔ پھر لاش اٹے

پاؤں واپس جانے لگی۔ وہ مڑے بغیر ہی اسی چارپائی پر جا کر پہلے کی طرح دروازہ ہو گئی۔ مگر ہم دونوں وہاں ہی ٹھہرے آیات پڑھتے رہے۔

جب صبح ہوئی تو سب سے پہلے مسجد کے مولوی صاحب اندر آئے ان کے آنے پر بھی ہم لوگ برابر کلام الہی پڑھتے رہے۔ پھر مولوی صاحب نے نعیم کے ہاتھ سے قرآن مجید لے کر رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ نعیم وہاں پر ہی ایک دم خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے میرے ہاتھ سے بیچ سورہ لے لیا تو مجھے ایسے محسوس ہوا کہ ایک دم اندھیرا چھا گیا ہے۔ پھر مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوا؟

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب میرے سر ہانے بیٹھے بیٹھ بڑھ رہے تھے مگر ان کی آواز کے علاوہ مجھے کچھ اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بالکل خاموشی تھی میری نظر اپنے والد پر پڑی وہ نہایت ہی غم زدہ نظر آئے۔ قریب ہی نعیم کا چھوٹا بھائی نظر آیا اچانک مجھے اس کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو۔ ندیم بھائی نے آنکھیں کھولی ہیں۔“ پھر مولوی صاحب کی تسبیح ایک دم رک گئی اور وہ بولے۔ ”اے پروردگار! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آنکھ تو کھولی۔“ میرے والدین بھی خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

مولوی صاحب نے کہا۔ ”آپ اس کو آرام کرنے دو خدا نے چاہا تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ پھر مولوی صاحب چلے گئے۔

اگلے دن میری طبیعت ٹھیک ہو گئی تو سب سے پہلے میں نے نعیم کا حال پوچھا۔ والد صاحب نے بتایا کہ وہ ہوش میں آئے ہیں۔ ہوش رہا اور دوسرے دن جب سورج کی پہلی کرن گھر میں داخل ہوئی تو اس کی روح اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ یہ سن کر میرے دل کو ایک دھچکا سالگا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

والد صاحب کہہ رہے تھے ”تمہارے بچنے کی بھی امید نہ تھی تم کو پانچویں دن کے بعد ہوش آیا ہے۔“

پھر میں نے اباجان سے پوچھا۔ ”کیا پولیس آئی تھی؟ اور ان لوگوں کا کیا فیصلہ ہوا؟“ اباجان نے بتایا۔ ”ہاں پولیس آ گئی تھی۔ اور فیض عالم کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ فیض عالم نے اقبال جرم کر لیا ہے کہ اس نے خود ہی نورینکم کو لاشیوں سے مارا تھا۔ وہ اسے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا مگر وہ مری گئی تو اس نے لاش جنگل میں لے جا کر چھوڑ دی جہاں سے تم لوگ اس کو لے کر آئے تھے۔“

”مگر فیض عالم نے اس کو مارا کیوں تھا؟“ میں نے اباجان سے پوچھا۔ تو وہ کہنے لگے۔۔۔۔۔ ”بات معمولی تھی۔ مگر وہ بے چاری جان سے چلی گئی۔ دودن پہلے اس کا باپ اور بھائی اس سے ملنے آئے تھے۔ فیض عالم تو گھر میں نہ تھا۔ نورینکم نے ان کے لئے کھانا بنایا اور وہ کھانا کھانے کے فوراً بعد ہی چلے گئے تھے۔ فیض عالم نے کہیں دور سے اپنے گھر سے تور کا دھواں نکلتے دیکھا تو گھر آ کر اس نے نورینکم سے پوچھا۔ ”تم نے دن میں کھانا پکا تھا۔“

نورینکم نے بتایا۔ ”وہ میرے ابو اور بھائی آئے تھے۔ میں نے ان کے لئے کھانا پکا تھا۔“ فیض عالم بولا۔ ”مجھے وہی کھانا دو۔“ نورینکم بولی۔۔۔۔۔ ”کہ وہ کھانا تو ختم ہو گیا ہے، میں تمہیں تازہ کھانا بنا دیتی ہوں۔“

مگر فیض عالم نے مانا کہنے لگا۔ ”نہیں مجھے وہی کھانا دو۔ میں وہی کھاؤں گا۔“

بس اسی بات پر ان میں جھگڑا ہو گیا اور فیض عالم نے نورینکم کو مارنا شروع کر دیا نورینکم کو کسی ایسی جگہ چوٹ لگ گئی کہ وہ مر گئی۔“

فیض عالم کا مقدمہ ایک سال تک چلتا رہا۔ اس کے بعد اسے سات سال کی قید پامشتت کی سزا ہوئی۔ مگر تین سال ہی گزرے تھے کہ وہ جیل ہی میں مر گیا تھا۔



پہاڑی کے جن

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

بزرگ نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو سامنے میدان میں دھواں ہی دھواں پھیل گیا اور پھر جب دھواں چھٹا تو اس جگہ عجیب و غریب شکل کی وحشت ناک مخلوق کھڑی تھیں جن کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور پھر.....

لفظ لفظ سطر سطر دماغ کو ماؤف کرتی اور لرز ابر اندام کرتی انوکھی اور حقیقی کہانی



لیڈی ڈاکٹر کے چہرے پر سنجیدگی اور پیشانی غرق آلود تھی۔ ”ڈاکٹر خیریت تو ہے۔“ ارجن نے گھمبیر آواز میں پوچھا۔

”سک..... کچھ نہیں۔“ لیڈی ڈاکٹر گڑبڑا گئی۔ ”آپ کی جتنی اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں ہمیں ذرا جلدی ہے۔“ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کوریڈور سے باہر چلی گئیں۔

اگر جن ٹھنک گیا، ضرور کوئی خاص بات ہے ورنہ ڈاکٹر نے اس طرح ایک دم رخصت نہ ہوتی انعام تو اپنی جگہ پر لیڈی ڈاکٹر اور دانی نے جاتے ہوئے اس سے اپنی فیس بھی نہیں لی تھی۔ ارجن الجھن میں مبتلا ہو گیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے ڈبل بیڈ پر رادھا لیٹی ہوئی تھی۔ بیڈ کے قریب رکھے مینی اور خوبصورت جھولے میں ایک نومولود خوبصورت بچہ لیٹا تھا۔ وہ چند لمبے ناقدانہ نگاہوں سے بچے کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر بچے کے جسم سے لپٹا ہوا تولیہ پیسے ہی کھولا تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ غصے سے بھنایا ہوا رادھا کی طرف بڑھا۔ اس کا دایاں بازو حرکت میں آیا اور ایک زوردار تھپڑ رادھا کے چہرے پر

بمبئی میں واقع ایک شاندار کوشی کے اندر ایک کمرے کے بند دروازے کے باہر کھڑا ارجن مصطرب نظر آ رہا تھا۔ کمرے کے اندر اس کی بیوی رادھا، ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک ماہر دانی کے ہمراہ موجود تھی۔ ارجن اس وقت اپنی ہونے والی اولاد کے بارے میں سوچتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ بے پناہ دولت اور اثر و رسوخ کے مالک ارجن کی شادی کو پانچ سال بیت چکے تھے۔ وہ ہنوز اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ اب جا کر اس کی مراد پوری ہو رہی تھی۔

ارجن بذات خود کوئی اچھا انسان نہیں تھا وہ وسیع پیمانے پر منشیات اور غیر قانونی اسلحہ کا کاروبار کرتا تھا۔ شہر میں اس کے کئی جوئے کے اڈے تھے۔ بمبئی میں ایک بڑی فیکٹری اور کئی اناج کے گودام اس کی ملکیت تھے۔ غریب اس کی نظر میں کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر تھے۔ کسی انسان کو اس کی زندگی سے محروم کرنا اس کے پائیں ہاتھ کا کام تھا۔ ارجن کڑھم کا انتہا پسند ہندو تھا۔

اچانک ارجن کے کانوں سے بچے کے رونے کی آواز گونجی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور جوان سالہ لیڈی ڈاکٹر اور ادھیڑ عمر دانی کمرے سے باہر نکلیں۔

پڑا۔ ”یہ تو نے بہت بڑا اپرا دھ کیا ہے، نہ جانے کس جنم میں تو نے کیسے پاپ کئے ہیں۔ جن کے کارن آج تو نے اس بھجورے کو جنم دیا ہے، دل بھر کر آخری بار اسے دیکھ لے۔“

ارجن کی زبان زہرا لگنے لگی پھر وہ کمرے میں رکنا نہیں دندا تا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور کوڑی دور میں چلتا ہوا ایک دوسرے کمرے کے دروازے پر جا پہنچا۔

اس کمرے کے دروازے کے باہر ایک لمبا رنگا سانولے چہرے اور گھٹی موچھوں والا قوی ہیکل شخص کندھے پر رائفل لٹکائے کھڑا تھا۔ ”مہندر ایک گھنٹے کے اندر اندر پاپوں کی اس گھڑی کو مار کر علاقے سے دور پھینک آؤ تا کہ کوئی نہ جان سے کہ یہ ہماری اولاد ہے۔“

مہندر کو حکم دے کر وہ کمرے میں داخل ہو گیا کمرے میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک طرف ریک میں رکھی شراب کی بوتلوں کی طرف بڑھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک وہ شراب سے اپنا غم غلط کرتا رہا اس دوران کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ”اندر آ جاؤ۔“ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ مہندر کمرے میں داخل ہوا۔ ”کام ہو گیا ہے باس۔“ مہندر سر جھٹکا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔“ مہندر سر جھٹکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دوبارہ شراب نوشی میں مشغول ہو گیا۔

کچھ دیر بعد نشے میں ڈولتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ اب اس کا رخ رادھا کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ چلتا ہوا رادھا کے کمرے میں داخل ہوا۔ رادھا بیڈ پر لیٹی رو رہی تھی۔ ”آخری بار! رو لے تیرے سوگ میں جانے کا سہ ہو گیا ہے۔“ ارجن کی بات سن کر رادھا خوف زدہ ہو گئی، اس کا پورا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح کا پھینے لگا۔ ارجن نے دونوں ہاتھوں سے رادھا کی گردن دبوچی۔ رادھا نے مزاحمت کی مگر وہ ارجن کی طاقت کے سامنے بے بس ہو گئی اس کی مزاحمت دم توڑتی جا رہی تھی، کچھ دیر بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

اس جگہ سے دور ایک سنان سڑک کے کنارے کھنی جھاڑیوں میں ایک نوزائیدہ معصوم بچہ چلق پھاڑ کر ہلک ہلک کر رو رہا تھا۔ وہ شاید اوپر والے مالک سے فریاد کر رہا تھا کہ اس ظالم دنیا میں اسے کس لئے بھیجا گیا ہے۔ جہاں ارجن جیسے دوندے بستے ہیں بچہ اپنی پوری رفتار سے رو رہا تھا۔

اچانک ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی جھاڑیوں میں لپٹل سی بچی اور ایک خوشخوار کتا جھاڑیوں میں جا گھسا۔ اب وہ غراتا ہوا روتے ہوئے بچے کی طرف بڑھ رہا تھا بچے کے رونے میں تیزی آچکی تھی شاید اسے بھوک لگی تھی وہ معصوم اس سفاک حقیقت سے بے خبر تھا کہ ماں جیسی انمول ہستی ایک شیطان نے اس سے چھین لی ہے۔ ادھر کتا بھی شاید کئی وقتوں سے بھوکا تھا۔

بچے کی صورت میں اسے اپنی خوراک نظر آنے لگی۔ کتے نے بچے کے قریب آ کر غراتے ہوئے اس کی دائیں ٹانگ میں اپنے دانت کھسیر دیئے۔ روتا ہوا بچہ اب موت کے منہ میں تھا۔ ٹانگ کتے کے منہ میں ہونے کی وجہ سے بچے کو سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ درد کی شدت سے اس کے رونے کی رفتار میں شدت آتی جا رہی تھی۔ کتا بچے کو کھینچنے ہوئے ایک طرف لے جانے لگا۔

اسی وقت اس سڑک سے گزرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار غفار کی موٹر سائیکل کا پچھلا ٹائر پتھر ہو گیا۔ وہ موٹر سائیکل سے اترا اور اچانک اسے بچے کے چپخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ آوازیں قریبی جھاڑیوں سے آرہی تھیں۔ غفار دوڑتا ہوا جھاڑیوں میں جا گھسا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے خوفناک منظر تھا۔ ایک گرائڈل کتا بچے کی دائیں ٹانگ اپنے منہ میں دبوچے گھسٹا ہوا ایک طرف لئے جا رہا تھا۔ غفار نے زمین سے چند پتھر اٹھائے اور کتے پر برسائے شروع کر دیئے کتا پتھر لگتے ہی بچے کو چھوڑ کر ایک طرف بھاگ گیا۔

غفار نے روتے ہوئے نومو لو دے بچے کو زمین سے اٹھالیا۔ بچے کی دائیں ٹانگ پر کتے کے دانتوں کے نشان تھے جن سے خون نکل رہا تھا۔ اچانک غفار کی نظر زمین پر پڑے ایک ششخانی کارڈ پر پڑی اس نے ششخانی کارڈ اٹھا کر جب میں ڈالیا۔

نام تو اس کا راجہ ناصر تھا پر سب اسے راجہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کی زندگی کی کہانی عجیب تھی۔ وہ غفار کو جھاڑیوں سے ملا تھا۔ یہ جانے کے باوجود کہ بچے کا تعلق تیسری جنس سے ہے۔ غفار اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بیوی سائرہ نے پہلے روز تو اس پر اعتراض کیا کہ ”لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔“

غفار نے یہ کہہ کر سائرہ کا منہ بند کر دیا کہ ”یہ جو کوئی بھی ہے جیسا بھی ہے اسے اللہ نے پیدا کیا ہے میں اسے اولاد کی طرح پالوں گا۔“ وہ اس کے گھر اس کے دو سالہ بیٹے سلمان کے ساتھ پرورش پانے لگا۔ غفار کی ہدایت کے بعد سائرہ نے راجہ کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھا۔ ان کا گھر انہ خالص اسلامی ماحول کے عین مطابق تھا۔ غفار اس کی بیوی دونوں حافظ قرآن تھے۔

ذرا سا بڑا ہوتے ہی دونوں بچوں کو مدر سے میں داخل کروا دیا گیا۔ راجہ کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہے گھر پر تو سب اسے پیار سے پیش آتے باہر اس کا مذاق اڑایا جاتا۔

وہ بچپن سے ہی اپنے اس جرم کی سزا پانے لگا جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اس کی دوسری سزا کا آغاز اس وقت ہوا جب اس کی عمر آٹھ سال تھی اسے چاہئے والی اس کی ماں سائرہ بیگم دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئی۔ اس روز وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ سائرہ بیگم نے اسے جہنم تو نہیں دیا تھا لیکن اولاد دینی کی طرح اس کی پرورش کی تھی۔ دونوں بچوں کا ایڈمشن گورنمنٹ اسکول میں کروا دیا گیا۔ وہاں ہر کلاس میں پچاس ساٹھ بچے بھیر بکریوں کی طرح ٹھونے لگے تھے۔ ایک روز سلمان کی غلطی سے راجہ کا راز کھل گیا۔ اس نے اپنے ایک

کلاس فیلو کو بتا دیا کہ راجہ کا تعلق تیسری جنس سے ہے۔ اس طرح یہ بات پورے اسکول میں پھیل گئی۔ اسکول کے بچوں نے راجہ کا جینا حرام کر دیا۔

غفار کا کہنا تھا کہ پڑھ لکھ کر انسان بڑا آدمی بنتا ہے۔ راجہ نے صرف گیارہ سال کی عمر میں سیکھا لیا کہ ”اس معاشرے میں پڑھ لکھ کر نہ تو کوئی بڑا آدمی بنا ہے اور نہ ہی بنے گا، یہاں بڑا وہی ہے جو طاقتور ہے۔ سمندر میں بڑی چھلی چھوٹی چھلی کو کھا جاتی ہے۔ زمین پر کمزور انسان دوسرے طاقتور انسان کی ٹھوکروں میں ہوتا ہے۔ موجودہ دور کی سب سے بڑی طاقت پیسہ ہے۔“

ایک روز بڑی عمر کے ایک لڑکے نے اس کا مذاق اڑایا تو وہ غصے میں اس لڑکے سے لڑ پڑا جواباً اس لڑکے نے راجہ کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کر دی۔ وہ روتا ہوا گھر گیا تو غفار نے بھی اس کی مرمت کر ڈالی کہ وہ اسکول پڑھنے جاتا ہے یا لڑنے؟

وہ گھر سے بھاگ نکلا اور ایک سڑک کنارے بیٹھ کر رونے لگا۔ اسی کا ہم عمر ایک گیارہ سالہ لڑکا گریبان کے بٹن کھلے سرکیت کے کش لگاتا ہوا اس کے برابر آ بیٹھا۔ ”کون ہے رے اس وقت یہاں بیٹھا کیوں رو رہا ہے۔؟“ اس نے سرکیت کا دھواں راجہ کے منہ پر چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”اماں، اللہ میاں کے پاس ہے، ابانے مارا ہے۔ سب لڑکے مجھے مارتے ہیں، میرا مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ میں بھجورا ہوں لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے، مجھے تو اوپر والے نے پیدا کیا ہے۔“

راجہ کی باتیں سن کر وہ لڑکا دنگ رہ گیا۔ ”سن میرا نام رمیش ہے، آج سے میری تیری دوستی پکی، کل تو مجھے اسی جگہ ملنا، میں تجھے اپنے استاد شکر سے ملواؤں گا۔“

دوسرے روز راجہ اسکول سے بھاگ کر رمیش سے ملنے چلا گیا۔ جس نے اسے اپنے استاد شکر سے ملوایا۔ 30 سالہ شکر شکل و صورت سے ہی بدمعاش نظر آتا تھا۔ راجہ کے شب و روز شکر اور رمیش کے ساتھ

گزرنے لگے۔ شکر کے کہنے پر وہ سڑک پر گھومنے والے آوارہ لڑکوں سے لڑتا۔ ان سے مارکھاتا اور انہیں مارتا۔ اس نے جیب تراشی سیکھ لی۔ ذرا بڑا ہوا تو ریش کے ساتھ مل کر عورتوں سے پرس جھینے لگا۔ 18 سال کا ہونے تک وہ ہر قسم کا اسلحہ چلانے میں ماہر ہو چکا تھا۔ اب وہ اور ریش شکر کے گروہ کے دیگر افراد کے ساتھ مل کر لوگوں کو لوٹنے لگے۔ یہ چار افراد پر مشتمل گروہ تھا۔ انہیں سالہ شکر، چالیس سالہ اباے اٹھارہ سالہ ریش اور اٹھارہ سالہ راجہ پہلی بڑی واردات بمبئی کے ایک سپراسٹور میں راجہ نے ان کے ساتھ مل کر کی۔ اس کے بعد پیٹرول پمپ لوٹے، بینک ڈکیتی کی۔

ایک پسماندہ علاقے میں شکر کا قلیف تھا۔ جوان کا مشرکہ ٹھکانا تھا۔ ایک سال کے عرصے میں راجہ کے پاس لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔ جو اس نے شکر کے پاس رکھ چھوڑے تھے۔ عموماً دسمبر کے دھندے میں دسمبر کے لوگ ایک دور سے سے دھوکہ نہیں کرتے۔ اس دوران راجہ کا شانتی کارڈ بنوا دیا گیا۔ راجہ نے اکاؤنٹ کھلوا کر روپے بینک میں رکھوا دیئے۔ ایک روز ایک ڈکیتی کے دوران پولیس سے مقابلہ ہوا پولیس کی گولی سے شکر اور اباے ہلاک ہو گئے راجہ اور ریش فرار ہو گئے۔ اس کے بعد راجہ نے دسمبر کے کاموں سے توبہ کر لی کچھ عرصہ بعد غفار بستر مرگ پر جا پہنچا۔ اس روز راجہ اور سلمان دونوں گھر پر تھے جب غفار اکھڑی اکھڑی سانس لے رہا تھا۔

”راجہ بیٹا اب..... جب..... کہ میں دنیا..... سے جا رہا ہوں۔ ایک سچ تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔“ غفار کی آواز سے نقاہت عیاں تھی اسے بے تحاشہ پسینہ آ رہا تھا۔ ”مجھے تمہیں..... پہلے بتا..... دینا چاہئے..... تھا مگر میں اس معاملے..... کو نالتا..... رہا۔“ اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔

”آرام سے بات کریں زور سے بولنے کی کوشش مت کریں۔ آپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ راجہ نے، ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ اس کی

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی، یوں لگ رہا تھا جیسے غفار بولنے کے لئے ہمت جمع کر رہا ہو۔

کئی سال پہلے سڑک کے کنارے میری موٹر سائیکل پتھر ہو گئی تھی۔ مجھے جھاڑیوں سے ایک بچے کے رونے اور کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ میں جھاڑیوں میں جا گھسا کتا ایک نومولود بچے کو منہ میں دبائے گھینٹا ہوا ایک طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے بچے کو کتے سے بچایا، وہیں جھاڑیوں میں مجھے کسی ہندرنامی کسی شخص کا شناختی کارڈ بھی ملا۔ میں وہ شناختی کارڈ اور بچے کو اپنے گھر لے آیا..... وہ بچہ تم تھے..... شناختی کارڈ الماری کی دروازے میں خاکی رنگ کے لفافے میں رکھا ہے۔“ غفار نے روداد مکمل کی اس کے ساتھ ہی اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

وہ دونوں غفار سے لپٹ کر رونے لگے غفار کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ راجہ کی حالت ان دنوں کافی ابتر تھی۔ وہ ہر وقت روتارہتا تھا۔ ایک روز الماری سے خاکی لفافہ نکالا۔ بتائے بغیر گھر سے نکلا اور ادھر ادھر مارا مار پھرنے لگا اس طرح اسے بھٹکتے ہوئے کئی روز گزر گئے۔ کھانے کو اگر کوئی کچھ دیتا تو کھانا نہیں تو بھوکا رہتا۔

بھٹکتے بھٹکتے ایک روز ایک پہاڑی علاقے میں جا نکلا۔ شام کا وقت تھا سورج ڈوب چکا تھا۔ وہ گرنا پڑتا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی نظر پہاڑی کے وسط میں واقع ایک غار کے دہانے پر پڑی تو وہ غار کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ”مجھ جیسے بے مقصد وجود کو اللہ نے پیدا کیوں کیا؟“

اچانک اس کے سامنے ایک بڑا ساسنپ نمودار ہوا۔ ساسنپ پھن پھیلا کر اس کے سامنے کھرا ہو گیا۔ راجہ نے اسے مارنے کے لئے پتھر اٹھالیا۔ اچانک اسے ایک ایسا خوفناک منظر دکھائی دیا کہ اس کے رگ و پے میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

پتھر ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا ساسنپ نے ایک لمبے ترنگے خوف ناک آدمی کی شکل اختیار کر لی تھی۔

راجہ اس کے سامنے کھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ راجہ جو کہ پہلے ہی بھوک پیاس اور تشنگن سے ٹھہرا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہوش آیا تو ایک کشادہ غار میں چٹائی پر پڑا تھا۔ وہ ایک دم متشکر ہو کر اٹھ بیٹھا۔

راجہ سے کچھ فاصلے پر ایک نورانی چہرے والے بزرگ ہاتھوں میں شمع لئے بیٹھے تھے۔ ”راجہ بیٹا! اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ اللہ نے کسی کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ تمہاری زندگی کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہے، جو وقت آنے پر تمہارے سامنے آ جائے گا۔“ بزرگ کا دھیمہ لہجہ اس کی سماعت میں رس گھول رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بزرگ کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ وہ یہ جان کر بھی حیرت و استعجاب کے عالم میں تھا جو باتیں اس نے بے ہوش ہونے سے پیش تر غار سے باہر سوچی تھیں، ان سوچوں تک بابا کی رسائی کیوں کر ہوئی۔

”بابا میں بہت بد نصیب ہوں۔“ راجہ نے اشک بہاتے ہوئے اپنی روداد بیان کر دی۔

”انسان کی زندگی میں کچھ دکھ آتے جاتے ہیں۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا اپنا وصف بنالو اور ساتھ میں اس کی عبادت کرو، اللہ تمہیں بہترین صلہ دے گا، اللہ نے تمہیں ایک نقص کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو تمہیں انعام بھی کتنا بڑا ملا ہے۔ تم ایک مسلمان گھرانے میں پرورش پاتے رہے۔ الحمد للہ تم مسلمان ہو۔ اپنے اعمال اچھے رکھو! انشاء اللہ آخرت میں اس کا تمہیں بہتر اجر ملے گا۔“

راجہ بڑی توجہ اور انہماک سے بزرگ کی باتیں سن رہا تھا۔ ”بابا جی آپ کون ہیں اور غار سے باہر جو لمبا چوڑا خوفناک شخص مجھے ملا وہ کون تھا۔“ راجہ نے بابا سے استفسار کیا۔

”بیٹا میں اللہ کا ایک معمولی سا بندہ ہوں۔“

اور باہر جسے نے تم دیکھا وہ ایک مسلمان جن تھا۔ جو اس پہاڑی علاقے کا گمراہ ہے۔ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان جن موجود ہیں جو مجھ سے تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اور بہت سے کاموں میں میری مدد بھی کرتے ہیں۔“

”بابا جی آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ دیں میں یہاں سے مرتے دم تک ہلوں گا بھی نہیں۔“ راجہ نے کہا اور بابا نے آنکھیں بند کر لیں پھر چند لمحوں بعد بولے۔ ”اللہ کی مرضی یونہی ہے تو یونہی سہی۔ تم زیادہ عرصہ یہاں رہ نہ سکو گے۔“

پھر راجہ کے شب و روز بابا کے آستانے پر گزرنے لگے وہ عبادت گزار ہو گیا ہر وقت بابا کے ساتھ عبادت میں مشغول رہتا۔ اس دوران اس نے بہت سے حیرت انگیز مناظر دیکھے۔ سینکڑوں جن بابا کے قبضے میں تھے بابا روحوں کو بھی حاضر کرنے کا علم جانتے تھے۔ بابا کا نام عبداللہ تھا پر لوگ انہیں بابا جی کہہ کر پکارتے تھے۔ صبح ہوتے ہی دور دراز سے سینکڑوں لوگ اپنی مرادیں پانے ان کے آستانے پر آتے۔ یہاں آنے والے ہر مذہب کے لوگ تھے بابا جی سب کے کام آتے تھے۔

ایک روز ایک ادیب عمر حفص دور افراد کے ہمراہ ایک آٹھ سالہ لڑکی کو اٹھائے غار میں داخل ہوا اس شخص کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بابا کے اشارے پر انہوں نے بچی کو چٹائی پر لٹا دیا بچی کے ہاتھ پاؤں عجب سے انداز میں مڑے ہوئے تھے۔ ”بابا جی اسے کافی عرصہ تک بخار رہا ہے علاج کروا رہا بخار تو ختم ہو گیا، پر اس کے ہاتھ پیر ٹیڑھے ہو گئے ہیں اب یہ چلنے پھرنے سے قاصر ہے۔ جگہ جگہ اسے علاج کے لئے لے گئے۔ مگر ڈاکٹروں نے اسے لا علاج قرار دے دیا ہے۔“ ادیب عمر حفص روتے ہوئے بولا۔

بابا جی نے بچی کے جسم پر کچھ پڑھ کر پھونکا، دوسرا لمحہ حیران کر دینے والا تھا۔ بچی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی، اس کے ہاتھ پاؤں درست ہو چکے

تھے۔ اس واقعہ کے کچھ روز بعد سہ پہر کے وقت درمیانی عمر کا ایک شخص آیا۔ اس نے پورے جسم پر بڑی سی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں غرض کہ ہاتھوں کے علاوہ جسم کا ہر حصہ چادر میں ڈھکا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں ظاہر تھیں اس کی بے تاثر آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی اس کے جسم سے اس طرح بو آ رہی تھی جیسے مری ہوئی پھلیوں سے بو آتی ہے۔ وہ بابا سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ”باباجی مجھے اس مصیبت سے مجھے نجات دلائیں، میں بہت تنگ آ چکا ہوں۔“ اس شخص کے لہجے میں لاچارگی تھی۔ اس نے اپنے جسم سے چادر اتار دی۔

راجہ بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس شخص کے ہاتھ پیر غرض کہ پورے جسم پر کوڑھ کا مرض پھیل چکا تھا۔ اس کی حالت بہت زیادہ ابتر تھی۔ اس کے جسم سے بدبو یقیناً ان زخموں سے آرہی تھی۔ ”بابا میرے پورے جسم کا یہ حال ہے مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی مجھے سزا ملی ہے۔ اب آپ میرے لئے دعا کریں۔“ اس نے امید بھری نظروں سے باباجی کو دیکھا۔

”بابا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔“ جھوٹ بولتے ہوئے، یہ چھوٹی سی غلطی کی سزا نہیں، میں ابھی تمہارے کروت دکھاتا ہوں۔“ بابا نے غصے سے گرجتے ہوئے انگلی سے غار کی دائیں سمت والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ناقابل یقین منظر تھا۔ غار کی دیوار کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سینا کی اسکرین پر کوئی فلم چل رہی ہو۔

ایک خوفناک قسم کے بت کے سامنے ایک معصوم لڑکی خوف زدہ سی لیٹی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے بندھے تھے۔ ایک شخص تیز دھار خنجر سے اسے ذبح کر رہا تھا۔ پھر اس شخص نے ایک بڑے سے پیالے نما برتن میں لڑکی کی گردن سے بچنے والا خون جمع کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد خون سے بھرے پیالے سے تھوڑا سا خون ہاتھوں کے چلو میں لیا اور بت

پر اچھال دیا اس کے بعد پیالے کو منہ سے لگا کر خون پینے لگا وہ خوفناک منظر دیکھ کر لوگ ڈر سے کپکپانے لگے اس خونی شخص کی شکل ہو بہو باباجی کے سامنے موجود کوڑھ زدہ شخص کی طرح تھی۔

بابا نے دیوار کی طرف انگلی سے دوبارہ اشارہ کیا منظر تبدیل ہو گیا۔ اس بار وہ شخص قبرستان میں موجود کدال سے ایک قبر کھود رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کھودی گئی قبر میں جا گھسا اور اپنے کندھے پر ایک چودھ پندرہ سالہ لڑکی کی لاش لا کر باہر نکلا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کھنڈر نما مکان میں داخل ہوا اس نے لاش کے جسم سے کفن اتارا اور لڑکی کی بائیں ٹانگ خنجر سے کاٹ کر اس کی ٹانگ سے منہ لگا کر گوشت کھانے لگا کچھ دیر بعد اس کے ہاتھ میں صرف ہڈی تھی۔ اب وہ ہڈی سامنے رکھ کر کچھ پڑھ کر ہڈی پر پھونکتا جا رہا تھا۔

بابا نے ایک بار پھر انگلی سے اشارہ کیا اس بار اس وحشی درندے کو ایک بچے کے سینے سے دل نکالنے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ راجہ کی حالت ڈر اور خوف سے غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر بابا نے انگلی سے اشارہ کیا اور دیوار سے خوف ناک مناظر غائب ہو گئے راجہ گہری سانس لینے لگا۔

”تم نے اپنے اوپر سب دروازے بند کر دیے ہیں، تم نے شیطان کے کہنے پر اسلام چھوڑ کر دولت کی لالچ میں مرید ہو گئے اور بتوں کو پوجنے لگے، کئی بچیوں کو درندگی کا نشانہ بنایا۔ مردوں کی بے حرمتی کی، کئی بچے تمہارے ظلم کا نشانہ بنے۔ کالے جادو کے بل بوتے پر تم نے بہت سے گھر برباد کئے۔ عورتوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ آخر اللہ کا عذاب تم پر نازل ہو گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”بابا کی بات سن کر اس شخص نے چیخ ماری اور اپنے لباس سے خنجر نکال کر غار سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک چیخ سنائی دی۔ راجہ بابا سے اجازت لے کر غار سے باہر نکلا اسے ایک طرف لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ وہ ہجوم میں جا گھسا۔ ایک طرف اس شخص کی لاش

پڑی تھی اس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے غار سے باہر آ کر خودکشی کر لی تھی۔

وہاں رہتے ہوئے راجہ کو پانچ سال بیت گئے۔ بابا اسے بہت چاہتے تھے کیونکہ راجہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ ایک روز راجہ بابا کے پاؤں دبا رہا تھا کہ نجانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ بابا سے فرمائش کر ڈالی۔ ”بابا میرے والدین زندہ ہیں کہ نہیں، آپ آج مجھے ان کے بارے میں کچھ بتائیں۔“

بابا نے آنکھیں بند کیں چند لمحوں بعد آنکھیں کھول کر راجہ کو دیکھنے لگے کچھ دیر بعد راجہ نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔ جواب میں بابا خاموش رہے۔ ”کیا ہوا بابا! کچھ تو بتائیں۔“ بابا کوشش و جوش میں مبتلا دیکھ کر راجہ رسان سے بولا۔

”بیٹا تمہارا باپ زندہ ہے اور تمہاری ماں عرصہ ہوا اس کا انتقال ہو چکا ہے اس سے زیادہ مجھے بتانے کی اجازت نہیں۔“ بابا نے کہا۔

”راجہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔“ میں صرف ایک بار اپنی ماں کی روح سے ملنا چاہتا ہوں، یہ آپ کیلئے مشکل نہیں۔“

بابا کچھ دیر اسے ٹالتے رہے مگر راجہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ اتنے عرصے میں پہلی بار راجہ نے بابا سے کسی کام کا کہا تھا۔ بابا انکار نہ کر سکے۔ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر وظیفہ پڑھتے رہے تقریباً دس منٹ بعد غار میں ایک ہیولہ سا نمودار ہوا۔ جس نے ایک خوبصورت عورت کا روپ دھار لیا۔ اس عورت کی آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ راجہ ماں کی طرف بڑھا ماں سے لپٹنا چاہا مگر نام رہا۔ وہ ایک غیر مرئی وجود تھا۔ راجہ کے ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گئے۔ ”تم مجھے چھو نہیں سکتے روجوں کا شوق وجود نہیں ہوتا۔“

”ماں مجھے جہاز یوں میں کیوں پھینکا۔ تمہارا انتقال کیسے ہوا میرا باپ کون ہے؟“ راجہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹا میں تمہارے سوالات کے جواب نہیں

دے سکتی۔ مجھے اجازت نہیں ہے۔“ اس کی ماں کی روح بولی۔

”اچھا ماں اپنا نام تو بتا دو۔“ راجہ نے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میرا نام رادھا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔“ راجہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

☆.....☆.....☆

ہندوستان کے ایک قدیم مندر کے ایک ہال نما کمرے میں کالی کا خوف ناک بت موجود تھا۔ بت کے قدموں میں ایک سولہ سالہ خوبصورت لڑکی پڑی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے بندھے تھے۔ اس کے خوبصورت چہرے پر خوف و ہراس کی تاثرات نمایاں تھیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر لوہے کی ایک انگلیٹھی دھک رہی تھی۔ انگلیٹھی کے قریب ہی لنگوٹ باندھے مکروہ صورت مہا گرو رام پرشاد بیٹھا تھا۔ مہا گرو رام پرشاد آنکھیں بند کئے شلوک پڑھ رہا تھا۔ مہا گرو کے پیچھے ارجن اور اس کے پہلو میں ارجن کا بیٹا ستیش بیٹھا تھا۔ ستیش اپنے باپ ارجن کی طرح قد آور اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ چند پجاری پیتل کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے رقص کے سے انداز میں جھوم رہے تھے۔ شلوک پڑھتے پڑھتے مہا گرو نے آنکھیں کھولیں اور اپنی سرخ آنکھوں سے لڑکی کو گھورا شروع کر دیا۔ پھر اس سے نظریں پھیر کر ستیش کو دیکھا۔ ”ماتا کے قدموں میں ملی چڑھا دو سے ہو گیا ہے۔“ مہا گرو کی بھاری آواز ہال نما کمرے میں گونجی۔

ستیش نے ایک طرف پڑا خنجر اٹھایا اور لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی بلند آواز سے چیختی لگی۔ اس کی چیخیں اور فریادیں ہال نما کمرے میں گونج رہی تھیں۔ رات کے اس پہر اندھیرے میں اس کی مدد کے لئے کسی کا آنا مشکل ہی نہیں نامکن بھی تھا۔ ارجن اس وقت چہرے پر سفاک تاثر لئے ستیش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس نے ایک ہاتھ سے لڑکی کے سر کے بال جڑے ہوئے تھے۔ اور دوسرے ہاتھ سے تیز دھاڑ خنجر چیتنی ہوئی لڑکی کی شہ رگ پر چلا رہا تھا قریب کھڑے ایک پجاری نے بڑا سا پیالہ نمائرتن آگے کیا۔ لڑکی کی گردن سے بہنے والا خون پیالے میں جمع ہونے لگا۔ پجاری نے پیالہ خون سے بھرتے ہی اٹھایا اور بت لی کے قدموں کے پاس ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھ دیا۔ یہاں کئی دیئے روشن تھے مہارگرو آگے بڑھا اور چلو بھر پیالے سے خون لیکر بت پر ڈالا اور کچھ بت کے قدموں میں چھڑک دیا۔ اس کے بعد ارجن نے یہ عمل دہرایا۔ پھر ستیش کی باری آئی۔ اس طرح بار بار سب نے بت پر خون اچھالا۔

مہارگو نے دوبارہ اشلوک پڑھنا شروع کر دیئے بیتل کی گھنٹیاں دوبارہ بجنے لگیں جولہ بہ لچہ تیز ہوتی گئیں۔ ستیش نے مہارگو کے اشارے پر ایک طرف رکھا بڑا سا تھال اٹھایا اور خنجر سے لڑکی کا سر دھڑ سے الگ کر کے تھال میں رکھ دیا۔ تھال میں رکھا سرت کے قدموں میں رکھ دیا گیا ہر چہرے پر عجیب قسم کا جوش و خروش تھا۔ کچھ دیر بعد یہ درنگ ختم ہو گئی۔

اب مہارگو، ارجن اور ستیش ایک دوسرے کمرے میں موجود تھے۔ مہارگو ادھیڑ عمر کا بد صورت شخص تھا۔ اس کا کہنا تھا شادی کرنے سے دھرم کی سیوا میں فرق پڑتا ہے اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی دھرم کے نام پر داسیوں کی بربادی کی تھی۔ مہارگو جب سفلی جذبات سے مغلوب ہوتا تو مندر کی داسیوں کو سیوا کے نام پر برباد کرتا تھا۔

”ارجن تم سے بھگوان ناراض تھا، اسی کارن تمہاری پتی نے تجھ کو جہنم دیا۔ پھر تم نے ہمارے حکم

پر اماوس کی رات کالی کے قدموں میں ایک خوبصورت ناری کی بلی دی اسی کارن ستیش پیدا ہوا، تم نے ہمیشہ کی طرح ہر اماوس کی رات ایک خوبصورت ناری کی بلی دی ہے، مانتا تمہاری رکشا کرے گی۔“ مہارگو نے کہا، کچھ دیر بعد دونوں باپ بیٹا مہارگو کے چرن چھو کر مندر سے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ارجن نے رادھا کو قتل کرنے کے کچھ عرصے بعد شانتی نامی ایک بہن لڑکی سے شادی کر لی تھی جس سے اس کا بیٹا ستیش اور بیٹی کشمی تھی جو سبھی کے ایک کالج میں زیر تعلیم تھی۔ چند سال پہلے ارجن کی بیوی شانتی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔

جب وہ اپنی جدید طرز کی عالی شان کوشی میں داخل ہوئے، رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ لہذا دونوں نے اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔

صبح دیر سے ان کی آنکھ کھلی۔ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ کشمی اپنی کلاس فیلو سہیلی مالا کے ساتھ آ پہنچی۔ ملا اور کشمی نے پرنام کیا۔ ”پتا جی مالا کی بوی بہن کی سگانی ہے اور اس کا اصرار ہے کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چاندنی نگر جاؤں۔“

کشمی ارجن سے مخاطب تھی۔ ”ٹھیک ہے چلی جانا۔“ ارجن کے اجازت دینے پر دونوں سہیلیاں خوش ہو گئیں دوسرے روز دونوں سہیلیاں چاندنی نگر پہنچ گئیں۔ ٹھاکر بھگوان داس ان کی چٹی اور گھر کے دیگر افراد کشمی سے بڑی شفقت سے پیش آئے اس روز دونوں سہیلیاں رات دیر تک باتیں کرتی رہیں۔

صبح سچن کی آواز سے ان کی آنکھ کھلی۔ ناشتہ کرنے کے بعد ملا کشمی کو لے کر گاؤں کی سیر کو نکل گئی۔ ہرے بھرے سرسبز کھیت پھلوں سے لدے درخت نہایت ہی دل کش منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ دونوں گھومتی پھرتی گاؤں کے آخری سرے پر جا پہنچیں۔ وہاں ایک خوبصورت نہر بہہ رہی تھی۔ وہ دونوں نہر کے کنارے بیٹھ گئیں۔ ”کشمی کیا تمہارے دل پر کسی نے دستک دی ہے؟“

”اب تک تو آنکھوں میں کوئی جچا ہی نہیں میرے سینوں کا رعبہ بہت سندر ہے! جب سامنے آئے گا تو میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔“ کشمی نفرتی آواز میں کہی۔

اچانک کشمی کے منہ سے کر بناک چیخ نکلی وہ نہ صرف چیخ بلکہ زمین پر گر کر تر پنے لگی، بھگوان بھگوان وہ وحشت سے پکار رہی تھی۔ اس کے چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ ملا گہرا کر چیختی ہوئی کشمی کی طرف لپکی، تب اس کی نگاہ ایک کالے سے لمبے سانپ پر پڑی جو رینگتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ کشمی نے اپنی پٹلی دونوں ہاتھوں سے جکڑی ہوئی تھی۔ اور تکلیف کی شدت سے پانی سے نکلی جھپکی کی طرح ترپ رہی تھی۔ اس کی صاف و شفاف رنگت میں ہلکی سی نیلاہٹ کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔

”مالا مجھے بچالو، میں مرنا نہیں چاہتی۔“ وہ کراتے ہوئے بولی، سانپ نے اپنے دانت کشمی کے پاؤں پر گاڑ دیئے تھے متاثرہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ تکلیف اور درد کی شدت سے کشمی کے حسین چہرے کے نقوش بگڑ گئے تھے۔ زخم کے ارد گرد کی جلد کا رنگ تبدیل ہونا شروع ہو چکا تھا۔ مالا مدد کے لئے چیخ چلا رہی تھی۔ اس کی عزیز جان سہیلی اس کی نگاہوں کے سامنے موت کے منہ میں جا رہی تھی۔ وہ بے بسی سے چیختے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ”کشمی ہوش میں آؤ، چیختے چیختے بے ہوش ہوتی ہوئی کشمی کو مالا نے سمجھوڑا۔

اسی وقت نہر کے دوسرے کنارے پر درمیانی قد و قامت کا ایک نوجوان نمودار ہوا شاید اس نے مالا کی چیخ و پکار سن لی تھی۔ نوجوان نے نہر میں چھلانگ لگادی اور تیزی سے تیر کر ان تک جا پہنچا۔ ”کیا ہوا انہیں؟ اس نے مالا سے پوچھا۔

اسی لمحے اس کی نظر کشمی کے منہ کے قریب زخم پر پڑی۔ اس نے چونک کر کشمی کی زہر سے نیلی پڑتی

جلد دیکھی۔ ”اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے وہ بڑ بڑائی۔ اس نے زخم سے کپڑا سرکایا۔

”کوئی رسی یا کپڑے کا ٹکڑا دینا جلدی۔“

مالا نے اپنے دوپٹے سے ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر اسے دیا۔ نوجوان نے کپڑے کا ٹکڑا اس کی زخم سے اوپر باندھا۔ اور پھر اس کے زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

وہ پوری قوت سے زہر چوس کر ایک طرف تھوکتا چلا گیا۔ خون سے نوجوان کے ہونٹ تھڑپکے تھے۔ جب زخم سے نکلنے والا زہر ختم ہو گیا تو اس نے نہر کے پانی سے منہ ہاتھ دھو پاگلی کی اور دوبارہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ کشمی غنودگی میں تھی، وہ بغور کشمی کو دیکھنے لگا اس کا سانپے میں ڈھلا جسم قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب یہ خطرے سے باہر ہیں، پھر بھی طبی امداد ضروری ہے۔ آئیے آپ لوگوں کو گھر پہنچا دوں۔“

اس نے کشمی کو ہاتھوں میں اٹھالیا۔ اب وہ دونوں حوبلی کی طرف چلنے لگے۔ کشمی کے جوان جسم سے نوجوان کو تپش محسوس ہو رہی تھی۔ اس تپش سے اس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔ مالا چلتی ہوئی اسے راستہ بتاتی جا رہی تھی۔ ”آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہی تھیں؟“ نوجوان نے چلتے ہوئے پوچھا۔

”میں اس گاؤں کے ٹھاکر بھگوان داس کی بیٹی مالا ہوں۔ اور یہ میری سہیلی کشمی ہے سبھی سے میری بہن کی سگانی میں آئی ہے۔ ہم گاؤں کی سیر کرتے ہوئے اس نہر کے کنارے آئے ہی تھے کہ اسے سانپ نے ڈس لیا وہ تو بھگوان کی کرپا سے آپ بچ گئے۔ آپ کون ہیں کیا آپ سپیرا ہیں؟“ مالا نے پوچھا۔

میرا نام سلمان ہے میں نہر کی دوسری طرف والے گاؤں روپ نگر میں رہتا ہوں، میں سپیرا نہیں ڈاکٹر ہوں۔“

”آپ شکل سے دیہاتی نہیں لگتے۔“ مالا بولی۔

”پہلے ہم ہمیں کی ایک پسماندہ بستی میں رہتے

تھے۔ والدین کے فوت ہونے کے بعد تعلیم مکمل کر کے میں گاؤں آ گیا۔ یہاں میرے ماموں رہتے ہیں۔ بمبئی کے ایک ہاسپٹل میں جاب کرتا ہوں۔ ان دنوں چھٹیوں پر گاؤں آیا ہوا ہوں۔“ باتوں باتوں میں وہ حویلی کے قریب پہنچ گئے۔

لکشی اب ہوش میں آ رہی تھی۔ اس نے کسماندا شروع کر دیا۔ مالا کے اشارے پر سلمان نے لکشی کو نیچے اتارا۔ لکشی ہوش میں آ چکی تھی۔ مالا نے لکشی کو سہارا دیا۔ وہ سہارے کے باوجود لڑکھڑا کر چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد تینوں حویلی میں تھے۔ لکشی کی حالت دیکھ کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ فوراً ہی گاؤں کے چھوٹے سے اسپتال سے ڈاکٹر بلوا لیا گیا۔ طبی امداد کے کچھ گھنٹوں بعد لکشی مکمل ہوش میں آ چکی تھی۔ اس افراتفری میں سلمان کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ گیا۔ مالا کے بتانے پر کہ سلمان نے لکشی کی جان بچائی تھی اس کی تلاش شروع ہوئی پھر وہ افراتفری میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ لکشی کو اس سے نہ ملنے کا ملال تھا۔ وہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔

مالا کی بہن کی رگائی کے بعد لکشی واپس بمبئی چلی گئی۔

کچھ روز بعد ایک دن مالا اور لکشی کالج سے لوٹ رہی تھیں۔ گاڑی ان کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اچانک مالا نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہا۔ ”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ لکشی گاڑی رکتے ہی بولی۔ ”ایک منٹ نیچے تو اتر دو۔“

مالا لکشی کا ہاتھ پکڑ کر لینڈ کروزر سے نیچے اترتی۔ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر درمیانے قد و قامت کا گندی رنگت کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ مالا لکشی کو لئے ہوئے اس کے قریب جا پہنچی۔ ”نستے! سلمان صاحب کیسے ہیں آپ؟“ مالا پوچھی۔

”اوہ آپ لوگ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ ”آپ کو بتایا تو تھا کہ ہم بمبئی کے ایک کالج میں پڑھتی ہیں، لگتا ہے آپ کی یادداشت میں کوئی بڑا گڑبڑ

گھونٹا ہے۔“ مالا خوشی سے بولی اور سلمان ہنس دیا۔ لکشی پسندیدہ نگاہوں سے سلمان کو دیکھ رہی تھی۔ ”کہیں پر نگاہیں کہیں پر نشاندہ۔“ مالا ہنسی تو اس کے ہنسنے سے لکشی جھینپ گئی۔

”اچھا ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ آپ اپنی اس مرلیضہ کے علاوہ دوسرے مرلیضوں کا کس ہاسپٹل میں علاج کرتے ہیں۔“ مالا نے اسے چھیڑا۔

”میں سبھیں ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کرتا ہوں۔ اوہ! میری بس آگئی۔“ سامنے سے اپنے روٹ کی بس آتے دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ امداد بھی میسر آ گئی، مالا کی شرارتوں نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ اس کے بعد تین چار بار لکشی اور سلمان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شاید تقدیر انہیں ایک دوسرے کے قریب لا رہی تھی۔

چند ہی ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ اگرچہ ان دونوں کے مذہب مختلف تھے مگر عشق وہ مرض ہے جو علاج ہے، یہ نہ مذہب دیکھتا ہے اور نہ ذات پات۔ وہ دونوں ہر دوسرے تیسرے دن ملنے لگے۔ کبھی کسی پارک میں ملتے، کبھی ساحل سمندر پر ملتے اور کبھی کسی ہوٹل میں ملتے۔ لکشی نے سلمان کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا بالآخر ایک دن ان کی ملاقاتیں رنگ لائیں اس دوران دونوں نے ایک ریٹورنٹ میں ملاقات کی۔ کچھ دیر بعد وہ جیسے ہی باہر نکلے لکشی کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک شاندار گاڑی سے اس کا بھائی ستیش اپنے باڈی گارڈ گوپال کے ساتھ اتر رہا تھا۔ لکشی ایک طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی، وہ دل ہی دل میں بھگوان سے پرارتھنا کر رہی تھی کہ ستیش کی نظر اس پر نہ پڑے لیکن ستیش اسے دیکھ چکا تھا۔ ایک اجنبی کے ساتھ لکشی کو دیکھ کر اس کے سینے میں آتش اشقام بڑھنے لگی۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ اگلے ہی لمحے اس کا زوردار تھپڑ لکشی کے چہرے پر پڑا۔ لکشی کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا کر گر گئی تو سلمان نے اسے تھام لیا۔ ستیش کا پارہ

مزید چڑھ گیا اس نے لکشی کا ہاتھ پکڑا اور زوردار فریٹ نکال سلمان کے سینے پر ماری تو وہ اچھل کر پشت کے بل گرا۔ ”بھیا یہ سلمان ہے۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔“ لکشی نے چیختے ہوئے کہا۔

”جان بچانے کا یہ مطلب نہیں کہ تم چھپ کر اس سے ملو، یہ مسئلہ ہوتے ہی ملے ہو۔ گوپال اسے اس کی گستاخی کا سبق سکھاؤ تاکہ یہ پھر بھی کسی ہندو ناری کی طرف دیکھنے کے لائق نہ رہے۔“ ستیش سانپ کی طرح پھنکارا اور لکشی کو گھیسٹ کر گاڑی کے قریب لے آیا۔

گوپال کسی وحشی جانور کی طرح سلمان پر پل پڑا۔ چند ہی منٹ میں سلمان کو اپنے جسم پر بہت سے گھونٹنے لگا۔ تعداد لائیں سہنا پڑیں وہ بری طرح گوپال کے ہاتھوں سے مار کھا رہا تھا۔

سلمان لڑائی بھڑائی سے ناواقف شریف انسان تھا۔ اس لئے بغیر کسی مزاحمت کے گوپال سے مار کھا رہا تھا۔ لکشی چیخ چیخ کر اسے چھوڑ دینے کا کہہ رہی تھی۔ گوپال اس کی چیخ و پکار سے بے نیاز سلمان کی مرمت کر رہا تھا۔ ارد گرد بہت سے لوگ موجود تھے۔ جو خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ گوپال کا ہاتھ روکنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ سب جانتے تھے کہ گوپال ارجن کا غنڈہ ہے۔ اس کے سامنے آنے کا مطلب موت کے منہ میں جانا تھا۔

سلمان کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم چوٹوں کی وجہ سے بری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے سینے پر فریٹ لگ لگی تو نیچے گرتے ہی گوپال اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ گوپال نے اپنی پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر نکالا اور سر سے بلند کر دیا۔ سلمان کا دل خوف کی شدت سے زور زور سے دھڑکنے لگا، ڈر کے مارے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک لہری دوڑ گئی۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ پڑھنے لگا۔ اب کسی بھی لمحے گوپال کے خنجر والے ہاتھ نے نیچے آتا تھا اور اس نے موت کی

وادی میں اتر جانا تھا خوف سے اس کا پورا جسم پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ اور پھر گوپال کا خنجر والا ہاتھ نیچے آنے لگا۔

☆.....☆.....☆

مہندر ادھیڑ عمر کا عامی شکل و صورت کا انسان تھا۔ وہ لمبا چوڑا اور گرائڈ بل شخص تھا اس کے گہرے سانولے چہرے پر بڑی بڑی ہنسی موجھیں اسے اور بھی خوفناک بناتی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر تک گلیوں میں آوارہ گھومتا رہا۔ باپ مر گیا تو اس نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ لہذا اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ارجن کے گروہ میں شامل ہو کر غنڈا گردی شروع کر دی۔ مہندر کے خیالات اپنے باس ارجن سے ملتے جلتے تھے ان دونوں میں بس اتنا فرق تھا کہ ارجن اب تک دو شادیاں کر چکا تھا جبکہ مہندر ہنوز غیر شادی شدہ تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا جو کہ دوسری منزل پر واقع تھا۔ اس میں صرف دو کمرے تھے۔ چونکہ وہ تنہا رہتا تھا وہ اپارٹمنٹ کافی مہنگے اور پرسکون علاقے میں تھا۔ آنے جانے کیلئے اس کے پاس نئے ماڈل کی شاندار کار تھی۔

اس وقت رات کے دس بجے وہ ایک بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگ کر اپنے فلیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ مقتول کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے منشیات کے اڈے کے بارے میں اعلیٰ افسران کو اطلاع کر دی تھی بے جا مقتول یہ نہیں جانتا تھا کہ ہر ملک کے محکمہ پولیس میں چند ایسی کالی بھیڑیں ہوتی ہیں جو رشوت کی ہڈی کھا کر مجرموں کا ساتھ دیتی ہیں ان ہی کالی بھیڑیوں میں ایک ایسی پی پاٹھ، ارجن کا نمک حلال تھا SP پاٹھ نے مقتول کی اس حرکت کی ارجن کو خبر کر دی چنانچہ منشیات کا وہ اڈہ وہاں سے شفٹ کر دیا گیا اور مہندر نے ارجن کے حکم پر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مہندر نے گاڑی پارکنگ میں پارک کی اور سیزھیاں چڑھ کر اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر جا پہنچا۔ جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھول کر اندر

داخل ہوا، لائٹ آن کی کمرے میں روشنی ہوتے ہی وہ حیرت سے اچھل پڑا، سامنے کرسی پر گورے رنگ کا ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا تھا۔ جس کی دائیں ہاتھ میں سالٹسٹر لگا رہا اور موجود تھا جس کی نال کارخ ہمندر کی طرف اور انگلیاں ٹیگر پرتھیں۔ نوجوان کلین شیو تھا۔

ہمندر کا ہاتھ آہستہ آہستہ اس کے ہولیسٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”مسٹر ہمندر زیادہ ہوشیاری مدت دکھانا۔ ورنہ اس بے آواز ریوالور کی گولی تمہارے گندے دماغ میں گھس جائے گی تمہاری ساری زندگی ان کھلونوں سے کھیلتے گزری ہے اس لئے تم بخوبی اس ہتھیار کی تباہ کاریوں سے واقف ہو گے۔“ نوجوان سرد لہجے میں بولتا ہوا اس سے اٹھا۔

”تم اندر کیسے آئے دروازہ تو لاک تھا؟“ ہمندر کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مجھے تم جیسے عادی مجرم سے اس احقانہ سوال کی امید نہیں تھی۔ جرائم پیشہ افراد کے لئے پیچیدہ لاک کھولنا کوئی مشکل کام نہیں اب بناو لے اپنے منہ دیوار کی طرف کر کے ہاتھ سر سے بلند کرو۔“ نوجوان بولا اور ہمندر خوفی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ نوجوان نے فائز کیا گولی نے ہمندر کے کان کی لواڑادی ہمندر کے منہ سے کراہ نکلی۔ اس کے کان سے خون بہنے لگا۔

”ہمندر میں اپنی بات دہراؤں گا نہیں۔ اس بار گولی تمہاری کھوپڑی میں گھسے گی۔ اور میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔“ ہمندر دیوار کی طرف منہ کر کے ہاتھ سر سے بلند کئے کھڑا ہو گیا۔ نوجوان آگے بڑھا اور اس کے ہولیسٹر سے پستول نکالنے کے بعد بڑی مہارت سے اس کی تلاش لی اور پیچھے ہٹا۔ ”اب ہاتھ نیچے کر کے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“

ہمندر نے بناء کسی چوں چاں کے اس کے حکم کی تعمیل کی، نوجوان نے اپنے کوٹ کی جیب سے تانیلون کی رسی برآمد کی اور ہمندر کو مضبوطی سے کرسی سے باندھ دیا۔ آخر تم ہو کون اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ ہمندر نے پوچھا۔

”میرا نام راجہ ہے، مجھے صرف چند سوالات کے جواب چاہئے، تمہارے لئے بس اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ اب سوال میں کروں گا جواب تم دو گے جھوٹ بولنے اور جواب نہ دینے کی صورت میں تمہیں گولی مار کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔“ راجہ سفاک لہجے میں بولا۔ ”آپ نے کئی سال پہلے ایک نومولود بچے کو جھاڑیوں میں پھینکا تھا۔ وہ بچہ کس کا تھا اور تم نے اسے کیوں جھاڑیوں میں پھینکا تھا؟“ راجہ کا سوال سن کر ہمندر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟“

”میں نے کہا تھا کہ سوال مت کرنا، میرے پاس وقت بالکل نہیں، میرے تین گننے سے پہلے سچ بولنا شروع کرو۔ ایک..... دو“

”بچہ ہمارے پاس ارجن کا تھا، بچہ چونکہ ننھا تھا اس لئے ارجن کے کہنے پر ہم نے اسے جھاڑیوں میں پھینک دیا میرا ارادہ اسے مار کر پھینکنے کا تھا لیکن میرے ساتھ میرا جو ساتھی تھا اس نے کہا۔“ اسے مارنے کی کیا ضرورت ہے جھاڑیوں میں پھینک دو خود ہی مر جائے گا۔“ ہمندر نے نکستی پوری ہونے سے پہلے جواب دیا۔

”بھگوان کے لئے صرف اتنا بتا دو تم ہو کون؟ اور مجھ تک کیسے پہنچے؟“ ہمندر نے پوچھا۔

”بچے کو جھاڑیوں میں پھینکنے وقت تمہارا ساتھی کارڈ وہاں گر گیا تھا۔ اسی کے ذریعے یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب یہ بتاؤ بچے کی ماں پر کیا گزری، کیا اس نے ارجن کو اس درندگی سے روکا نہیں۔“ راجہ بولا۔

”بچے کی ماں رادھا کو اسی دن ارجن صاحب نے قتل کر دیا تھا۔“ ہمندر کا جواب سن کر راجہ کا خون کھولنے لگا۔

”ارجن کا ایڈریس کیا ہے؟ اس کے کاروبار کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“ ہمندر راجہ سے خوف زدہ ہو چکا تھا اس نے تفصیل سے راجہ کو ارجن کے جوئے کے اڈے، نشانات کے اڈے، اسلحہ کے اڈے

اور اس کی کوشی کا ایڈریس اور دیگر معلومات جو کچھ راجہ پوچھتا گیا بتاتا گیا اس کے بعد راجہ نے اس کی پیشانی پر گولی مار کر اسے جہنم رسید کر دیا۔ ہمندر کو مارنے کے بعد وہ اپارٹمنٹ سے باہر نکلا اور اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر تیز رفتاری سے ایک طرف جانے لگا۔

راجہ کو زوروں کی بھوک لگ رہی تھی نہا کر کپڑے تبدیل کے اسے بھوک سے چکر آ رہے تھے ایک ریسٹورنٹ کے قریب پہنچ کر موٹر سائیکل روکی ایک طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ جینے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں، وہ فطری جیس کے تحت راستہ بناتا ہوا ہجوم میں جا گھسا، اس کی نگاہوں کے سامنے ناقابل یقین منظر تھا، ہجوم کے درمیان اس کے محسن کا بیٹا سلمان زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سینے پر ایک شخص بیٹھا تھا جس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند تھا اس سے پہلے کہ گویال کے ہاتھ میں موجود خنجر سلمان کے سینے میں اترتا راجہ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اس نے پاؤں کی زوردار ٹھوکروں گویال کے خنجر والے ہاتھ پر ماری خنجر اڑتا ہوا ایک طرف جا گرا اس کے پاؤں کی دوسری ٹھوکروں گویال کی کپٹی پر پڑی گویال الٹ کر ایک طرف گرا۔ مگر گرے ہی پھرنی سے اٹھا ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی ارجن کے بندے سے لکرانے کی؟“ گویال غصے سے دھاڑا۔

گویال کے منہ سے ارجن کا نام سنتے ہی راجہ گویال پر پل پڑا اس نے گھوم کر نگاہ تین چار لکس گویال کی پسیلیوں میں ماریں۔ گویال نے اس کے چہرے پر گھونٹے مارنا چاہا۔ راجہ نے پھرنی سے اس کا ہاتھ طلائی سے پکڑ کر ایک زوردار گھونٹے اس کے چہرے پر مارا۔ اسی لمحے سٹیش نے لکشی کو ایک طرف دھکیلا اور گالیاں بکتا ہوا راجہ کی طرف بڑھا۔ راجہ نے پوری قوت سے گویال کے چہرے پر زوردار ٹھوکری گویال چیخا ہوا نیچے گرا۔ راجہ اب آگے بڑھتے ہوئے سٹیش کی طرف متوجہ ہو گیا دونوں نے ایک دوسرے پر چھلانگیں لگائیں، دونوں کے جسم فضا میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اب وہ وحشیوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ

کر رہے تھے۔ دونوں ہی زور آور تھے۔ ایک موقع پر راجہ لڑتے لڑتے نیچے گرا اور سٹیش نے ہولیسٹر سے ریوالور نکال کر راجہ پر تان لایا اسی وقت نیچے گرے ہوئے گویال نے راجہ پر چھلانگ لگادی۔ ادھر سٹیش نے ٹیگر دبا دیا۔ (سٹیش کے ریوالور سے نکلی گولی راجہ پر چھلانگ لگانے والے گویال کے سینے میں لگی تو گویال چیخا ہوا گرا۔)

گولی چلنے کی آواز اور گویال کے مرنے سے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب ڈر کے مارے ادھر ادھر بھاگنے لگے گویال کے سینے پر اترتا گولی لگنے سے سٹیش چند لمحوں کیلئے بولکھا گیا اس کی بولکھا ہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجہ نے سٹیش کے سینے پر چھپ سائیڈ لک ماری، سٹیش نیچے گرا اور اس کا سر نیچے پڑے پتھر سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

راجہ نے زخمی سلمان کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ”راجہ اگر تم بروقت نہ پہنچتے تو یہ شیطان مجھے جان سے مار دیتے۔“ وہ راجہ سے لپٹ گیا۔

”یہاں سے نکلتا ہو کہ پولیس آجائے۔“ راجہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے جانے لگا۔ ”لکشی کو تو ساتھ لیتے جائیں۔“ سلمان بولا اور ایک طرف کھڑی لکشی کا ہاتھ تھام لیا۔

”لکشی تم بھی ہمارے ساتھ چلو، یہ درندے ہوش میں آتے ہی تمہیں جان سے مار دیں گے۔“ لکشی نے اثبات میں سر ہلایا وہ دونوں راجہ کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل چابیٹھے کچھ دیر بعد ورمیش کے فلیٹ پر موجود تھے۔ رمیش اب تک نہ لوٹا تھا۔

”راجہ نے تم ایک دم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“ سلمان نے پوچھا تو راجہ نے اپنی داستان اسے سنا ڈالی کہ کیسے وہ بابا تک پہنچا اور پھر وہاں سے بھاگ نکلا۔ ”اب مجھے اپنی ماں کے قاتل کی تلاش ہے۔“ راجہ آپ کی ماما کو کس نے قتل کیا تھا؟“ لکشی نے پوچھا۔

”میری ماں کا قاتل میرا باپ ارجن ہے، اسی

درندے نے مجھے پیدا ہوتے ہی جھاڑیوں میں پھنکوا دیا تھا۔ جہاں سے سلمان کے والد نے مجھے اٹھایا۔

راجہ اپنی کہانی شروع سے لکشی کو سنائی۔ ”اس کا مطلب ہے آپ سے میرا خون کا رشتہ ہے، آپ میرے بھائی ہیں مگر پتا جی نے ایسا کیوں کیا؟“ لکشی بولی۔

”وہ اس لئے کہ میرا تعلق تیرے تیسری جنس سے ہے، اسی گناہ کی سزا ارجن نے میری ماں کو بھی دی، تم ارجن کی بیٹی ہو؟“ راجہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

”ہاں وہ میرے پتا ہیں اور جس نے آپ پر گولی چلائی وہ میرے بڑے بھائی ستیش ہیں، اب ہم تینوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں پتا جی اور بھیا کا یہاں پر بہت اثر و رسوخ ہے۔ وہ دونوں بہت ظالم ہیں، ہر اداؤں کی رات بڑے مندر میں مہا گرو رام پرشاد کے ساتھ مل کر انسانی زندگی کی بلی دیتے ہیں مہا گرو بڑے شکی شالی ہیں۔ ان کی نظروں سے بچنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔“ لکشی کے لہجے میں خوف تھا۔

”اللہ سب سے بڑا ہے، نمرود کو ایک کانا چھرنے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ تم دیکھ لینا ارجن کی موت مجھ جیسے معمولی انسان کے ہاتھوں ہی ہوگی، میں تم دونوں کو بابا جی کے آستانے پر چھوڑ آتا ہوں وہاں پہنچنا کسی بھی شیطانی طاقت کے لئے ناممکن ہے۔ اس کے بعد ارجن کے ظلم کا خاتمہ کرو دوں گا۔“ راجہ کے لہجے میں چٹانوں کا ساعز تھا۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ تینوں فلیٹ سے باہر نکلے۔ لکشی نے برقع پہنا ہوا تھا جو راجہ بازار سے خرید لیا تھا۔ جبکہ راجہ دونوں کو بابا جی کے آستانے پر پہنچا کر بابا سے اجازت لے کر دوبارہ شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔ آج انہیں یہاں آنے ہوئے دوسرا روز تھا وہ غار سے باہر پہاڑ پر گھوم رہے تھے کہ اچانک لکشی کا دم گھٹنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا گلا بادرہا ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا۔ اس کے

کانوں میں سرگوشی کی سی صورت میں ایک بھاری آواز گونجنے لگی۔

”لکشی آؤ اپنے اصل کی طرف یہ سب فریب ہے۔“ پھر اس کے کانوں سے سچن کی آواز گونجانے لگی۔ وہ یوں جھومتی ہوئی پہاڑ سے نیچے اترنے لگی جیسے نشے میں ہو۔ سلمان جو کہ اس کے قریب موجود تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر چونک پڑا۔ لکشی کی آنکھیں بند تھیں وہ جیسے نیند میں چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ”لکشی رکو سلمان نے لکشی کو پکڑنا چاہا کسی نادیدہ قوت نے اس کو زوردار دھکے دیا۔ وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گرا۔ اسی لمحے ان کے سامنے ایک ہیولہ سا نمودار ہوا۔ جس نے کئی فٹ لمبے قوی بریکل خوفناک شخص کی شکل اختیار کر لی۔ وہ یہاں کا ٹھکانہ جن تھا جن نے انگلی سے لکشی کی طرف اشارہ کیا تو لکشی لہرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ جن نے آگے بڑھ کر لکشی کو اٹھالیا۔ ”چلو بابا کے غار کی طرف۔“ وہ گونجی آواز میں سلمان سے مخاطب ہوا۔ اگر راجہ اسے یہاں کے بارے میں تفصیل سے نہ بتا چکا ہوتا تو وہ جن کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاتا، اب وہ جن کے پیچھے چلتا ہوا خوف سے لرز رہا تھا۔ توڑی دیر بعد وہ غار میں بابا جی کے سامنے موجود تھے۔

بابا جی نے کچھ پڑھ کر لکشی پر چھوٹا تو لکشی ہوش میں آئی، بابا کے اشارے پر جن غائب ہو گیا۔ ”بابا میں یہاں کیسے آ گئی، ہم تو باہر گھوم رہے تھے؟“ لکشی نے پریشانی سے کہا۔ اسی وقت غار میں تیز ہوائیں چلنے لگیں یوں لگ رہا تھا جیسے طوفان آ گیا ہو۔ لکشی کی کیفیت دوبارہ بدلنے لگی۔

بابا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں، وہ کچھ پڑھنے لگے۔ انہوں نے لکشی اور سلمان کے گرد حصار باندھا۔ ”تو نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی چلا جا اپنا ناپاک وجود لے کر درندہ بن جائے گا۔“ وہ غصے سے کسی نادیدہ قوت سے مخاطب تھے ہواؤں کے جھکڑ بدستور چل رہے تھے۔

اسی لمحے غار میں ایک بھاری آواز گونجنے لگی

”اپنی بدھی (کچھ عقل) سے کام لے بڑھا۔ اس ناری کو ہمارے حوالے کر دے ورنہ تیرے اس اپراہ سے میرے اور تیرے درمیان ایک یدھ کا آغاز ہوگا۔ میں اب بھی تجھے شکر کہتا ہوں۔“ بابا جی نے اپنے پاس سے ایک پتھر اٹھا کر غار کے دہانے کی طرف پھینکا تو فوراً ہی بہت سی خوفناک چیخیں سنائی دیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

”بابا یہ سب کیا تھا؟“ سلمان نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ رام پرشاد کے پیچھے ہوئے پیر تھے جو مل کر بھسم ہو چکے ہیں۔“ بابا مطمئن لہجے میں بولے۔ کچھ دن میں ہی لکشی کے دل و دماغ کی دنیا بدل گئی اس نے دین اسلام کی سچائی جان لی تھی، اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا تھا اس کا اسلامی نام مریم رکھا گیا۔ بابا نے سلمان اور مریم دونوں کا نکاح بھی پڑھا دیا تھا۔

ارجن کی کوشی کے ایک کمرے میں ارجن، ستیش اور مہا گرو موجود تھے۔ ”پتا جی اگر درمیان میں وہ اجنبی نوجوان نہ آتا تو میں اور گوپال اس لڑکے کی ہتھکڑیاں لٹے مگر وہ اچانک ہمارے درمیان آ گیا تھا، گوپال مارا گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ وہ میری غلطی سے لکشی کو لے کر فرار ہو گئے۔“ ستیش نے کہا۔

”تم لوگوں سے پرتو ایک بھول ہو گئی مجھے دیر سے اطلاع دی اس سے تک لکشی نورانی فکستی والے تک پہنچ چکی تھی۔ میری خطایہ ہے کہ میں نے اسے معمولی سمجھ کر کم فکستی والے پیر پیچھے جنہیں اس مسئلے نے جلا کر بھسم کر ڈالا۔ اب اسے چھوڑوں گا نہیں، ہمارے بیچ ایک یدھ کا آغاز ہو چکا ہے۔ تم لوگ ماتا کے چرووں میں بی بی چڑھانے کا انتظام کرو تا کہ میں بھرپور داراں بڑھے پر کروں۔“ مہا گرو نے کہا۔

اچانک ارجن کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی ارجن نے کال ریسیو کی، ارجن صاحب غضب ہو گیا کسی نے ہماری فیکٹری کو بم سے اڑا دیا ہے۔ اور انا ج

فرمان رب ذوالجلال

اللہ رب العزت نے فرمایا.....

اے بنی آدم! میرا حوصلہ تو دیکھ..... جو فرشتے ہر شام میرے پاس تیرے گناہوں کے بٹل لاتے ہیں میں ہر صبح انہی کو تیرے لئے بے شمار رزق دے کر واپس موڑتا ہوں۔ میں تو تجھے ہر گھڑی یاد رکھتا ہوں کیا تو نے کبھی میرا ذکر کیا.....؟

(محمد وارث آصف - وال پھراں)

کئی گوداموں کو آگ بھی لگا دی ہے۔ سب کچھ تباہ ویراں ہو گیا کچھ نہیں بچا۔ آج ہفتہ وار چھٹی تھی اس لئے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ دوسری طرف ارجن کا فیکٹری نیچر شرماتا۔

ارجن کے اوسان خطا ہو گئے۔ ”ستیش اپنے ساتھ خاص خاص آدمی لے جاؤ اور پتہ کرو کہ فیکٹری اور اناج کے گودام کس نے تباہ کئے اور بی کیلئے کسی لڑکی کا انتظام بھی کرو، کل اداؤں کی رات ہے۔“ ارجن نے ستیش کو ہدایات دیں۔ ستیش فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسی وقت ارجن کا موبائل فون دوبارہ بجا۔ ”ہیلو ارجن بول رہا ہوں۔“

”جتنا بولنا ہے بول لو، پھر تمہیں بولنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ کیونکہ تم اس قابل بھی نہیں رہو گے کہ بول سکو۔ تمہارے سارے جوئے کے اڈے، منشیات کا اڈہ، اسلحہ کا اڈہ، تمہارے غنڈے بد معاش اور تمہارا درندہ صفت بیٹا یہ سب ایک جہتے میں ختم ہو جائیں گے اس کے بعد تمہاری باری ہے۔“ دوسری طرف سے اجنبی آواز سنائی دی۔

”کون ہو تم؟“ ارجن نے پوچھا۔

”میرا نام راجہ ہے، تمہاری فیکٹری اور اناج کے گودام میں نے تباہ کئے ہیں۔“ راجہ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون کا ریسیور نیچے رکھ دیا۔

”یہ میرا ایسا کون دشمن پیدا ہوا ہے؟ جسے میں نہیں جانتا۔“ ارجن مہارگو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اچانک ارجن کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ارجن نے ستیش کا نمبر ملایا۔ ”بھئی مجھے کسی راجہ نامی بندے کا فون آیا ہے، جس نے دھمکی دینے کے ساتھ ساتھ فیکٹری اور گودام تباہ کرنے کا اعتراف کیا ہے جس ٹیلیفون نمبر سے کال آئی ہے وہ نمبر بتا رہا ہوں پتہ کرو یہ نمبر کس کا ہے اور کہاں کا ہے؟ اور فوراً ایک کرو۔“ راجہ کا ٹیلی فون نمبر بتانے کے بعد ارجن نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ٹریس ہونے والے فون نمبر کا ایڈریس ملتے ہی ارجن کی ہدایت کے بعد راجہ کے ٹھکانے کی طرف وہ لوگ جا رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سیکنڈ فلور کے کمرہ نمبر ستر کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے، راجہ نے یہیں سے فون کیا تھا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ انہوں نے اپنے ہولسٹرز سے پائل نکال لئے تھے۔ جو گنڈرنے دروازے پر دستک دی۔ قدموں کی چپ دروازے کی طرف آنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھولا اور نہ؟ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ جواب میں خاموشی چھائی رہی وہ دوبارہ دستک دینے لگا۔

”کون؟“ اندر سے نسوانی آواز سنائی دی۔ جو گنڈرنے گالیاں بکتے ہوئے دوبارہ دستک دی۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والی لڑکی کو دیکھتے ہوئے وہ اندر گھس گئے۔ ”کہاں ہے وہ؟“ جو گنڈرنے سامنے کھڑی لڑکی سے سخت لہجے میں پوچھا۔

”آپ کس کا پوچھ رہے ہیں؟“ لڑکی نے اپنے چہرے پر دو پٹہ لیٹ رکھا تھا۔ اس کی صرف آنکھیں ظاہر تھیں۔ سرخ کمر کا سکی جاپانی سوٹ اس کی کھلتی ہوئی رنگت پر بہت بیچ رہا تھا جو گنڈر اس کی طرف حریص نظروں سے دیکھتے ہوئے

بولا۔ ”جس نے اس اپارٹمنٹ سے کچھ گھنٹے پہلے فون کیا تھا اس کا پوچھ رہا ہوں۔“

”اوہ تم گولی کی بات کر رہے ہو وہ ساتھ والے فلیٹ میں رہتا ہے اس نے میرا فون استعمال کیا تھا وہ کہہ رہا تھا اس کا فون خراب ہے کسی رشتہ دار کو فون کرتا ہے بات کیا ہے کوئی لفو انٹونیٹ۔“ لڑکی نے کہا۔

”چلو باہر ساتھ والے اپارٹمنٹ کی طرف۔“ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ وہ چاروں دروازے کی طرف مڑے اسی لمحے لگا تین فائر ہوئے اس کے تینوں ساتھی چپختے ہوئے گرے۔ جو گنڈرنے پلٹ کر فائر کرنا چاہا مگر اپنی یہ حسرت دل میں لئے واصل جہنم ہو گیا۔ لڑکی کے پیستول سے نکلی ہوئی گولی اس کی پیشانی میں جا گئی تھی۔ ”ریش باہر آ جاؤ راستہ صاف ہو گیا ہے۔“ راجہ نے آواز لگائی اور پھر پتے سے لباس تبدیل کرنے لگا شکر ہے دروازے پر دستک ہوتے ہی تم نے سمجھ لیا کہ دشمن سر پہنچ چکے ہیں اور مجھے ہاتھ روم میں چھپا کر روپا کے کپڑے پہن لئے۔ اور یہ بھی بھگوان کی کرپا ہے کہ روپا کے چند جوڑے میری الماری میں پڑے تھے۔ ریش ہاتھ روم سے باہر آتے ہی ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

”جلدی سے بھاگو کسی بھی لمحے پولیس یا ان کے ساتھی یہاں آ سکتے ہیں۔“ راجہ نے کہا اور وہ دونوں تیزی سے باہر نکلے۔ فلیٹ مکین اپنے اپنے دروازوں سے سر نکال کر جائزہ لے رہے تھے کہ فائرنگ کا سبب کیا ہے۔ ڈر کے مارے باہر آنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ وہ دونوں میڑھیاں اترتے ہوئے باہر جا پہنچے باہر بھی چند افراد خوف زدہ کھڑے تھے۔

راجہ نے جواب دیا اور ریش کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اچانک ایک لینڈ کروزر ان کے قریب آ کر رکی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے تین راقفل بردار ان کی طرف راقفل تان چکے تھے۔ ”بغیر کوئی حرکت کئے چپ چاپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔“ ان میں سے ایک سرد لہجے میں بولا۔ راجہ نے اندازہ لگایا کہ

مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں۔ تینوں راقفل بردار چونکا تھے ذرا سی غلط حرکت انہیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ وہ دونوں لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ اندر بیٹھے ہی انہیں حیرت کا شدید جھکا لگا۔ ڈرائیور کے برابر اگلی سیٹ پر ستیش بیٹھا تھا۔ راقفل بردار ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی ستیش نے راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”آج گیڈر پھنس ہی گیا آخر، تو کیا سمجھتا تھا کہ ہم تیرا کھوج نہیں لگا سکتے۔“

راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان دونوں کی تلاشی نہیں کی گئی تھی اس کا رپو اور اس کے لباس میں موجود تھا راجہ کو کسی ایسے موقع کی تلاش تھی جب وہ بساط کا رخ پلٹ سکے۔

”گیڈر کی اولاد تیرے جرموں میں جو گنڈر اور اس کے ساتھیوں کی ہتھیابھی شامل ہوگئی ہے۔ اب بزدلوں کی طرح خاموش کیوں بیٹھا ہے۔“ پیچھے بیٹھے ایک راقفل بردار نے حقارت سے کہا۔ راجہ چپ رہا۔ آدھا گھنٹہ تیز رفتاری سے چلنے کے بعد گاڑی کی رفتار دم ہوئی۔ پرسیدھے ہاتھ پر مڑنے کے بعد ایک شاندار قسم کی کوشی کے گیٹ پر جا رکی، کوشی کا گیٹ کھلا اور لینڈ کروزر کے اندر داخل ہونے کے بعد دوبارہ بند کر دیا گیا، لینڈ کروزر کے رکستے ہی ان دونوں کو گریبان سے پکڑ کر باہر نکالا گیا۔ ”انہیں اندر لے جانے سے پیشتر ان کی تلاشی لے لو۔“ ستیش نے کہا۔ اس کے حکم تعمیل کی گئی۔ راجہ کے لباس سے رپو اور نکلا جو ایک راقفل بردار نے اپنے قبضے میں لے لیا وہ راقفلوں کی زد میں کو ریڈر سے ہوتے ہوئے ایک شاندار قسم کے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ یہاں ہر چیز بیش قیمت اور امپورٹ تھی۔ قالین پر دے فائوس ڈیکوریشن ہیں سب کچھ بہترین تھا۔ ایک طرف قیمتی صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ جس پر ارجن تن کر بیٹھا تھا۔ پتائی یہی ہمارا دشمن ہے جس نے آپ کو فون کیا تھا۔“ ستیش بولا۔

”دلکشی اور سلمان کہاں ہیں اور تیری ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ ارجن صوفے سے اٹھتے ہوئے غصے سے بولا۔

”یہ سب اپنے مہارگو سے پوچھو بقول تم لوگوں کے وہ بہت بڑا لشکر شالی ہے۔“ راجہ طنز سے بولا۔ ”یہ جو تمہاری زبان راکٹ کی طرح چل رہی ہے کچھ دیر بعد بلا بھی نہ سکے۔ یہاں ہم بہت ہیں اور تم صرف دو۔“ ارجن سخت لہجے میں بولا۔ ”سوکتے مل کر بھی ایک شیر کا شکار نہیں کر سکتے۔“ راجہ ہنسا۔

”انہیں کمرہ تقشیش میں لے چلو۔“ ارجن غرایا۔ وہ انہیں دھکیلے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں سوائے لوہے کی ایک کرسی کے اور کوئی سامان نہیں تھا۔ لیکن دیواروں پر اذیت رسانی کے آلات نظر آ رہے تھے۔ ریش کلوہے کی کرسی پر بیٹھا کر مضبوطی سے ری سے باندھ دیا گیا۔ لوہے کی وہ کرسی زمین میں فکس تھی چھت پر دو زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ جن کے آخری سرے پر لوہے کے مضبوط کڑے جھول رہے تھے۔ راجہ کو ان زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ ستیش نے دیوار سے لٹکا مضبوط چمڑے کا پیلٹ اتارا اور راجہ پر بربسا شروع کر دیا۔ راجہ کے چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ پیلٹ کی ہر ضرب پر اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے بدن سے کھال اتر رہی ہے وہ دانستہ پچھتے برداشت کرتا رہا۔ زندگی نے اسے اتنے زخم اور غم دیئے تھے کہ ہر زخم اسے چھوٹا لگتا تھا۔ ”بول کون ہے تو؟ تیری ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ ستیش اسے مارتے ہوئے ایک ہی سوال کئے جا رہا تھا۔

راجہ کے زخموں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا تکلیف کی شدت سے اس کا پورا بدن دکھ رہا تھا۔ بہت سخت جان ہے یہ، ستیش تھک کر پیچھے ہٹا۔ اب اسے مارنے کا فریضہ ارجن ادا کر رہا تھا۔ اس کی لاتیں اور گھونے راجہ کے جسم پر برس رہے تھے اور راجہ سینڈ بیگ کی طرح ادھر ادھر جھول رہا تھا کچھ دیر بعد

ہو گیا تھا۔

اسی لمحے ارجن کا موبائل فون بجھا اس نے کال ریسیو کی۔ ”ارجن آج اماؤس کی رات ہے، اس سے پہلے کہ سے بیت جائے، بلی کا انتظام کر کے جلدی آؤ۔“ دوسری طرف مہا گر دھتا۔

”مہاراج لڑکی ہم نے پرسوں ہی اغوا کر لی تھی۔“ ضروری کام میں مصروف تھے ابھی آرہے ہیں۔“ ارجن بولا۔ ”لڑکی کو تہہ خانے سے نکالو اور راجہ کو بچے اتار کر باندھ دو واپس آ کر اس کا ریشم سے بھی بدتر مشر کریں گے، جگ جیت سے کپوریش کی لاش کو برقی بجٹی میں جلا دے۔“ ارجن نے ہدایت دیں اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

راجہ کو ہوش آیا تو وہ فرش پر بندھا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے بندھے تھے۔ اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ ریش کی لاش غائب تھی۔ راجہ نے سوچا کہ اب تک تو وہ زندہ بچا ہے مگر نہ جانے کب وہ درندے اس کے موت کے گھاٹ اتار دیں بے بسی سے مرنے سے بہتر ہے کوشش کر کے بھاگ نکلے یا مرنے سے پہلے وہ زور لگا کر ہاتھوں کی بندش ڈھیلی کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی کوشش سے رسی ڈھیلی پڑنے لگی۔ یہ بات اس کے کلائی چھل کر زخمی ہو چکی تھی اس نے اپنے ہاتھ آزاد کئے۔ اس کے بعد پاؤں پر بندھی رسی کھولی۔ اسی سے آزاد ہوتے ہی اٹھنے کی کوشش کی اور بمشکل کھڑا ہوا یا اس کے زخموں سے دردی ٹپسیں اٹھ رہی تھیں۔ ظالموں نے اسے بڑی بے رحمی سے مارا تھا۔ چند منٹ تک وہ کمرے میں ٹھلکا رہا۔

اچانک دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی
تو اس نے دروازے کے ساتھ دیوار سے پشت لگا کر
کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور کندھے سے راقش لٹکائے
ایک شخص اندر داخل ہوا اس کے انداز میں لاپرواہی تھی
اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بری طرح زخمی بندھا
ہوا ان کا قیدی آزاد ہو چکا ہے اندر آتے ہی اس کی
نظر کمرے کے خالی فرش پر پڑی تو وہ بوکھلا گیا

ارکھاتے کھاتے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بدن پر پانی پھینک کر اسے ہوش میں لایا گیا۔ ”راجہ اب تیرے دوست کی باری ہے۔ اسے مار کھانا دیکھ کر اور تڑپے ہوئے مرنا دیکھ کر تیرا دل تڑپے گا۔“

ستیش نے کہا اور میس کی طرف بڑھا۔ اس نے میس کے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی سے پلاس کی مدد سے ناخن جڑ سے اکھاڑ دیا۔ کمرہ میس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ ”کینیچھوڑ دے اسے۔“ راجہ چلا یا فوراً میس کا دوسرا ناخن بھی جڑ سے اکھاڑ لیا گیا۔ میس ایک بار پھر چیخا اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ”کتے چھوڑ دے اسے تیری دشمنی مجھ سے ہے جو کرتا ہے میرے ساتھ کر۔“ راجہ چیخنے ہوئے بولا۔

”تکلیف ہو رہی ہے نا، میرے آدمیوں کے مرنے سے مجھے بھی تکلیف ہوئی تھی، میرا سب کچھ تو نے تباہ کر ڈالا، یہ سالہا ہندو کہہ کر بھی مسلمان کا ساتھ دیتا ہے۔ اسے تو عبرتناک موت ماروں گا“، ارجن کے لہجے میں درندگی تھی۔

ستیش نے خنجر اٹھایا اور گلا کھ بہت ہی بھیا تک تھا اس نے تیز دھار خنجر کی نوک سے ریش کی بائیں آنکھ کا ڈھیلہ نکال دیا۔ ریش ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح چیخنے لگا ادھر راجہ چیخنے ہوئے انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کے بعد ستیش نے ریش کا پایاں کان جڑ سے کاٹ ڈالا ریش چیخنے ہوئے درد کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔ ارجن دیوار کی طرف بڑھا اور ہتھوڑا اٹھا کر ستیش کو تھما دیا۔ ستیش کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور ہتھوڑا ریش کے دائیں گھٹنے پر پوری قوت سے پڑا۔ ریش بہت زور سے چیخا، اب اس پر جانکی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ یہی عمل اس کے دائیں گھٹنے پر دہرایا گیا۔ ستیش وحشیوں کی طرح ہتھوڑے سے ریش کی ہڈیاں توڑتا رہا۔ ریش کی گردن ڈھلک چکی تھی۔ اس کے مرنے کے باوجود ستیش ہتھوڑے برساتا رہا۔ ادھر ارجن نے دوبارہ راجہ کو پیٹنا شروع کر دیا، کچھ دیر بعد راجہ مار کھاتے کھاتے بے ہوش

اور کندھے پر موجود رانفل کی طرف ہاتھ بڑھایا اس کی کپٹی پر زور دار گھونسنے لگا اس کا دماغ چکرانے لگا راجہ دیشیوں کی طرح اس پر پل پڑا کچھ دیر میں وہ فرش پر پڑا کر اہر ہاتھ۔ اور رانفل راجہ کے ہاتھ میں تھی۔ جس کی نال کا رخ اس کی طرف اور انکی ٹریگر تھی۔“ میرے پاس وقت بالکل نہیں میرے چند سوالوں کا سچ سچ جواب دو، میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا ورنہ بتانا خیر کئے گولی مار دوں گا۔“ راجہ اورتیش کہاں ہیں؟“ راجہ سانپ کی طرح پھدکا راس شخص نے راجہ کی طرف دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اگر راجہ کی بات نہ مانی تو وہ اپنے کہے پر فوری عمل کرے گا۔

”ارجن صاحب ستیش کے ساتھ ملی چڑھانے گئے ہیں۔“

”کوٹھی میں اس وقت کتنے آدمی ہیں؟“ راجہ نے پوچھا۔

”مجھ سمیت دس افراد ہیں۔“ وہ شخص بولا۔

”ارجن کے اسلحہ کا گودام کس کوٹھی کے تہہ خانے

میں ہے، جھوٹ مت بولنا، میں مہندر سے سب معلوم کر چکا ہوں، تم سے صرف تصدیق کر رہا ہوں۔“ راجہ نے کہا۔

اسی کوٹھی کے تہہ خانے میں گودام ہے۔“ وہ
تھوک نکلتے ہوئے خوف سے بولا۔

”چلو آگے مجھے تہہ خانے تک لے چلو۔“ راجہ نے اسے دھکیلا۔ رائفل کی نال اس کی پشت سے گئی تھی۔ وہ کوریڈور میں چلتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے راجہ اس کی طرف سے مختا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر ارجن کے غنڈے نے ایک طرف رکھی الماری کا پٹ کھولا۔ یہ دیوار گیر الماری تھی۔ الماری کے دائیں طرف ایک جگہ ابھری ہوئی تھی اس نے ابھری ہوئی جگہ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو الماری دیوار سمیت سرک گئی اب وہاں سیڑھیاں موجود تھیں وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگے۔ راجہ اس کی پشت سے رائفل کی نال لگائے جو کئے انداز میں چل رہا تھا۔ ہر ایک بہت بڑا مال تھا۔ جس میں

جگہ جگہ بڑی بڑی لکڑی کی پیٹیاں رکھی تھیں جن کی تعداد سینکڑوں میں تھی اچانک راجہ نے رائفل کا دستہ اس کے سر پر مارا، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

راجہ نے ایک چٹنی کی طرف ہاتھ بڑھایا رافیل
کی نال سے زور لگا کر چٹنی کھول اس چٹنی میں جدید قسم کی
مشین ٹھکنیں تھیں راجہ نے آٹھ دس پٹیاں کھولی
کر دیکھیں وہاں ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا مشین ٹھکنیں جدید
طرز کی رافیلں، پمپل، ٹائم بم، راجہ نے ایک چٹنی سے
دو ٹائم بم نکالے پندرہ منٹ کا وقت فکس کیا۔ اور تہہ
خانے سے باہر نکلا آیا، اب اس کا رخ کوشی کی عقیبت
کی طرف تھا رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی ایک
طرف دو افراد کرسیوں پر بیٹھے اونٹن رہے تھے راجہ کی
طرف ان کی پشت تھی راجہ دیرے دیرے دبے
قدموں چلتا ہوا عقیبت دیوار کے قریب پہنچا ادھر ادھر دیکھا
کوئی نہیں تھا وہ دیوار پھلانگ کر کوشی سے باہر نکلا
اور تیزی سے چلتے ہوئے کوشی سے دوڑ جانے لگا پھر کچھ
دیر بعد درے درے دھماکوں کی آواز سے زمین لرز اٹھی۔

☆.....☆.....☆

”ہمیں پہاڑی والے بابا سے ملنا ہے۔“ وہ پانچ افراد تھے جن میں سے دو افراد کا ہیرا شائل اور باڈی لینگویج اور ان کے یونیفارم واضح طور پر اعلان کر رہے تھے کہ انکا تعلق قانون نافذ کرنے والے ادارے سے ہے۔ ایک SP ریک کا اسٹریٹبل اور دوسرا ڈی ایس پی درما تھا۔ ان کے ساتھ ارجن ستیش اور کالی کا پجاری تھے، غار کے دہانے پر گراں شخص کھڑا تھا۔ ایس پی اس سے مخاطب تھا۔ سہہ پہر کا وقت تھا پہاڑ پر سینکڑوں کی تعداد میں عقیدت مند جمع تھے۔ بابا جی کی عقیدت مندوں میں ہر مذہب کے ماننے والے شامل تھے وہ کسی سے کسی قسم کا نذرانہ نہیں لیتے تھے اگر کوئی اس معاملے میں ضد کرتا تو بابا جی ناراض ہو جاتے تھے۔

باباجی کے پاس اس وقت ایک مریض ہے۔
جیسے ہی وہ باہر آتا ہے میں اجازت لے کر آپ

کو اندر بھیجتا ہوں۔ مگر اس شخص بولا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کن رسیدہ شخص غار سے باہر نکلا۔ اس کے باہر آتے ہی مگر اس شخص غار کے اندر گیا تھوڑی دیر بعد باہر نکلا۔ ”آپ میں سے تین افراد اندر چلے جائیں دو باہر رک جائیں۔ امید ہے آپ میری بات کا برا نہیں منائیں گے۔“ مگر اس شخص بولا۔ SP ٹیل اس کے اخلاق سے متاثر ہوا اور انہماک میں سر ہلا کر ارجن اور ستیش کے ہمراہ غار میں داخل ہوا۔ SP ٹیل اگرچہ راشی پولیس افسر تھا اس کے باوجود بزرگوں اور علماء کرام کا احترام کرتا تھا غار میں ایک طرف چٹائی پر بابائی بیٹھے تھے ان کے ہاتھ میں تسبیح اور چہرے پر نور تھا۔

”ارجن صاحب کا کہنا ہے کہ کوئی مسلمان نامی نوجوان ان کی بیٹی لکشی کو اغوا کر کے آپ کے آستانے پر لایا ہے۔ آپ ہم سے تعاون کرتے ہوئے ملزم مسلمان اور لکشی کو ہمارے حوالے کر دیں۔ دوسری صورت میں ہم قانونی کارروائی پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ علاقہ اس وقت پولیس کی بھاری نفری کے گھیرے میں ہے۔ امید ہے آپ قانون سے تعاون کریں گے۔“ ایس پی ٹیل دھمے لہجے میں نظریں جھکا کر بات کر رہا تھا۔

”ایس پی ہم قانون کا احترام کرتے ہیں، تم چاہو تو اس پہاڑ کے چپے چپے کی تلاشی لے سکتے ہو لکشی نام کی کوئی بھی لڑکی یہاں موجود نہیں تھا۔“ بابا مسکراتے ہوئے بولے وہ تینوں دیکھ چکے تھے کہ غار میں بابا کے علاوہ کوئی دوسرا ذی نفس موجود نہیں ہے۔ غار سے باہر آ کر ایس پی نے تلاشی کا حکم دیا۔ پولیس کے جوان پہاڑ پر پھیل گئے وہ تقریباً دو گھنٹوں تک پہاڑ کی تلاشی لیتے رہے مگر ناکام رہے۔ پولیس کی تلاشی کی وجہ سے عقیدت مندوں میں کافی اشتعال پھیل چکا تھا۔ مگر وہ بابا کے حکم پر خاموش تھے۔ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد وہ تینوں غار میں دوبارہ داخل ہوئے۔ ”بابا ہمارے مطلوبہ افراد یہاں نہیں ملے آپ کو جو جیسی تکلیف پہنچی اس کی معذرت چاہتا ہوں۔“ ایس پی شائستہ لہجے میں بولا۔

”ایس پی اپنی چونچ بند کر کے تو کھانا ہمارا ہے اور گن اس بڑھے کے گاتا ہے۔ بڑھے شرافت سے بتا لکشی کہاں ہے؟ ورنہ میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گا۔“ ستیش حقارت آمیز لہجے میں بولا اور اپنے ہول سٹرے پستول نکال کر بابا پر تان لیا۔

”اگر ہمت ہے تو چلا گئی۔“ بابا نے غصے سے ستیش کی طرف دیکھا۔ ستیش نے ٹریگر دبانے کا کام کر لیا مگر ستیش ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھانے سے قاصر تھا۔ اس نے بولنا چاہا مگر ناکام رہا۔ وہ اپنی جگہ پر پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔ اس کی پکلیں تنک جھپکنا بند ہو چکی تھیں۔ وہ پتھر کا بت بن چکا تھا۔

اس کا صرف دماغ کام کر رہا تھا۔ باقی جسم پتھر کا بن چکا تھا۔ ارجن کو احساس ہو گیا کہ ستیش کے ساتھ انہونی ہو چکی ہے۔ اس نے ستیش کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا ستیش کا جسم پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا ارجن امداد طلب نظروں سے ایس پی کی طرف دیکھنے لگا۔ ایس پی نے ستیش کے بدن کو چھوا تو اس کے مساموں سے پسینہ بہنے لگا۔ ستیش کو بابا کی شان میں گستاخی کی بہت سخت سزا ملی تھی۔ ایس پی نے بابا کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”بابا جی اسے شاکر دیجیے یہ آپ کا مقام نہیں جانتا، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آج کے بعد یہاں قدم بھی نہیں رکھیں گے۔“ ایس پی کے معافی مانگتے ہی بابا نے کچھ پڑھ کر ستیش پر پھونکا تو ستیش اپنی اصل حالت میں لوٹ آیا۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف تھا وہ تینوں خوف زدہ ہو کر تیزی سے باہر نکلے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس فورس وہاں سے روانہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بابائی نے کچھ پڑھ کر دائیں سمت پھونک ماری تو میرم اور سلمان ظاہر ہو گئے۔

حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس کوشی کے تہ خانے میں ارجن نے بھاری مقدار میں منشیات چھپا رکھی تھی راجہ نے اپنے کندھے سے لنگے بیک سے ٹائیلوں کی رسی نکالی اور جھلا کر اونچی دیوار کی سمت پھینکی رسی کے سرے پر موجود آنکڑا دیوار کے اوپر باندھ گئی خاردار تار میں پنس گیا وہ رسی کی مدد سے اوپر چڑھ گیا اب وہ خاردار تاروں کے قریب تھا۔ راجہ نے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔ اس نے احتیاط سے اپنا ایک ہاتھ خاردار تار پر ڈالا۔ دوسرا ہاتھ دیوار پر رکھ کر اوپر ہوا، دیوار پر چڑھنے کے بعد اس نے چند منٹ توقف کیا۔

رات کے دو بج رہے تھے کوشی کے گارڈز شاید گیٹ کی سمت کہیں دیکھے ہوئے تھے نیم تاریک احاطے میں کوئی بھی ذی نفس موجود نہ تھا۔ راجہ اطمینان سے بچوں کے بل اندر گویا۔ جچی تلی چھلانگ کے نتیجے میں بہت ہی مدھم آواز پیدا ہوئی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا آگے بڑھا یہاں کمروں کی کھڑکیاں جو کہ سلائیڈنگ ونڈوز تھیں۔ راجہ کھڑکیاں چپک کر نے لگا پہلی دوسری اور تیسری تینوں کھڑکیاں اندر سے لاک تھیں آخری چوتھی کھڑکی چپک کرنے پر اس کی قسمت نے اس کا ساتھ دیا، یہ اندر سے لاک نہیں تھی۔ اس نے آہستگی سے شیشہ ایک طرف سرکایا اور کمرے میں جھانک کر یہ کمرہ تاریک تھا۔ راجہ نے پٹیل نارنج نکال کر روشن کر لی اور کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ خالی تھا۔ کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا کمرے میں ایک طرف ڈبل بیڈ پڑا تھا کمرے کا دروازہ بند تھا شاید باہر سے لاک تھا راجہ نے اپنی پشت پر موجود بیک اتار ایک کھول کر اس میں سے ایک انتہائی طاقتور ٹائم بم نکالا تیس منٹ کا وقت سیٹ کیا اور ٹائم بم بیڈ کے نیچے رکھنے کے بعد بیک دوبارہ پشت سے لٹکا کر کھڑکی کے راستے باہر نکلا۔ اور دبے قدموں عقبی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ کوشی سے باہر تھا۔ وہ ایک طرف چل دیا۔ کوشی سے کچھ دور جانے کے بعد اس نے کلائی پر بندھی کھڑی پر وقت دیکھا بم پھٹنے میں پندرہ منٹ تھے

راجہ نے جیب سے موبائل فون نکالا اور ارجن کا نمبر ملایا۔

”کون ہے؟“ دوسری طرف سے ارجن کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ”جاگ ارجن جاگ ورنہ ہمیشہ کی نیند سو جائے گا، جلدی کوشی سے بھاگ تیری کوشی میں ٹائم بم ہے جو ٹھیک آٹھ منٹ بعد پھٹ جائے گا۔“ راجہ بولا۔

”کک کون ہو تم؟“ ارجن گھبرا گیا۔ ”میں راجہ ہوں، باتوں میں وقت ضائع مت کر، اب چھ منٹ رہ گئے ہیں۔“ دوسری طرف سے موبائل آف کر دیا گیا۔ پانچ منٹ بعد بم پھٹ گیا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ راجہ جہاں کھڑا تھا وہاں کی زمین بھی لرز اٹھی۔

ستیش اس وقت اپنی گرل فرینڈ شیلہ کے اپارٹمنٹ میں موجود تھا وہ ان دنوں ذہنی طور پر بری طرح اپ سیٹ تھا۔ راجہ نے ان کے جوئے کے اڈے منشیات کے اڈے اسلحہ کے گودام فیکٹری بلکہ سب کچھ ہوں سے اڑا دیا تھا ان کے گروہ کے اہم ترین افراد راجہ کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ ان کا ہر قسم کا غیر قانونی کاروبار ختم ہو چکا تھا، اب ان کے گروہ میں کتنی کے چند افراد باقی بچے تھے۔

”کیا بات ہے ستیش ڈارلنگ کافی پریشان نظر آ رہے ہو۔“ شیلہ کے گلابی ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ تھی۔ شیلہ نے اس وقت چست لباس پہن رکھا تھا اس کے جسمانی نشیب و فراز چست لباس سے سرکشی کرتے نظر آ رہے تھے ستیش کی حریص نظریں شیلہ کے جسم پر پھسلنے لگیں۔ ”کیا الجھن ہے مجھے بھی بتاؤ؟“ وہ چلتی ہوئی ستیش کے قریب آ گئی۔ ”کچھ نہیں ایک چھوٹی سی پرائلم ہے جو جلد دور ہو جائے گی۔“ شیلہ کے بدن سے اٹھنے والی مہک نے اس کے ذہن سے راجہ کے خوف کو بھگا دیا۔

”برائڈی کا پیگ تو بنا لاؤ۔“ وہ شیلہ سے مخاطب ہوا تو شیلہ گلاس میں برائڈی لائی اور گلاس اس کے

ہاتھوں میں تھما دیا۔ ستیش چسکیاں لے کر برائٹی پینے لگا۔ شیلانے اپنی باتیں اس کی گردن میں جھانک کر دیں۔ ستیش نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر کھینچا تو وہ اس کی آغوش میں آگری۔ ستیش کے ہاتھ اس کے جسمانی نشیب و فراز پر پھینکے گئے۔ شیلانے خود سپردگی کے جذباتی انداز نے ستیش کو دیوانہ کر دیا طوفان کا زور کچھ دیر بعد تھما تو دونوں ہی ہلکان ہو چکے تھے۔

اچانک ستیش کا موبائل فون بجنے لگا۔ ستیش شیلانے کو ایک طرف ہٹا کر کمرے کے کونے میں چلا گیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شیلانے کو چپ رہنے کا کہہ کر کال ریسویں "ستیش"۔ راجہ بول رہا ہوں۔ "جس اپارٹمنٹ میں اپنی گرل فرینڈ شیلانے کے ساتھ تم موجود ہو، وہاں ناظم بم ہے اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو بھاگو اور سنوانے کا دکان کو کسی ٹھکانے پر مت جانا کیونکہ وہ سب ٹھکانے میرے نشانے پر ہیں جلدی بھاگو۔" دوسری طرف سے راجہ کی سرد آواز سنائی دی۔ تو ستیش موبائل فون جیب میں ڈال کر باہر بھاگنے لگا۔ "ارے روکو تو سہی کیا ہوا؟" شیلانے اسے آواز دیں رہی گئی۔

ستیش کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا فلیٹ کی میزبیاں اتر کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ہر ظالم اپنی زندگی سے بہت پیار کرتا ہے۔ دوسروں کی زندگیوں سے ہنس کر کھیلتا ہے۔ جب اپنی زندگی خطرے میں نظر آتی ہے تو گیدڑ کی طرح بھاگتا ہے وہ بھی جان بچانے کے لئے بھاگ رہا تھا اس کا رخ آبادی سے باہر شہر سے کافی دور آنے پر ایک طرف ایک ریسٹورنٹ دیکھ کر گاڑی روکی اور باہر نکل کر ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ وہ کچھ کھانے کا آرڈر دیا جائے اس نے ہونٹوں سے لگائی تھی کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اسکرین پر نظر آنے والے نمبر کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ راجہ کا نمبر تھا۔ "ہیلو" کال ریسیور کے وہ گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔

"چائے پی رہے ہو۔ بھاگو تم میرے نشانے پر ہو۔" دوسری طرف سے راجہ کی آواز سن کر اس کے ہاتھوں سے چائے سے بھرا کپ چھوٹ کر گر کر گرم چائے کے چھینٹے اس کے کپڑوں پر گرے وہ ادھر ادھر سرگھما کر دیکھنے لگا۔ ریسٹورنٹ میں موجود تمام افراد اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ ان میں راجہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس کی گاڑی سمیت ریسٹورنٹ کے باہر پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی خالی سیٹیں دور سے نظر آ رہی تھیں وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھا کہ راجہ اسے کہاں سے اور کیسے دیکھ رہا ہے اتنا گھبراتا بھی ٹھیک نہیں؟ "ستیش یہ کیا الووں طرح دیدے پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہے ہو بھاگو جلدی ورنہ گولی چلا دوں گا۔" دوسری طرف سے راجہ کی آواز سنائی دی وہ موبائل فون جیب میں ڈال کر اپنی کار کی طرف بول بھاگا جیسے اس کے پیچھے ہزاروں کی تعداد میں بلائیں گئی ہوں۔ راجہ اس کے اعصاب پر بھوت کی طرح سوار ہو چکا تھا۔ کچھ لمحوں بعد اس کی گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا مگر اس سنان سڑک پر دوڑو رنک کوئی گاڑی نہ تھی۔

اچانک ایک خیال کے تحت اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا اور ارجن کو کال کرنے لگا۔ "پتا جی مجھے پچائیں۔" راجہ پھر میرے پیچھے پڑا ہے۔" دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی ستیش چلایا اور ارجن کو بتانے لگا کہ راجہ نے اسے کیسے ہراساں کر رکھا ہے۔ "گھبراؤ مت گاڑی چلاتے رہو۔ میں جلدی تم تک پہنچتا ہوں۔ تمہاری جدید ترین گاڑی میں ٹریک نصب ہے تم اس گاڑی میں جہاں بھی جاؤ گے یہ ٹریک تمہاری نشاندہی کرتا رہے گا۔ اپنا موبائل فون جیب میں رکھ لیا اس کی گاڑی اب میدانی علاقے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی چلاتے چلاتے تھک چکا تھا اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور نیچے اترا جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا یہی تھا کہ اس کا موبائل فون بج

اٹھا۔ موبائل فون جیب سے نکالنے میں اس کا دل خوف سے تیزی سے دھڑکنے لگا اسکرین پر راجہ کا نمبر تھا اس نے کال ریسیو کی۔ "کلی فضا میں سگریٹ پی رہے ہو۔" دوسری طرف سے راجہ کی بات سنتے ہی خوف سے لرز اٹھا سگریٹ اس کے ہونٹوں سے چھوٹ کر گر گیا وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا راجہ کہیں بھی نہ تھا۔ "ادھر ادھر مت دیکھو اپنی آنکھیں بند کر لو، میں تمہیں نظر آ جاؤں گا۔" ستیش نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ ابھی پسلیاں تو ڈک رہا ہے آجائے گا۔ اس کے خوف زدہ ہونے کی وجہ گردن کی پشت پر محسوس ہونے والے لوہے کی ٹھنڈک تھی اسے پسمل کی نال پہچانے میں مغالطہ ہوئی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ساری زندگی ان کھلونوں سے کھیلتے ہوئے گزری تھی۔

"اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" راجہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر آدھ بھرتے ہوئے راجہ کے حکم کی تعمیل کی۔ "اے ہولسر سے پستول نکال کر پھینک دو۔" راجہ نے دوسرا حکم دیا۔ ستیش نے اپنے ہولسر سے پستول نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ ستیش ابھی تک حیرت و استعجاب کے عالم میں تھا کہ راجہ اچانک یہاں کیسے پہنچ گیا؟ "اب میری طرف گھوم جاؤ۔" راجہ چند قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ستیش راجہ کی طرف مڑا۔ راجہ کے ہاتھ میں موجود پسمل کا رخ اس کی طرف تھا۔

"تم یہاں تک کیسے پہنچے؟ میں پورے محتاط تھا کوئی بھی گاڑی میرے تعاقب میں نہ تھی۔" ستیش نے حیرت سے پوچھا۔

"جب تم اپنی گرل فرینڈ کے اپارٹمنٹ میں تھے۔ میں تمہاری گاڑی کی عقبی نشست کے پاس سمٹ کر لیٹا ہوا تھا چونکہ تم گھبرائے ہوئے تھے اس لئے اس طرف توجہ نہ دے سکے آج میں نے کہیں بھی بم فٹ نہیں کیا تھا۔ یہ دھوکہ صرف تمہیں شیلانے کے اپارٹمنٹ سے باہر لانے کے لئے دیا تھا۔" راجہ بولا۔

"آخر تم ہو کون اور ہم سے کیا چاہتے

ہو؟" ستیش نے پوچھا۔

"میں تمہارے باپ ارجن کی پہلی بیوی رادھا سے ہوں، ارجن نے پیدا ہوتے ہی مجھے جھاڑیوں میں پھنکوا دیا تھا۔ میری ماں کا قتل بھی ارجن نے کیا تھا۔ تم دونوں باپ بیٹے نے کئی معصوم لڑکیوں کو بلی کے نام پر قتل کیا۔ کتنے لوگوں کے گھر اجاڑے اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اس جگہ کو فور سے دیکھو یہاں سے کچھ فاصلے پر باباجی کا آستانہ ہے اسی آستانے میں تمہاری بہن مریم اور سلمان رہتے ہیں۔" راجہ نے کہا۔

"زیادہ بولنے سے پہلے پیچھے مڑ کر دیکھ لو۔ تمہارے پیچھے کون ہے؟" ستیش بولا اور راجہ نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ ستیش کی چال تھی جو کامیاب رہی اس کے پاؤں کی شوکر راجہ کے پسمل والے ہاتھ پر پڑی پسمل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس کے سینے پر ستیش کی فرنٹ کلک لگی۔ راجہ پشت کے بل گرا۔ اور گرتے ہی اٹھا اس پر ستیش کے گھونے نے راجہ کی مزاج چربی کی۔ گھونہ اس کی پشتانی پر لگا راجہ لڑکھڑایا۔ ستیش جسمانی طور پر راجہ سے طاقتور تھا اس کے علاوہ مارشل آرٹ میں راجہ سے زیادہ ماہر تھا۔ راجہ کے سینے پر سائڈ کلک لگی۔ وہ گرا اور ستیش اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ستیش نے راجہ کو گھونوں کی زد پر رکھ لیا۔ راجہ کا ذہن پکڑنے لگا۔ اس نے پکڑاتے ہوئے ذہن کے ساتھ مزاحمت کی اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلی ستیش کی دائیں آنکھ میں جا گئی۔ ستیش نے چیختے ہوئے زخمی آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی آنکھ پھوٹ چکی تھی۔ راجہ نے درد سے بے حال ستیش کو اپنی ٹانگوں سے اچھالا وہ ایک طرف جا کر آٹو راجہ ڈنگا گئے ہوئے اٹھا اور تڑپتے ہوئے ستیش کو اپنے پاؤں کی شوکروں پر رکھ لیا۔ ستیش چیخا رہا اور مار کھاتا رہا۔

اچانک نیچے پڑا پسمل ستیش کے ہاتھ میں آ گیا ستیش نے فریگر دبا یا، گولی راجہ کے بازو کو چھوٹی ہوئی گز رہی۔ راجہ کے بازو سے خون بہنے لگا۔ ستیش پسمل ہاتھ میں تھا کہ کھڑا ہو گیا۔ اور فریگر دبا دیا۔ راجہ نے

ایک طرف چھلانگ لگائی ستیش کا نشانہ خطا ہو گیا۔ ویسے بھی ضائع ہونے والی آنکھ کی وجہ سے ستیش کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ پھوٹ جانے والی آنکھ کا گڑھا ستیش کو بھیا تک بنا رہا تھا۔ اس نے راجہ کا نشانہ لے کر دوبارہ ٹرگر دوایا۔ راجہ نے اس پر چھلانگ لگادی۔ گولی چھلانگ لگاتے ہوئے راجہ کے شانے پر لگی تو راجا چیخا ہوا ستیش کے اوپر گرا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ستیش کا پسٹل والا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ کا زوردار گھونہ ستیش کی زخمی آنکھ پر مارا تو ستیش کے حلق سے نکلنے والی چیخ بہت بھیا تک تھی پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا راجہ نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا اور نیچے کرے ستیش کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور دوسرے ہاتھ سے تیز دھار خنجر اس کی شہ رگ پر پھیر دیا۔ ”دوسروں کو جانوروں کی طرح ذبح کرنے والا آج خود ذبح ہو چکا تھا۔“

راجہ ستیش کے اوپر سے اٹھ گیا چند لمحوں تک ستیش کا جسم پھڑپھڑتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ ستیش کے خون سے راجہ کے کپڑے رنگین ہو چکے تھے۔ راجہ کے زخمی شانے سے خون بہہ رہا تھا وہ خنجر ہاتھ میں تھامے ایک طرف چلے گا کچھ دور چلنے کے بعد اسے پہاڑی نظر آنے لگی۔

اچانک اپنے پیچھے گاڑی کی آواز سن کر مڑا ایک لینڈ کروزر اس کے قریب رہی، ارجن، مہا گرو اور ایک گرائڈ مل شخص باہر نکلے مہا گرو اور ارجن خالی ہاتھ تھے جبکہ اس شخص نے رائفل تھام رکھی تھی راجہ نے نکلی کی سی تیزی سے خنجر رائفل بردار شخص کی طرف پھینکا خنجر رائفل بردار کے سینے میں دل کے مقام پر پوسٹ ہو گیا اس کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ وہ مردہ چھینکی کی طرح پٹ سے گرا۔ مہا گرو نے زمین سے مٹی اٹھا کر کچھ پڑھ کر راجہ پر پھینک دی راجہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ راجہ نے آگے بڑھنا چاہا مگر مل بھی نہ سکتا، اسے

یوں لگا کہ جیسے وہ پتھر کا بن چکا ہے۔ ”راجہ میری مرضی کے بغیر اب تو مل بھی نہیں سکتا صرف بول سکتا ہے محسوس کر سکتے ہو۔“ خنجر اور چلا سکتے ہو وہ بھی اس لئے کہ تیری چیخ پکار سے ہمیں شاشنی ملے گی۔“ مہا گرو شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

ارجن آگے بڑھا اور راجہ کے زخمی شانے پر گھونہ رسید کیا تو راجہ کے جسم میں تکلیف کی شدید لہر اٹھی وہ چیخ پڑا۔ ”اور زور سے چیخ بچھے تیری چیخوں سے شاشنی ملے گی، تو نے مجھے تباہ و برباد کر دیا تو میرے بیٹے کا ہتھیار ہے۔“ ارجن چلایا۔

”اور تم کوں ہو کچھ پتہ ہے تمہیں اپنے ہر ظلم کا حساب دینا پڑے گا۔“ مجھے میری ماں کی گود سے چھین کر مرنے کے لئے جھانپوں میں پھینک دیا میری ماں کو زندگی سے محروم کر دیا۔ اور نہ جانے کتنے ہی گھر تم نے اجاڑے ہیں۔ آج تمہارا یوم حساب ہے۔“ راجہ غصے سے بھناتے ہوئے بولا۔

”راجہ اب تو کچھ نہیں کر سکتا، یہاں سے ہلنا بھی تیرے بس سے باہر ہے، اب جو کچھ کریں گے ہم کریں گے۔“ ارجن غصے سے پھنکارتے ہوئے بولا اور راجہ کے پیٹ پر زوردار لات ماری، وہ چیخا ہوا زمین پر گرا اب ارجن راجہ کے جسم پر ٹھو کریں مار رہا تھا ہر ٹھوک پر راجہ کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ ملنے چلنے اور حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔

”راجہ تیرے بعد اس پہاڑی والے بڑھے کی باری ہے۔ اب کون تجھے بچائے گا، کس میں ہمت ہے جو آج تجھے بچائے۔“ مہا گرو کے لہجے میں غرور تھا۔

”مہا گرو زندگی اور موت میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میرا اللہ مجھے بچائے گا۔“ راجہ تکلیف کی شدت سے دانت میچھتے ہوئے بولا۔ ارجن نے نیچے پڑے شخص کے سینے سے خنجر نکالا اور راجہ کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ”راجہ اس خنجر کو پوچھنا اس خنجر سے تو نے ستیش کی ہتھیار کی تھی اب یہی خنجر تیری موت کا کارن بنے گا۔“ ارجن کا خنجر والا ہاتھ بلند ہوا۔ ارجن کی نظریں راجہ کے

بینے پر جم گئیں۔

”راجہ بلا اپنے خدا کو آج، جو تجھے بچائے۔“ ارجن خنجر والا ہاتھ بلند کئے کبواس کئے جارہا تھا۔ راجہ کی نظریں ارجن کے ہاتھ میں موجود خنجر پر جمی تھیں اس نے سوچا۔ ”کیا میں اپنی ماں کا انتقام لئے بغیر اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔“

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ موت اس کے سر پر کھڑی تھی۔

اچانک بابا کی آواز سنائی دی۔ ”خالو اب بھی وقت ہے ظلم سے ہاتھ روک لو۔“ راجہ نے آواز کی سمت دیکھنا چاہا یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتا ہے، اس نے با آسانی گردن موڑ کر ابا کو دیکھا۔ بابا ان سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، راجہ نے ارجن کو لینے لینے لات رسید کر دی ارجن الٹ کر گرا، راجا ڈگمگاتے قدموں سے کھڑا ہو گیا، مہا گرو کے جادو کا اثر راجہ پر سے ختم ہو چکا تھا، یہ بابا کا کمال تھا، بابا کے قریب مریم اور سلمان اور بہت سے عقیدت مند کھڑے تھے، راجہ کے زخموں سے ٹھیس اٹھ رہی تھیں خاص کر شانے میں لگنے والی گولی کی تکلیف بہت زیادہ تھی، راجہ اب تک اپنی قوت ارادی کے سبب ہوش میں تھا۔ ارجن بابا کو دیکھ کر خوف کے مارے مہا گرو کے پہلو میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ”اچھا ہوا تو خود ہی آ گیا اب مرنے کیلئے تو جی تیار ہو جا۔“ مہا گرو نے کہا۔

”دیکھ بھاری ہمارا اچھے سے کوئی جھگڑا نہیں، کوئی بھی مذہب بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آئندہ کیلئے ظلم سے توبہ کر لے اور یہاں سے چلا جا۔“ بابا نے اسے تنبیہ کی۔

”ابھی سے ڈر گئے دراصل تمہیں پتہ ہے یہاں سب کے سامنے تمہارا کیا حشر ہونے والا ہے۔“ مہا گرو بولا۔

”اللہ گواہ ہے میں نے توبہت چاہا کہ ہمارے درمیان تصادم نہ ہو مگر تیری سمجھ میں میری بات نہیں آئی اب تو اپنے دل کی حسرتیں پوری کر لے۔“ بابا نے کہا۔

”یہ دیکھ میری طاقت۔“ مہا گرو نے کچھ پڑھ

کر میدان میں پھونک ماری تو کئی خوفناک صورت مخلوق میدان میں ایک طرف کھڑی تھیں اس مخلوق میں جڑیل، ڈھانچے اور دیگر کربہ صورت مخلوق تھی۔

سلمان، مریم اور دیگر عقیدت مند اس خوفناک مخلوق کو دیکھ کر کانپنے لگے۔ مہا گرو نے دوبارہ پھونک ماری تو وہ مخلوق غائب ہو گئی۔ ”اب بھی وقت ہے تو نے میری طاقت دیکھ لی کہ میں کتنا گت شالی ہوں میرے آگے گھٹنے ٹیک دے میں تجھے معاف کر دوں گا۔“ مہا گرو تکبر بھرے لہجے میں بولا۔

بابا نے مسکرا کر اپنی شہادت کی انگلی سے پہاڑی کی طرف اشارہ کیا تو بے قوی ہیکل جنوں سے پوری پہاڑی بھر گئی وہ جن اتنے لمبے چوڑے تھے کہ میدان سے دور پہاڑ میں صاف دکھائی دے رہے تھے بابا نے اشارہ کیا تو جن غائب ہو گئے۔

یہ دیکھ کر مہا گرو کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا اس کے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ اس کی پریشانی ظاہر کر رہا تھا کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا پھر کچھ پڑھ کر پھونک ماری تو بڑے بڑے چٹائی پتھر جو گیند کی طرح گول تھے لڑھکتے ہوئے بابا کی طرف بڑھنے لگے تو بابا نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو لڑھکتے ہوئے پتھر غائب ہو گئے۔

مہا گرو کے تمام ہیر بابا کے ہاتھوں ختم ہو چکے تھے۔ بابا نے اس کی برسوں کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا اب اس کے پاس بھاگنے کے لئے بھی کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ آگے کنواں اور پیچھے کھائی والی مثال اس کے سامنے تھی۔

یہ آخری اور خطرناک وار تھا۔ مہا گرو نے خنجر سے اپنی گردن پر ہلکا سا ٹک لگایا اور بتے ہوئے خون سے خنجر کو بھگونے لگا۔ اس کی گردن سے ٹپکنے والا خون خنجر کو بھگو چکا تھا۔ مہا گرو نے منتر پڑھ کر خنجر پر پھونک ماری اور بابا کی طرف پھینک دیا۔ وہ انتہائی خطرناک ترین وار تھا کسی صورت خالی نہ لوثا تھا۔ مخالف کی جان لئے کر ہی چھوڑا تھا اگر کسی وجہ سے مخالف

جاتا تو عامل کی خیر نہ ہوتی اس عمل کی ناکامی کی قیمت عامل کو اپنی جان دے کر چکانی پڑتی تھی۔

وہ ایک خنجر نصف درجن خنجروں میں تبدیل ہو چکا تھا اور وہ نصف درجن خنجر بجلی کی تیزی سے بابا کی طرف لپکے۔ بابا نے فوراً اپنی جیب سے تیغ کے چند دانے نکالے اور وہ دانے تیزی سے خنجروں کی سمت پھینک دیئے تیغ کے دانے جیسے ہی نصف درجن خنجروں سے ٹکرائے خنجر پلٹے اور تیزی سے مہارگو کی طرف لپکے۔ مہارگو نے وارنا کام ہوتا دیکھ کر اپنے بچاؤ کے لئے کوئی منتر پڑھنا چاہا مگر اس کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ نصف درجن خنجر مہارگو کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ مہارگو چیختا ہوا جنم رسید ہو گیا۔

مہارگو کو خنجر لگتے دیکھ کر راجن نے اپنے ہاتھ میں موجود خنجر بڑی مہارت سے راجہ کی طرف پھینکا، خنجر اڑتا ہوا آیا اور راجہ کے سینے میں پیوست ہو گیا، راجہ کے منہ سے تیغ نکلی اور وہ لڑکھڑایا مگر گرا نہیں ہمت کر کے خنجر کا دستہ پکڑا اور کھینچ کر باہر نکال لیا راجہ نے اپنے ذہن پر چھانے والے اندھیرے کو جھٹکا۔ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے خنجر پوری طاقت سے راجن کی طرف پھینک دیا۔ خنجر اڑتا ہوا راجن کے ٹھیک دل کے مقام پر پیوست ہو گیا، راجن کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گیا۔ اسے مرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگا تھا۔

راجہ جواب تک قوت ارادی کے سبب کھڑا تھا لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر گیا اس کے سینے سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ بابا سلمان اور مریم راجہ کی طرف لپکے مریم نے راجہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”یہ کیا ہو گیا راجہ؟“ مریم بلک بلک کر زور ہی تھی اور سلمان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے راجہ کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو پڑا تھا ہونٹ ایک دم نیلے پڑ رہے تھے آنکھوں کے آگے اندھیرا آ رہا تھا ”راجہ..... راجہ ہوش میں آؤ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ مریم روتی ہوئی چلائی۔ راجہ نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، اس کی آنکھوں کے باہری گوشے نم ہوئے پھر اس میں دموٹے موٹے

آنسو نکل کر اس کے گال پر ریگ گئے، مریم نے روتے ہوئے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”نہیں میرے بھائی روتے نہیں۔“

”میں موت کے ڈر سے..... نہیں رو رہا..... یہ تو خوشی کے..... آنسو ہیں..... کہ میرے اپنے میرے قریب موجود ہیں..... دنیائے تو مجھے ٹھکرایا تھا میں سب کے لئے قابلِ نفرت تھا..... لیکن تم نے سلمان اور بابا نے مجھے محبت کا احساس دلایا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اس نے اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے کے اوپر جمایا ہوا تھا شاید تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے اپنے ایک ہاتھ میں مریم اور دوسرے میں سلمان کا ہاتھ تھا، ان دونوں کے ہاتھوں کو باہم ملا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ”میں تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ سلمان مریم کا خیال رکھنا، دین حق پر ثابت قدم رہنا۔ یہ زندگی اللہ کی امانت ہے اسے اللہ کی عبادت، میں گزار دینا۔“ راجہ بولتے بولتے تھک کر رک گیا۔

”راجہ بیٹے! صرف ہم تینوں ہی نہیں اور بہت سے بھی تمہارے لئے اداس ہیں، اپنے دائیں سمت سر گھما کر دیکھو۔“ بابا نے کہا تو راجہ نے آہستگی سے دائیں طرف سر گھمایا، پہاڑی کے سینکڑوں جن ایک طرف اداس کھڑے تھے۔ ”سنو راجہ سو سال زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ ایک دن میں ایسا کام کر جاؤ کہ دنیا ہمیشہ تمہیں یاد رکھے اور تم نے ایسا ہی کیا ہے۔“ بابا جی بولے تو۔ راجہ مسکرایا۔

”مریم وہ دیکھو..... دور..... آسانوں..... میں میری ماں بائیں وا..... کئے میرا..... انتظار..... کر رہی ہے۔ اللہ حافظ“ پھر راجہ نے نکلے پڑھا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مریم اور سلمان اس سے لپٹ کر رونے لگے وہاں موجود تمام افراد اور تو اور جنوں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

